

اِسلام کا نِظامِ مساجد

(بعد نظرِ ثانی اِضافہ شدہ جدید ایڈیشن)

تالیف

مولانا مُفتی محمّد ظفیرُ الدّین مفتاحیؒ
مُفتی دارُ العُلوم دیوبند

دارُ العُلوم سبیلُ السّلام حیدرآباد الہند

(فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللّٰهُ أَنْ تُرْفَعَ)
(النور: ۳۶)

اسلام کا نظامِ مساجد

(نظرِ ثانی کے بعد اضافہ شدہ جدید ایڈیشن)

اسلام کے نظامِ مساجد کے تمام گوشوں پر
کتاب و سنّت اور تاریخ کی روشنی میں
مکمل اور دل پذیر بحث

تالیف

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدّین مفتاحی
مفتی دار العلوم دیوبند

ناشِر
دار العُلوم سبیل السّلام حیدر آباد (الہند)

کتاب : اسلام کا نظام مساجد۔

مؤلف : حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی مدظلہٗ۔

کتابت : مولانا محمد عرفان عالم قاسمی۔

طبع جدید : ربیع الاول ۱۴۲۳ھ - جون ۲۰۰۲ء۔

تعداد : دو ہزار۔

قیمت : Rs 150=P 00

۔ ناشر ۔

دار العلوم سبیل السلام

مدینۃ العلم - حیدر آباد (الہند)

DARUL ULOOM SABEELUSSALAM

MADINATUL ILM, HYDERABAD. 500005

Tel : 4440450 Fax : 4441835

Email : mrqasmi@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

- وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ (البقرہ: ۱۲۷)

اور (وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جب ابراہیم علیہ السلام خانہ (کعبہ) کی بنیادیں بلند کر رہے تھے۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے (یہ) قبول کر یقیناً تو ہی (سب کچھ) سننے والا ہے (سب کچھ) جاننے والا ہے۔

- فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ (النور: ۳۶)

(وہ) ایسے گھروں میں ہیں جن کے لیے اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے اور ان میں اس کا نام لیا جائے۔

- إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ فَعَسَىٰ أُولٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ۔ (التوبة: ۱۸)

اللہ کی مسجدوں کا آباد کرنا تو بس ان لوگوں کا کام ہے جو ایمان رکھتے ہوں اللہ اور روزِ آخرت پر اور پابندی کرتے ہوں نماز کی اور زکوٰۃ دیتے رہتے ہوں اور بجز اللہ کے کسی سے نہ ڈریں پس ایسے لوگ امید ہے راہ یاب ہو جائیں۔

- وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا ۝ (الجن: ۱۸)

اور جتنے سجدے ہیں (سب) اللہ کا حق ہیں، سو اللہ کے ساتھ کسی (اور) کو مت پکارو۔

(۱) عَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:
مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ۔ (متفق علیہ)

(۲) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِذَا رَاَيْتُمُ الرَّجُلَ يَتَعَاهَدُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوْا لَهٗ بِالْاِيْمَانِ فَاِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

(۳) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:
مَنْ غَدَا اِلَى الْمَسْجِدِ اَوْ رَاحَ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهٗ نُزُلَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ كُلَّمَا غَدَا اَوْ رَاحَ۔ (متفق علیہ)

(۴) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِذَا مَرَرْتُمْ بِرِيَاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوْا قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا رِيَاضُ الْجَنَّةِ قَالَ: اَلْمَسَاجِدُ، قِيْلَ وَمَا الرَّتْعُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ (رواہ الترمذی)

۱ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کے لیے مسجد بناتا ہے اللہ تعالیٰ اس کیلیے جنت میں گھر بناتے ہیں۔

۲ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم کسی آدمی کو مسجد میں فکر و اہتمام کے ساتھ آمد و رفت کرتا ہوا دیکھو (یعنی امور مسجد سے دلچسپی لیتا ہو، عبادت و ذکر و تعلیم کی فکر کرتا ہو، اور خبر گیری کرتا ہو) تو اس کے مومن ہونے کی گواہی دو کہ بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مسجدوں کو آباد وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

۳ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو لوگ صبح و شام مسجد جایا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے لیے صبح و شام جنت میں ضیافت کا نظم فرماتے ہیں۔

۴ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم جنت کے باغات میں سے گزرو تو ان میں چر لیا کرو (کچھ کھا پی لیا کرو) عرض کیا گیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جنت کے باغات کیا ہیں؟ فرمایا مسجدیں، عرض کیا گیا چرنے کا کیا مطلب یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا: سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر کہ ان کلمات سے اپنی زبانوں کو تر و تازہ رکھو۔

اسلام کا نظامِ مساجد اہلِ نظر کی نظر میں

مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ

فقیر مناظر احسن گیلانی نے بڑی دلچسپی اور مسرت کے ساتھ مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی کی کتاب "نظامِ مساجد" کا مطالعہ کیا، اگرچہ میرا یہ مطالعہ تفصیلی مطالعہ نہ تھا لیکن جس حد تک اس کتاب کے اہم مضامین کو دیکھ سکتا تھا ان کے معائنہ میں کمی نہیں کی گئی۔ اپنی محدود معلومات کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مساجد کے متعلق اتنی جامعیت کے ساتھ تمام پہلوؤں پر اتنی حاوی کتاب نہ صرف اردو بلکہ عربی اور فارسی میں بھی میری نظر سے نہیں گذری، وقت کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل میں مولانا موصوف نے اپنا وقت صرف فرمایا ہے، اگرچہ تالیف وتصنیف کے ... ن کے تازہ واردوں میں ہیں لیکن خالص نیّت ان کی محنت کے بار آور کرنے میں ممد ومعین ثابت ہوئی ہے۔ بہ ظاہر موضوع کے متعلق مشکل ہی سے کوئی قابلِ ذکر مسئلہ غالباً ایسا باقی نہیں رہا ہے جس کا تذکرہ کسی نہ کسی حیثیت سے اس کتاب میں نہ آگیا ہو، ماشاء اللہ عبارت، الفاظ، ترتیب سب میں سنجیدگی، متانت اور صفائی وروشنی پائی جاتی ہے، اختلافی مسائل میں مولوی صاحب نے رفق و ملائمت کا پہلو اختیار کرکے علماء کے

طبقہ منتصلبہ و متقشفہ کے لئے ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

کاش! مولینا اس سلسلے میں اپنے مطالعہ اور جستجو کو جاری اور دنیا کے مختلف حصّوں میں مسلمانوں نے مسجدوں کی تعمیر میں جن اُولُوالعزمیوں کو نمایاں کیا ہے، ان کو بھی کسی مستقل تصنیف میں جمع کرکے ایک علمی ضرورت کو پوری فرمادیں۔

آخر میں مسلمانانِ ہند کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ تعدّدِ جمعہ یعنی ایک ہی شہر کی ہر مسجد میں جمعہ کی نماز جو ہوتی ہے بجائے اس کے مرکزی مسجدوں کی حد تک جمعہ کی نماز کو محدود کردیں تو جمعہ کی نماز میں اس کی نکلی ہوئی روح ان شاء اللہ واپس ہو جائے گی۔ وَبِاللّٰہِ التَّوفِیق۔

مناظر احسن گیلانی
۲۶؍جون ۱۹۴۹ء

○ حضرت العلاّمہ سیّد سُلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کتاب "نظامِ مساجد" دہلی سے پہنچی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور آپ کی اس تصنیف کو آئندہ کے مدارج و مراتب کی ترقی کا زینہ بنائے، اس زمانہ میں دین کی خدمت کا بڑا ذریعہ سنجیدہ قلم ہے۔ اس نعمت کا شکریہ ادا کیجئے۔

مِنّت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمیں کنیں ؛ مِنّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

مضامین کا اسلوب، معلومات کی فراہمی، بیان کی شستگی اور طریقہ تعبیر کی درستی ہر چیز پسند آئی۔

سیّد سلیمان
۲۷؍اگست ۱۹۵۱ء

○ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ

"احکامِ مساجد وغیرہ کی کتابیں اردو میں موجود ہیں، لیکن ایسی کتاب جو نظامِ مساجد کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہو اَب تک موجود نہیں تھی، زیرِ نظر کتاب سے یہ ضرورت الحمدللہ کہ پوری ہے اور اس کے مصنف قابلِ مبارکباد ہیں کہ ان کی نظر اس طرف گئی، جن میں تفصیل کے ساتھ استعمال مساجد کے سارے پہلو افراد اور امّت دونوں کے نقطۂ نظر سے آ گئے ہیں۔

زبان صاف وسادہ ہے اور اندازِ بیان سلیس وشگفتہ، کتاب ٹھیٹھ مذہبی رنگ کی ہونے کے باوجود مولویانہ خشک نگاری سے پاک ہے، کتاب بہ حیثیتِ مجموعی امّت کے مذہبی ذخیرہ میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔"

صدقِ جدید
۲۲ر فروری ۱۹۵۲ء

تبصرہ رسالۂ دارالعلوم دیوبند

"ہم نے اردو زبان میں نظامِ مساجد پر اتنی مرتّب ومزیّن کتاب اَب تک نہیں دیکھی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنّف نے محض تائیدِ غیبی سے اس موضوع کے سارے پہلوؤں کا اس طرح احتواء اور احاطہ کیا ہے کہ مسجد کا حقیقی مقام، اس کے آداب وقواعد، اس کی سیاسی اور دینی حیثیت سے یہ سب مضامین بڑی تحقیق وخوبصورتی سے سامنے آ گئے ہیں، کتاب کا مطالعہ اپنے پڑھنے والے کے دل میں نہ صرف نماز کی اہمیّت اور مسجد کے آداب واحترام

کا ایک گہرا جذبہ قائم کرتا ہے۔ بلکہ دورِ اول میں مسجد کو مسلمانوں کی دینی اور دنیوی ضرورتوں، ان کے قومی اجتماعات اور ان کے اتحاد و اجتماعیت کے مرکز کا جو ایک مضبوط نظام قائم تھا، یہ سب حقائق کھلتے چلے جاتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اردو میں اپنے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو اتنی جامعیت اور قابلیت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ اہلِ ذوق کو ہم توجہ دلاتے ہیں کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔"

از قلم مولانا انظر شاہ کشمیری دامت برکاتہم
دارالعلوم دیوبند
جنوری ۱۹۵۲ء

تبصرہ رسالہ معارف اعظم گڈھ

"مسجدیں مسلمانوں کی عبادت گاہ بھی ہیں اور دینی تعلیم و تربیت کی درسگاہ بھی، اور نظامِ اجتماعی کا مرکز بھی، قرنِ اول اور اس کے بعد ہر زمانہ کے صلحاء و اخیار نے مساجد کی ان تمام حیثیتوں کا پورا لحاظ رکھا۔ اس لئے مصنف نے مساجد کی اہمیت اور اس کی مختلف حیثیتوں پر یہ کتاب لکھی ہے، اس میں انہوں نے ان کی غرض و غایت، ان کے دینی مقاصد اور اجتماعی فوائد وغیرہ مساجد سے متعلق جملہ امور و مسائل بڑی تفصیل اور بسط و شرح کے ساتھ تحریر کئے ہیں۔

اردو میں اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع کتاب موجود نہیں، وہ مساجد کے جملہ احکام و مسائل پر پوری طرح حاوی ہے اور اپنی معلومات اور فوائد کے لحاظ سے مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔"

از قلم شاہ معین الدین ندوی
دارالمصنفین اعظم گڈھ
مارچ ۱۹۵۲ء

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ چند

اچھے اور بہتر مقامات اور مراکز ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اہمیت اور تقدس مسجد کو حاصل ہے۔ مسجد اسلامی زندگی کا ایک ایسا محور ہے جس کے گرد مسلمانوں کی پوری زندگی گردش کرتی ہے۔ اس کے بغیر کسی اسلامی بستی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کی تعمیر کا اہتمام کیا اور خود اپنے ہاتھوں سے اینٹ پتھر اُٹھا کر اس کی تعمیر فرمائی۔ اس موقع پر آپ یہ پڑھتے جاتے تھے:

هٰذَا الْحِمَالُ لَا حِمَالُ خَيْبَرْ ﴿﴾ هٰذَا أَبَرُّ رَبَّنَا وَأَطْهَرْ

یہ خیبر کی کھجوروں کا بوجھ نہیں اے پروردگار، یہی بوجھ سب سے عمدہ اور بہتر ہے۔

اَللّٰهُمَّ إِنَّ الْأَجْرَ أَجْرُ الْآخِرَةِ ﴿﴾ فَارْحَمِ الْأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَهْ

اے اللہ! حقیقت میں اجر تو آخرت کا اجر ہے۔ پس آپ انصار اور مہاجرین پر رحم فرمائیے۔

ایک روایت میں اس طرح ہے:

اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَهْ ﴿﴾ فَانْصُرِ الْأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَهْ

اے اللہ! آخرت کی بھلائی اور خیر کے سوا کوئی خیر اور بھلائی نہیں، پس آپ انصار اور مہاجرین کی مدد فرمائیے جو صرف آخرت کی بھلائی اور خیر کے خواہاں ہیں۔

انصار اور مہاجرین پورے جوش و خروش اور لگن اور دھن کے ساتھ اس تعمیری کام میں آپ کے ساتھ تھے، والہانہ جذبہ کے ساتھ ان کی زبان پر یہ تھا:

لَئِنْ قَعَدْنَا وَالنَّبِيُّ يَعْمَلُ ﴿﴾ لَذَاكَ مِنَّا الْعَمَلُ الْمُضَلَّلُ

اگر ہم بیٹھ جائیں اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کام کریں تو ہمارا یہ عمل یعنی بیٹھ جانا بہت بُرا ہوگا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

لَا یَسْتَوِیْ مَنْ یَّعْمُرُ الْمَسَاجِدَ ٭ یَدْاَبُ فِیْہَا قَائِمًا وَّقَاعِدًا

وَمَنْ یُّرَیٰ عَنِ التُّرَابِ حَائِدًا

جو شخص اٹھتے بیٹھتے تعمیر مسجد میں سرگرداں ہے اور وہ شخص جو کپڑوں کو مٹی اور غبار سے بچاتا ہے، دونوں برابر نہیں۔

ظہورِ اسلام کے بعد تعمیر مسجد کے سلسلہ کا یہ تاریخی واقعہ مسلم معاشرہ میں مسجد کی ضرورت واہمیت کو فکری، نظری اور عملی حیثیت سے اجاگر کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں میں دینی روح کو بیدار رکھنے، ان میں ملی وجود کا شعور پیدا کرنے اور ان کے شیرازے کو مجتمع رکھنے کا اصل ذریعہ یہی ہے کہ مسجدوں کو حیاتِ اسلامی کا محور بنایا جائے، اور ان میں نماز باجماعت کا نظام قائم کیا جائے۔ مسجد کی اسی اہمیت کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے لگایا جاسکتا ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے:-

"جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ اس کو مسجد سے شغف ہے اور وہ اس کی دیکھ بھال میں لگا رہتا ہے تو گواہ رہو کہ وہ صاحبِ ایمان ہے۔" (ترمذی)

مسجد کے سلسلہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ اہم حدیث نقل کی ہے:

"جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ مجھ سے محبت کرے اور جو مجھ سے محبت رکھنا چاہے اس کو چاہیے کہ میرے صحابہؓ سے محبت کرے اور جو صحابہؓ سے محبت رکھنا چاہے اس کو چاہیے کہ قرآن سے محبت کرے اور جو قرآن سے محبت رکھنا چاہے اس کو چاہیے کہ مسجدوں سے محبت کرے۔ کیوں کہ وہ اللہ کے گھر ہیں۔ اللہ نے ان کی تعظیم کا حکم دیا ہے اور ان میں برکت رکھی ہے۔ وہ بھی بابرکت ہیں اور ان کے رہنے والے بھی بابرکت۔ وہ بھی اللہ کی حفاظت میں ہیں اور ان کے رہنے والے بھی حفاظت میں۔ وہ لوگ اپنی نمازوں میں مشغول ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے کام بناتے اور حاجتیں پوری کرتے ہیں۔ وہ مسجدوں میں ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کے پیچھے اُن کی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں۔" (قرطبی، سورۃ النور آیت ۳۶ کے ذیل میں)

مسلمانوں کی دینی زندگی کو بیدار رکھنے کے لیے مسجد کی ضرورت اور غیر معمولی اہمیت کا

اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں نڈھال پڑے ہیں لیکن اُسی حالت میں اُٹھتے ہیں اور دو آدمیوں کے سہارے اپنے مبارک قدموں کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے مسجد میں پہنچتے ہیں اور مسجد میں جماعت سے نماز ادا فرماتے ہیں۔ (بخاری)

قرآن کریم کی ایک آیت (التوبہ ـ ۸) سے واضح ہے کہ مسجد کی ظاہری تعمیر اور حقیقی تعمیر یعنی اپنے وجود اور ذکر وعبادت سے آباد رکھنا یہ اہل ایمان کا حق اور ان کا فریضہ ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ "جس نے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مسجد کی تعمیر کی اس کے لیے اللہ جنت میں ایک گھر بنائے گا" (بخاری) مسجد سے خصوصی تعلق رکھنے والوں یہاں آکر عبادت کرنے والوں، ائمہ، مؤذنین، منتظمین، خدمت گزار، سب کے لیے مختلف انداز سے احادیث میں بشارتیں دی گئی ہیں اور ان کے مقام ومرتبہ کو بتایا گیا ہے۔

مسجد کی اس حیثیت اور اہمیت کے پیشِ نظر حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اس سے متعلق مستقل ابواب قائم ہیں۔ اہل افتا نے بھی مسجد سے متعلق سوالات کے جوابات دے کر ممکنہ جزئیات اور تفصیلات کو کتبِ فتاویٰ میں جمع کر دی ہیں۔ اہل قلم نے بھی مختلف جہتوں سے اس موضوع پر چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "اسلام کا نظامِ مساجد" اسی سنہری زنجیر کی حسین کڑی ہے بلکہ بعض اعتبار سے اپنے اندر امتیازی شان رکھتی ہے، جس کا اندازہ کتاب کے شروع میں شامل اکابر اہلِ علم وقلم کی آراء کے مطالعہ سے ہو سکے گا۔

جہاں تک تعلق کتاب کے مؤلف حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی مدظلہٗ (پیدائش ۱۹۲۶ء) کا ہے کہ تو وہ علمی، قلمی اور فقہ وفتاویٰ کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ مشاہیر علماء ہمیشہ ہی ان کی کتابوں اور تحریروں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ دار العلوم دیوبند کے عظیم شہرت یافتہ پہلے مفتی مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے فتاویٰ پر مؤلف کتاب نے جو نہایت دیدہ وری اور باخبری کے ساتھ تعلیق وتحقیق اور تدوین وترتیب کا کام کیا ہے اور ان کا یہ قابل قدر کام "مکمل ومدلّل فتاویٰ دار العلوم دیوبند" کے نام سے متعدد ضخیم جلدوں میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔ اس کام نے ان کے نام کو روشن کیا اور علمی قدر ومنزلت میں کافی اضافہ کیا۔ ندوۃ المصنفین جیسے شہرت یافتہ ادارہ نے بھی مختلف موضوعات پر ان کی کتابوں (مثلاً اسلام کا نظامِ عفت وعصمت اور اسلام کا نظامِ امن وغیرہ) کو اپنے یہاں سے

شائع کرکے ان کے علمی مقام ومرتبہ کا اظہار و اعتراف کیا ہے۔

زیر نظر کتاب "اسلام کا نظامِ مساجد" مؤلف کے ابتدائی دور کی کتابوں میں ہے مگر اپنے موضوع پر نہایت جامع ہے۔ تفصیلات اور جزئیات کا اس قدر احاطہ کیا گیا ہے کہ کہیں سے کسی طرح کی کمی اور تشنگی کا احساس نہیں ہوتا، تاہم ایک خوبی اس کتاب کے ساتھ اب یہ شامل ہو گئی کہ مؤلف نے اس جدید ایڈیشن میں شروع سے آخر تک نظرثانی فرمائی اور حسب ضرورت جابجا ترمیم واضافہ سے کام لیا، اس لیے اس موضوع پر اس کتاب کی اہمیت تو پہلے ہی سے تھی لیکن اب یہ اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب ائمہ، مؤذنین، منتظمین مساجد، مصلّی، اہل علم اور اصحابِ فتویٰ سب کے لیے یکساں مفید ہے اور اس موضوع کے لیے اس کی حیثیت "خضرِ راہ" کی ہو گئی ہے۔

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد ایک تعلیمی ادارہ ہے اور ابتداء سے دورۂ حدیث اور مختلف علوم میں اختصاص تک کے درجات یہاں قائم ہیں۔ اس کے ساتھ اس نے اپنے قیام کے اغراض و مقاصد میں شروع ہی سے مختلف علمی، دینی، اصلاحی اور فقہی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کو شامل رکھا ہے۔ بحمداللہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ راقم الحروف کو بے پایاں مسرت ہے کہ دارالعلوم سبیل السلام کو استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی دامت برکاتہم جیسے نامور صاحب علم وقلم کی ایک قیمتی اور بیش بہا کتاب "مسجد" جیسے اہم اور مقدس و مبارک موضوع پر شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ اشاعتِ کتاب کی اجازت کے لیے ہم مفتی صاحب کے تہِ دل سے شکرگزار ہیں۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء۔ اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ ہم پر اور ملتِ اسلامیہ پر مفتی صاحب کے سایۂ عاطفت کو دراز فرمائے۔

کمپیوٹر کی اس جدید دنیا میں ہم نے اس کتاب کے لیے قدیم دور کی قلمی کتابت کو ہی مناسب سمجھا اس سلسلہ میں مولانا عرفان عالم قاسمی نے اپنی خصوصی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ کتابت شدہ صفحات کی اغلاط سازی اور چند صفحات کی کتابت میں مولوی مسرور احمد صاحب اور مولانا ابوبکر قاسمی معاون بنے ہیں۔ تصحیح، ترتیب اور طباعت وغیرہ کے امور میں دارالعلوم سبیل السلام کے باصلاحیت نوجوان اساتذہ (مولانا عبدالباسط ندوی، مولانا خورشید انور ندوی مدنی، مولانا مفتی محمد برکت اللہ قاسمی اور

مولانا مفتی شکیل احمد قاسمی) نے بڑی مستعدی سے کام کیا ہے۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ دین و دنیا کی بھلائی اور سرخروئی سے نوازے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے نفع کو عام فرمائے، مؤلف کے لیے اسے ذخیرۂ آخرت بنائے، اس کی اشاعت میں جو لوگ معاون بنے ہیں ان کی اس معاونت کو قبول کرتے ہوئے بے انتہا اجر عطا فرمائے، اور ناشر کتاب " دارالعلوم سبیل السلام " کو ترقیات سے نوازتے ہوئے اس کے متعلقین، منتسبین اور معاونین کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے۔

محمد رضوان القاسمی
(ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد)

۲۸ ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ
۱۰ جون ۲۰۰۲ء دوشنبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

امابعد! اشتیاقِ علومِ دینیہ کا جو جذبہ سینہ میں موجزن تھا اور جس کی پرورش اخی المکرم حضرت الاستاذ مولانا عبدالرحمان صاحب مدظلہ[1] نے اپنی نگرانی میں فرمائی تھی اس نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا تھا، چنانچہ تعلیم کے اخیر تین سال مدرسہ مفتاح العلوم مئو (ضلع اعظم گڈھ) میں حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہٗ اعظمی[2] کی زیرِ تربیت گذارے۔

درسیات سے فراغت کے بعد استاذ موصوف کی شفقت و محبّت نے مدرسہ موصوفہ میں بلاکر ایک سال مزید تکمیل کا موقع عطا کیا جس سے دینیات سے مناسبت پیدا ہوگئی۔ دوسرے سال ادبِ عربی اور دینیات کی تکمیل کی غرض سے سیدی علامہ سیّد سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ[3] کی ہدایت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ حاضر ہوا تھا مگر صحت کی ناسازگاری اور گھر کے حالات نے دو ماہ سے زیادہ حصولِ علم کا موقعہ نہ دیا۔ ناچار اساتذۂ کرام کے مشورے اور علامۂ محترم کی اجازت سے ملازمت کرلی۔

اس گرانبار ذمہ داری کے ساتھ شوق ہے کہ کچھ لکھتا پڑھتا رہوں۔ محترم مولانا محمد انیس صاحب نگرامی کا مشورہ ہے کہ "احکامِ مساجد"

(۱) (۲) (۳) اب تو یہ حضرات اللہ کی آغوشِ رحمت میں ہیں۔ ناشر

جمع کروں مگر حال یہ ہے کہ چند گنی چُنی کتابیں ہیں اور بس ۔

ربُّ العزّت ! اس دینی اور علمی کوشش میں کامیاب فرما کہ حوصلہ بلند ہو، سامانِ وافر فرما دے کہ ہمّت و جرأت دو چند ہو۔ ربّ قدیر ایک بے مایہ انسان کے علم و محنت میں برکت عطا فرما ! ایک اپاہج قلم میں وہ طاقت بخش دے کہ تیز گامی سے چل سکے۔ ایک اندھے کی بصارت و بصیرت میں وہ نور پیدا کر دے کہ دنیائے علم اس کی نگاہوں میں روشن ہو جائے اور پروردگارِ عالم ! جو بھی ہو اخلاص و للّٰہیّت کے ساتھ ہو آمین یا ربّ العالمین ۔ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ ھُوَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ۔

لاشئ **محمد ظفیر الدّین غفرلہٗ**

عرضِ مؤلف

سنہ ۴۶ء کے شروع میں "احکامِ مساجد" کے نام سے میں نے اس کام کی ابتدا کی تھی، اس وقت میرے سامنے صرف فقہ اور فتاویٰ کی چند کتابیں تھیں، جن سے احکام یکجا کئے جو چند صفحوں سے زیادہ نہ ہوں گے۔ مشیّتِ الٰہی سے اس زمانہ میں میعادی بخار میں مبتلا ہوا۔ مرض نے ایسی شدت اختیار کی کہ گھر والے مایوس ہو گئے، معالج بھی مطمئن نہ تھے۔ انہی ایّام میں میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اللہ تعالیٰ شفاء دے تو "احکامِ مسجد" کی جگہ "نظامِ مساجد" کے نام سے اس کام کی تکمیل کروں۔ اللہ تعالیٰ نے شفا دی اور میں نے کام شروع کر دیا۔ بزرگوں اور اساتذۂ کرام کی خدمت میں خطوط روانہ کئے اور رہنمائی کی درخواست کی۔ اس سلسلہ میں مخدوم و محترم علامہ سید سلیمان صاحب ندوی، حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی بانیِ ندوۃ المصنفین مدظلہم نے گراں قدر مشورے لکھ بھیجے۔

ان مشوروں اور رہنمائی کی روشنی میں میں نے کتاب کا ایک بڑا حصّہ ترتیب دیا اور اسے لے کر سب سے پہلے حضرت الاستاذ مولانا الشاہ حلیم عطا صاحب مدّظلہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور خود پڑھ کر سنایا۔ استاذ محترم بہت خوش ہوئے، اس وجہ سے اور بھی کہ اس موضوع سے متعلق تقریباً

تمام حدیثیں یکجا ہوگئیں اور اسی مجلس میں چند دوسری حدیثوں کی طرف رہنمائی بھی فرمائی۔ اس کی تکمیل سے فارغ ہوکر پورا مسودہ حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی خدمت میں پیش کیا گیا، جس کا بڑا مقصد اصلاح و اختصار تھا، مگر مولانا موصوف نے یہ کہہ کر مسودہ واپس.... کیا کہ اس میں کوئی ایسی زیادہ بات نہیں جو نکالی جاسکے، ہاں ازراہِ شفقت و محبّت انہوں نے جگہ جگہ اپنا مشورہ لکھ دیا اور ملاقات ہونے پر تصنیف و تالیف سے متعلق بعض ضروری باتیں بتائیں۔ وہاں سے لاکر یہ مسودہ حضرت مولانا اعظمی مدظلہ کی خدمت میں شوق و ذوق کے ہاتھوں سے پیش کیا، آپ نے بھی بہت ضروری مشوروں سے مستفیض فرمایا۔ اخیر میں یہ مسودہ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی اور حضرت الاستاذ مولانا عبدالرحمٰن صاحب (مدظلہما) کی خدمت میں پیش ہوا اور دونوں بزرگوں کے بیش قیمت مشوروں سے مستفیض ہوا۔

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ کتاب زیرِ نظر ان اکابر کی رہنمائی کا نتیجہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ میرا کام صرف جمع و ترتیب ہے اور بس۔ یہاں یہ بھی عرض کردینا مناسب ہوگا کہ یہ کتاب کسی مستقل کتب خانہ میں بیٹھ کر نہیں لکھی گئی ہے، خامیوں کا امکان ہے جس کی ادب کے ساتھ معذرت چاہتا ہوں، دو سال ہوئے۔ میں نے یہ مسودہ صاف کرکے رکھ دیا تھا، حالات نے اب اجازت دی ہے تو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

کتاب کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع پر اس جامعیت کے ساتھ یہ پہلی کتاب ہے اور جہاں تک مجھ جیسے بے مایہ انسان کی سعی و کاوش کا تعلق ہے، اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی ہے،

کامیابی اللہ کے ہاتھ ہے۔ دعا ہے حق تعالیٰ یہ حقیر خدمت قبول فرمائے اور اہلِ علم میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے اور عام مسلمان اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ ربِّ العٰلمین والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

محمد ظفیر الدّین غفرلہٗ

فضل الکبیر منزل۔ دار العلوم معینیہ سانحہ
بیگو سرائے، بہار
۲۶ر اکتوبر ۱۹۵۰ء

طبع جدید

زیرِ نظر کتاب ایک عرصہ سے دستیاب نہیں تھی، جب کہ مختلف حلقوں سے اس کی اشاعت کا مطالبہ ہورہا تھا۔ عزیز مکرم مولانا محمد رضوان القاسمی (ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد) کے سامنے اس کا تذکرہ آیا تو وہ بڑی بشاشت کے ساتھ اس کی اشاعت کے لئے آمادہ ہو گئے۔ یہ کتاب اب جو کتابت و طباعت کی ظاہری خوبیوں کے ساتھ منظر عام پر آگئی، اس میں ان کی کوششوں کا حصہ ہے اور مجھ سے محبت اور تعلق خاطر کا ان کی جانب سے اظہار بھی۔

ہمارے یہاں دینی تعلیمی اداروں کی کمی نہیں ہے، الحمدللہ ملک کے گوشے گوشے میں یہ ادارے قائم ہیں، البتہ ان اداروں میں تصنیف و تالیف اور علمی دینی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت پر بہت کم توجہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد ان کمیاب دینی تعلیمی اداروں میں شامل ہے جہاں اچھی اور قابلِ قدر کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اور اس طرف خصوصی توجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ناظم ادارہ کے حوصلہ کو تازہ رکھے اور دارالعلوم سبیل السلام ہمہ جہتی ترقی کی سمت رواں دواں رہے۔

چونکہ یہ کتاب میرے ابتدائی دور کی ہے، اور حتی الامکان اس موضوع سے متعلق تمام ضروری تفصیلات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تھی، تاہم "طبع جدید" کی مناسبت سے میں نے دوبارہ کتاب پر نظر ڈال لی اور جہاں جہاں میں نے عبارت میں ترمیم اور مضامین میں اضافہ کی ضرورت محسوس کی اس کی تکمیل کردی، اب یہ کتاب الحمدللہ نظر ثانی کے بعد قارئین کی خدمت میں پیش ہے، اللہ تعالیٰ مؤلف، ناشر، اور ناظرین سب کے حق میں اس کتاب کو مفید بنائے۔

محمد ظفیر الدین غفرلہ
دارالعلوم دیوبند

۲۲ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ
۵ جون ۲۰۰۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ لفظ

از حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحؒ

سابق صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

"نظامِ مساجد" نامی کتاب پڑھنے والوں کی خدمت میں صرف پڑھنے کے لئے نہیں، بلکہ پڑھ کر کچھ کرنے کے لئے پیش ہو رہی ہے۔ اس زمانہ میں ہر قوم اس عارضے میں مبتلا ہے کہ اپنے لئے کچھ کرے، اپنے مستقبل کو سنوارے مسلمانوں کو بھی اس وبا کے عارضے سے حصہ ملا ہے۔ "عارضہ" خصوصاً مسلمانوں کے لئے اس لئے قرار دے رہا ہوں کہ سوچنے کی ضرورت تو ان کو تھی یا ہے جن کے پاس کچھ نہ تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس امّت کو چھوڑ کر دنیا سے روپوش ہوئے ہیں، اس کے پاس تو بحمد اللہ سب کچھ ہے۔ ضرورت اس امّت کے لئے اگر کسی چیز کی رہ گئی ہے تو صرف اس بات کی کہ جو کچھ اس کے پاس موجود ہے اس سے استفادہ کی راہیں کھولے۔

بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ لاکھوں نہیں کروڑوں بلکہ اربوں کا لفظ استعمال کیا جائے تو شاید واقعہ سے بعید نہ ہوگا۔ روپے کی اتنی مقدار مسلمانوں سے حاصل کرکے کسی کام میں لگانا نہیں ہے بلکہ روپے کی یہ

مقدار مسلمان اپنی جیبوں سے نکال چکے ہیں، خرچ کر چکے ہیں اور اس خرچ کے نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں۔

آخر میں پوچھتا ہوں کون گن سکتا ہے ان مسجدوں کو جو ایشیا و افریقہ اور یورپ کے بھی بعض دُور دراز حصّوں میں پھیلی ہوئی ہیں، کیسی مسجدیں؟ جن میں دلّی کی جامع مسجد بھی ہے اور احمد بن طولون کا جامع بھی، جامع اموی دمشق بھی اور قاہرہ کی مسجدِ ازہر بھی۔ بڑی مسجدوں سے دیہاتوں اور قریوں کی چھوٹی سفال پوش مسجدوں تک سب پر جو کچھ خرچ ہو چکا ہے، کیا یہ مبالغہ ہوگا اگر اَربوں میں اس رقم کا تخمینہ کیا جائے جو ان مسجدوں کی تعمیر کے لئے مسلمان اپنی جیبوں سے نکال چکے ہیں۔ ان مسجدوں کی گنجائش کے سوا ہر مسجد تقریباً اپنے اِردگرد وقفی زمین کا کافی حصّہ رکھتی ہے جن کو خریدنے پر ہم اگر آمادہ ہوں تو کروڑہا کروڑ کی رقم بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ ہم مسجدوں کی ان ملحقہ زمینوں سے کام بھی لے سکتے ہیں اگر مساجد کی عمارت کافی نہ ہو۔

کیا کیا کام لے سکتے ہیں؟ مدارس کا کام، اطراف کی زمینوں میں طلبہ کی قیام گاہوں کی تعمیر کا کام، شفا خانہ کا کام اور یا خود باہنچایت کے اصول پر باہمی جھگڑوں کے چکانے کے لئے دار القضاء کا کام، مسافروں کی قیام گاہ کا کام۔

عمارت کی خاص قسم جس کا نام "المسجد" ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کیا ہوا ایک نظام ہے۔ سب سے پہلی مسجد جو مدینہ منورہ میں بنائی گئی وہ پانچوں وقت کی نماز کی جگہ بھی تھی، اسی میں صفّہ کا مدرسہ بھی تھا۔ اسی کے ملحقہ حصّہ میں مسافر بھی ٹھہرائے جاتے تھے اور زخمیوں کے لئے خیمہ بھی اسی حصّہ میں گاڑا جاتا تھا، مقدمات بھی اسی عمارت میں طے ہوتے

تھے، بس ہمیں جو کچھ کرنا ہے سب کا نمونہ اسی پہلی مسجد میں قائم کر دیا گیا تھا بلکہ عہدِ فاروقی میں اسی کے "متصل" ادب و شاعری" کے چرچے کے لئے ایک جگہ بھی مختص کر دی گئی تھی۔ اسلامی ممالک کے طول و عرض میں ہر میل دو میل پر عمارتیں بھی بن چکی ہیں، کافی اراضی ان عمارتوں کے اِرد گرد حاصل کر لی گئی ہیں۔ صرف انہی کاموں کو کرنے کی ضرورت ہے جو سب سے پہلی مسجد میں انجام دیئے جاتے تھے۔

خدا جزائے خیر دے مولانا ظفیر الدین[1] صدر دار العلوم معینیہ سانحہ (بہار) کو کہ اَربوں کا جو سرمایہ مسلمانوں کے سامنے رکھا ہوا ہے اس سرمایہ سے استفادہ کا مشورہ اس کتاب کے ذریعہ مولانا نے پیش کیا ہے اور اسی کے ساتھ عموماً ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں میں مساجد کے احترام اور اس کے آداب و ضوابط کے متعلق جو کوتاہیاں اور غفلتیں پیدا ہو گئی ہیں، مولانا نے ان کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ صحیح حدیثوں اور فقہ کی مستند کتابوں سے معلومات کا قیمتی ذخیرہ اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، عربی میں شام کے ایک عالم جمال الدین القاسمی کی کتاب اس باب میں مشہور تھی مگر میرا خیال ہے کہ احتواء و احاطہ میں مولانا ظفیر الدین کی کتاب کو دیکھ کر کم ترک الاوّل للآخر[2] کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ھٰذا والسّلام۔

---

(۱) مولانا گیلانی رحمہ اللہ نے زیر نظر کتاب پر جب "پیشِ لفظ" تحریر فرمایا تھا تو کتاب کے مؤلف اس وقت دار العلوم معینیہ سانحہ (بہار) میں صدر مدرس تھے، جب کہ کتاب کی جدید اشاعت کے وقت دار العلوم دیوبند میں شعبۂ دار الافتاء کے استاذ اور مفتی ہیں۔

(۲) پہلوں نے بعد والوں کے لئے بہت سے کام چھوڑے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلامی نظامِ حیات میں مساجد کا حصّہ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی۔

آسمانی دینوں میں اسلام سب سے اخیر میں اس روئے زمین پر آیا اور اسے خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ لوگوں تک پہونچایا گیا اور یہ اس وقت آیا جب آسمانی دینوں کے تمام ماننے والے اپنے اپنے دین کی راہِ راست سے دور ہو چکے تھے اور دنیا ظلم و جور سے بھر چکی تھی۔ ربّ العالمین کی پرستش چھوڑ کر انسان مخلوق اور بتوں کی پوجا کرنے لگے تھے، کہنا چاہیئے ان کا کوئی صحیح مذہب باقی نہ رہ گیا تھا، بلکہ انسانیت شیطنت میں تبدیل ہو چکی تھی، کائناتِ انسانی جہنم کے کنارے پہونچ چکی تھی اور دنیا بربادی سے دوچار تھی۔ وَکُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا حُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَکُمۡ مِّنۡهَا۔ (آل عمران : ۱۰۳)

سرورِ کائنات کی آمد

ایسے نازک وقت میں ربّ العالمین کی رحمت جوش میں آئی اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری رسول کی حیثیت سے بندوں میں بھیجا کہ آپ ان میں توحید کی تبلیغ کریں اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہِ راست کی دعوت

دیں اور رب کائنات سے جو دوری ہو چکی ہے اس کو ختم کر کے اس ذاتِ اقدس سے بندوں کا رشتہ جوڑ دیں تاکہ یہ دنیا اور اس میں بسنے والے انسانوں کا سلسلہ تا قیامت باقی رہ سکے۔

مکمل ضابطۂ حیات

چنانچہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رب قدیر کی طرف سے ایک مکمل ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی اللہ کے بندوں کو عطا کیا جس میں بتایا گیا ہے کہ سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، سبھوں کو باہم مل جُل کر زندگی گذارنا چاہیئے۔ سبھوں میں اخوّت و محبّت ہو، سب خدا کی وحدانیت پر ایمان لائیں اور حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء کرام اور رُسل آچکے ہیں، سبھوں کی رسالت و نبوت کا دل سے اقرار ہو، اور جس قدر آسمانی کتابیں نازل ہو چکی ہیں سب کا احترام اپنا فریضہ جانیں، اونچ نیچ کی کوئی بات نہ کریں اور نہ کوئی کسی کے ساتھ عداوت اور بغض و حسد رکھے، بلکہ باہم عدل و مساوات ہو، امن و سلامتی ہو اور سبھوں کی عفت و عصمت محفوظ رہے، قتل اور خوں ریزی بند ہو جائے، شاہ و گدا اور امیر و فقیر کی تمیز باقی نہ رہے اور برہمن و شودر کی تفریق مٹ جائے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا یہ پیغام سنایا:۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو! اپنے رب سے ڈرتے رہو
الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ	جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے
وَّاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا	اور پھر اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۔ (النساء : ۱)

اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا اور اس سے ڈرتے رہو جس کے واسطے سے آپس میں سوال کرتے ہو اور خبردار رہو قرابت والوں سے ۔ بے شک اللہ تعالیٰ تم پر نگراں ہے ۔

مخلوقات کی تخلیق نفع انسانی کے لئے

سارے انسان حضرت آدم و حوا علیہما السّلام کی اولاد ہیں ، اور سبھوں کا مرجع و مرکز ایک ہے ، خواہ وہ کسی خطہ کا رہنے والا ہو اور کسی بھی ملک کا باشندہ ہو اور کسی بھی خاندان سے اس کا نسبی تعلق ہو ، اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ یہ ساری کائنات اور تمامتر مخلوقات انسانوں کی نفع رسانی اور ان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے ۔ ان میں آسمان و زمین چاند و سورج ، جمادات و نباتات اور اعلیٰ سے اعلیٰ اور معمولی سے معمولی ساری مخلوق داخل ہے ۔ قرآن میں اعلان ہے :۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۔ (البقرۃ : ۲۹)

وہی ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں ۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (البقرۃ : ۲۲)

جس نے تمہارے واسطے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا ، پھر اس سے تمہارے کھانے کے واسطے میوے نکالے ۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِهٖ۔ (سورۃ النحل: ۱۲)
رات اور دن، سورج اور چاند کو تمہارے تابع کیا اور سارے اس کے حکم سے تمہارے ماتحت ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ ساری چیزیں انسانوں کی خدمت نفع اور فائدہ کے لئے ربّ العالمین نے پیدا کی ہیں اور ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ساری کائنات سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے لیکن خود یہ کسی مخلوق کی زندگی اور نفع کا سہارا نہیں بنتا ہے۔ یہ نہ تو آسمان وزمین کے کام آتا ہے اور نہ چاند وسورج کے نہ ہوا اور پانی کو فائدہ پہونچاتا ہے جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ بندوں کی فضیلت صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ ربّ العالمین کی بندگی بجالاتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ میں نے جن اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا۔

انسانی عظمت

اگر بندہ اپنے خالق ورازق کی بندگی نہ کرے تو وہ تنکا سے بھی بدتر ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری مخلوق کے لئے انسان مضر تو ہے نافع نہیں، وہ ساری کائنات سے فائدہ حاصل کرتا ہے مگر کائنات میں کسی مخلوق کو فائدہ پہونچانے سے قاصر ہے۔ اسلام نے یہ بھی بتایا کہ مخلوقات میں انسان سب سے افضل ومکرم ہے۔ اس صورت وشکل اور قدوقامت میں بھی اور اپنے کردار وعمل کے لحاظ سے بھی سبھوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ
ہم نے انسان کو خوب اچھے انداز کا

تَقْوِیمٍ۔ (التّین:۴) بنایا۔

انسانی کرامت کا اعلان ہوا۔

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ	ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ان کو
فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰھُمْ	جنگل اور دریا میں سواری دی اور ہم نے
مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی	ان کو پاک وصاف روزی دی اور بہت
کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا۔	سی مخلوق پر فضیلت دے کر بڑھا دیا۔
(بنی اسرائیل: ۷۰)	

امانت کی ذمّہ داری

اس کرامت وفضیلت کی وجہ یہ ہے کہ امانتِ خداوندی کے اٹھانے سے جب زمین وآسمان اور پہاڑ نے انکار کر دیا تھا اور وہ سہم گئے تھے تو انسانوں نے اس وقت آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا تھا، حالانکہ یہ کمزور تھا قرآن میں بیان ہے:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ	ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ	اور پہاڑوں پر پیش کیا تو ان سب نے
اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا	ان کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور
وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ	اس بارِ امانت کے اٹھانے سے ڈر گئے
ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔	اور اس کو انسان نے اٹھا لیا، بلاشبہ
(الاحزاب: ۷۲)	وہ ظلم کرنے والے اور جاہل ہیں۔

انسان کو ظلوم وجہول کا لقب ملا، مگر ہمّت اس کی قابلِ داد ہے کہ اس نے بارِ امانت اپنے ناتواں دوش پر اٹھا لیا اور ربّ العالمین کے

آگے سرخرو بن گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ساری بڑائی اسی امانت اٹھانے سے اس کے حصہ میں آئی ہے اور شروع سے اب تک یہ اس بارِ امانت کو اٹھائے ہوئے ہے اور ربّ العالمین کی ربوبیت کی دعوت اور اس کے احکام کی ذمّہ داری اپنے سر لئے ہوئے ہے، ایک لمحہ کے لئے اس سے غافل نہیں، اس امانت کی حفاظت وصیانت میں جان کی بازی لگا دینے سے بھی نہیں چوکتا۔

عزت و مکرمت انسانی

یہ درست ہے کہ اس دنیا میں مختلف قبیلے اور خاندان بستے ہیں اور وہ اپنے کنبہ و قبیلہ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں مگر اسلام نے بتایا ہے کہ کسی قبیلہ کو محض قبیلہ کی وجہ سے کسی دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں ہے بلکہ صرف یہ جان پہچان کا ذریعہ ہے۔ قرآن پاک میں صراحت ہے:

یَآاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ	اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک
ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ	عورت سے بنایا اور بنائے تمہارے
قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ (الحجرات: ۱۳)	کنبے اور قبیلے تاکہ آپس میں پہچان ہو۔

باقی عزت و مکرمت کی بنیاد قبیلہ و خاندان اور ذات پات نہیں ہے، بلکہ تقویٰ، خداترسی اور احکامِ الٰہی کی بجاآوری ہے، چنانچہ اعلان ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ	بیشک اللہ کے یہاں عزت اسی کو ہے
(الحجرات: ۱۳)	جو اس سے زیادہ ڈرنے والے ہیں۔

یہاں بھی صراحت ہے کہ سارے انسان ایک مرد و عورت سے پیدا ہوئے ہیں، آگے چل کر مختلف کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم ہوئے اور

اپنے کنبہ وقبیلہ کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں مگر عزت و مکرمت کنبہ وقبیلہ سے حاصل نہیں ہوتی ہے بلکہ خدا ترسی سے حصہ میں آتی ہے۔

انسانی مساوات

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی مساوات کا بار بار اس طرح اعلان فرمایا:۔

لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الّا بالتقوٰی۔	کسی عربی کو نہ کسی عجمی پر فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر، فضیلت تو صرف تقوٰی سے حاصل ہوتی ہے۔
(زاد المعاد ۴/۲۲)	

معلوم ہوا کہ بڑائی کی بنیاد خوفِ خدا اور خشیتِ الٰہی ہے، اس کا اظہار اسلام نے اپنی تمام عبادتوں میں کیا ہے۔ نماز ہو یا روزہ، حج ہو یا زکوٰۃ، تمام اعمال کی قبولیت کا دارو مدار حسنِ نیّت اور خلوص پر ہے، ارشادِ نبوی ہے "انّما الاعمال بالنیات ولکل امرأٍ مانوٰی" (بخاری ومسلم) مگر اس مساواتی زندگی کا مظاہرہ جیسا کہ مسجد میں ہوتا ہے اس کی کوئی نظیر نہیں۔

روزہ کے لئے ایک خاص مہینہ مقرر ہے جس کو رمضان کہتے ہیں خواہ کسی خطہ کا مسلمان ہو، اسے اسی ماہ میں روزہ رکھنا ہے، موسم گرم ہو یا سرد، دن بڑا ہو یا چھوٹا۔ حج کی ادائیگی کے لئے ساری دنیا کے مسلمانوں کو مکّہ مکرمہ ایک خاص مہینے کی خاص تاریخوں میں پہونچنا ہے اور سبھوں کو

خاص خاص ارکان ادا کرنا ہے۔ کسی کے لئے کوئی تمیز نہیں ہے اور نہ کسی ملک کے لئے کوئی خاص رعایت ہے۔ سبھوں کا اس وقت لباس یکساں ہوتا ہے، سبھوں کی زبان پر ایک ہی طرح کے کلمات ہوتے ہیں، جسے وہ چلتے پھرتے اور آتے جاتے ادا کرتے ہیں۔

نماز اور مسجدیں

زکوٰۃ کا بھی ایک نصاب مقرر ہے جو اس نصاب کا مالک ہوگا اس کو سال پورا ہونے پر اپنے مال کی زکوٰۃ نکالنا ہوگی، سبھوں کے لئے ایک ہی نصاب ہے، کسی کے لئے کوئی تفریق نہیں ہے، مال والوں سے لیا جائے گا اور مسکینوں و محتاجوں کو دیا جائے گا۔ اسی طرح تمام عاقل و بالغ مسلمانوں پر نماز فرض قرار دی گئی ہے۔ اس کے اوقات دن رات کے پانچ وقتوں میں مقرر کر دیئے گئے ہیں خواہ کسی خطۂ زمین میں رہتا ہو، اور کوئی بھی موسم ہو، انہی اوقات میں وہ اپنی اس عبادت کو ادا کرے گا۔ نوافل و سنن تو ہر شخص الگ الگ ادا کرے گا خواہ گھروں میں یا مسجدوں میں، مگر فرض نمازوں کے لئے طے کر دیا گیا ہے کہ وہ محلّہ کی مسجد میں ایک ساتھ ادا ہوگی اور ایک امام کی اقتدا میں ادا ہوگی، سب کو گھر چھوڑ کر یہیں آنا ہوگا اور مسلمانوں کو اسی لئے حکم دیا گیا ہے کہ وہ جہاں رہیں اور جس خطہ میں آباد ہوں، اپنے گھروں سے پہلے اللہ تعالیٰ کا گھر (مسجد) بنائیں، جو گھر ان کے لئے مرکز و ماویٰ کی حیثیت رکھے گا، اور دن رات کے پانچ مقرر وقتوں میں جمع ہو کر ربّ العالمین کے آگے سر بسجود ہوں گے اور جو کچھ مانگنا ہوگا ہر مسلمان اسی سے

مانگے گا، توحید کا نظارہ اسلام کی تمام عبادتوں اور اس کے ہر رکن میں موجود ہے مگر حج پوری زندگی میں صاحبِ استطاعت پر صرف ایک مرتبہ فرض ہے۔ روزہ پورے سال کے صرف ایک مخصوص مہینے میں فرض ہے زکوٰۃ بھی پورے سال میں صرف ایک مرتبہ نکالی جاتی ہے، حج میں صاحبِ استطاعت ہونا شرط ہے۔ زکوٰۃ میں صاحبِ نصاب ہونا ضروری ہے اور روزہ میں مقیم اور صحت مند ہونے کی شرط لگی ہوئی ہے۔

نماز کی اہمیّت

نماز ایک ایسی عبادت ہے جو ہر عاقل و بالغ کو دن رات کے پانچ وقتوں میں ادا کرنا ہے اور روزانہ کرنا ہے، اس میں نہ سال کی قید ہے اور نہ صاحبِ استطاعت ہونے کی اور نہ صاحبِ نصاب ہونے کی، امیر ہو یا غریب، مقیم ہو یا مسافر، سبھوں پر فرض ہے۔ صحت مند پر بھی ہے اور بیماروں پر بھی، البتہ معذوروں کے لئے تھوڑی رعایت ہے۔

غور کیا جائے تو ماننا ہو گا کہ یہ عبادت مسلمانوں کی زندگی کے ساتھ لگی ہوئی ہے بلکہ حدیثِ نبوی میں صراحت ہے کہ اس کی عادت سات سال کی عمر سے ہی لگائی جائے، اور جب بچّہ دس سال کا ہو جائے تو غفلت پر تنبیہ کی جائے۔

مروا صبیانکم بالصلوٰۃ اذا بلغوا سبعا واضربوھم اذا بلغوا عشراً (الحدیث)	جب تمہارے بچّے سات سال کے ہو جائیں تو تم انہیں نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر سزا دو۔

اس عبادت کے فرائض میں انفرادیت کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے یہ آزادی نہیں دی گئی ہے کہ اپنے طور پر جہاں چاہیں اور جیسے چاہیں ادا کر لیں بلکہ یہاں اجتماعیت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس اجتماع کے لئے خاص گھروں یعنی (مسجدوں) کے بنانے کا حکم دیا گیا ہے، جہاں سے ہر متعین وقت میں کلماتِ اذان کے ساتھ بلایا جاتا ہے۔ پھر اذان میں اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی کبریائی اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان ہوتا ہے، مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے مؤذن کہتا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ سب سے بڑا ہے، سارے جہاں سے بڑا ہے اور اس کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ گویا اس یقین کو علی الاعلان بار بار دہرایا جاتا ہے کہ ربّ العالمین سے بڑا کوئی نہیں ہے، اس سے بڑھ کر کوئی نہیں، وہ احکم الحاکمین اور تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور ساری کائنات اسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس کی بندگی بجالانا بندوں کے فرائض میں داخل ہے جو اس کے لئے فلاحِ دارین و صلاح کا ذریعہ ہے۔

نماز کے فوائد

اس عبادت میں بہت ساری بھلائیاں جمع کر دی گئی ہیں، چنانچہ اس عبادت کی ادائیگی کے لئے بدن کا پاک ہونا، کپڑوں کا پاک ہونا جس جگہ نماز ادا کر رہا ہے یا جس مصلیٰ پر ادا کر رہا ہے، اس کا پاک ہونا ضروری ہے۔ نماز سے پہلے وضو کرنا لازم ہے جس میں ظاہری

اعضاء دھوئے جاتے ہیں، ہاتھ پاؤں اور چہرہ کا دھونا ضروری ہوتا ہے۔ سر اور کانوں کا مسح بھی ہوتا ہے۔

اوقاتِ نماز میں بال بچّوں کو چھوڑ کر مسجد آنا، با جماعت فرض نمازوں کا ادا کرنا، صبح کو آنکھیں کھلیں تو کان اذان کی آواز پر لگے ہوتے ہیں، خواہ اس وقت نیند جتنی بھی پیاری ہو، اسے ترک کر کے اور بستر چھوڑ کر مسجد آتا ہے۔ یہ گرمی کا موسم ہو خواہ سردی کا موسم، اس طرح نماز مسلمانوں کو پاک وصاف کرنے کے ساتھ اوقات کی پابند بنا دیتی ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ جو مسلمان نمازی ہوتا ہے اس میں کاہلی اور سستی آنے نہیں پاتی ہے، وہ پاک وصاف بھی رہتا ہے اور پابندِ اوقات بھی۔

نظامِ مساجد

"نظامِ مساجد" نام سے جو کتاب پیش کی جا رہی ہے اس میں بقدرِ ضرورت تفصیل ہوگی، جس سے اس نظام کی مضبوطی و پائیداری کا اندازہ ہوگا اور اس کے فوائد پر روشنی پڑے گی۔

اس نظام میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہے، اسی کے ساتھ رشتۂ اخوّت و محبّت کو استوار رکھنے کی بھی سعیِ بلیغ پائی جاتی ہے اور دوسری طرف بندوں کا رشتہ ربّ العالمین سے مضبوط کیا گیا ہے اور ان کے فرائض کی یاد دہانی کی گئی ہے۔ "نظامِ مساجد" پر اگر مسلمان پورے طور پر عمل کرتے رہیں گے تو اس کی دُنیا بھی درست رہے گی اور دین بھی تروتازہ اور شاداب رہے گا۔

بلا شبہ صحت و تندرستی کے لئے بھی یہ سلسلہ مفید رہے گا اور ان کے قلب کا تزکیہ و تصفیہ بھی اس سے ہوتا رہے گا۔ بندوں میں بھی اسے سرفرازی حاصل رہے گی اور رب قدیر کی رضا اور اس کی خوشنودی بھی حصہ میں آئے گی۔

کتابت میں جو مضامین آئے ہیں، ان کا توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور ان پر پورا پورا عمل کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوا کہ روئے زمین کو بنی آدم کی آبادی سے زینت بخشے اور اپنے پُرشوکت قوانین کا ان میں نفاذ فرما کر امانتِ ازلی "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا" (الاحزاب: ۹۰) کی یاددہانی کرے تو ہبوطِ ارض کا واقعہ پیش آیا اور اس کی حکمت کا قرآن کے ان الفاظ میں اعلان کیا "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" اور ملائکہ نے جب استرشاداً حکمت پوچھی تو یہ فرما کر ان کو خاموش کر دیا: "اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" (البقرہ: ۳۰)

سیّدنا آدم علیہ السّلام جب دنیا میں تشریف لائے تو تخلیقِ آدم کے منشا کے ظہور کا وقت آ گیا اور ان کی خواہش ہوئی کہ کوئی ایسا گھر وجود میں آئے جس سے تکبیر و تہلیل اور تسبیح و تقدیس کی آوازیں بلند ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس پاک خواہش کو شرفِ قبولیت بخشا اور حضرت جبریل امینؑ کی رہنمائی میں مسجدِؑ حرام کی بنیاد

ؑ کعبہ کی تعمیر کا مسئلہ مختلف فیہ ہے بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد حضرت آدمؑ سے بہت پہلے ملائکہ نے ڈالی تھی، دیکھئے ابن کثیر جلد اوّل ص۱۷۳۔ ضروری تفصیل کے لئے میری کتاب "تاریخِ مساجد" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے زمین پر ڈالی گئی۔

روئے زمین کی پہلی مسجد

یہی دنیا کا سب سے پہلا گھر، دنیا کی سب سے پہلی مسجد ہے، اللہ تعالیٰ اس گھر کی اوّلیّت کا ذکر خود فرماتے ہیں:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ	بلاشبہ سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی
لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبَارَکاً	عبادت کے لئے مقرر کیا گیا وہ ہے جو
وَّھُدًی لِّلْعَالَمِیْنَ۔	مکہ میں ہے، برکت والا ہے اور جہان
(آل عمران: ۹۶)	بھر کے لوگوں کا رہنما ہے:

یہ دنیا کا پہلا معبد ہر طرح کی ظاہری، باطنی، حسّی اور معنوی برکتوں سے معمور ہے اور اخلاقی و دینی تعلیمات کا مرکز اور آج بھی یہ دنیائے اسلام کا کعبہ و قبلہ اور مرجعِ عام ہے جہاں ہر سال ذی الحجہ کے مہینے میں اطراف عالم اور اکنافِ دنیا کے مسلمانوں کا اجتماعِ عظیم ہوتا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

یارسول اللّٰہ ایّ مسجد	یا حضرتؐ! روئے زمین کی پہلی مسجد
وضع فی الارض اولاً۔	کون ہے؟

ارشاد فرمایا "المسجد الحرام" حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں میں نے کہا "ثم ایّ" پھر کون؟ ـــــ فرمایا "المسجد الاقصیٰ" دریافت کیا ان دونوں مسجدوں میں کتنے دنوں کا فاصلہ ہے؟ ارشاد ہوا چالیس

برس کا یعنی مسجد حرام کے چالیس سال بعد مسجد اقصیٰ کی طرح ڈالی گئی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ میرے لئے تمام روئے زمین مسجد ہے (۱) مطلب یہ تھا کہ امّتِ مرحومہ کے لئے ہر ایک جگہ نماز ادا کرنی جائز ہے۔

ایک علمی بحث اور اس کا جواب

محدثینؒ نے اس حدیث میں یہ اشکال پیدا کیا ہے کہ مسجدِ حرام کے بانی جیسا کہ مشہور ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السّلام کہے جاتے ہیں، اور مسجد اقصیٰ کے بانی حضرت سلیمان علیہ السّلام، اور ان دونوں بزرگوں کے درمیان ہزار سال کا بُعد ہے، پھر یہ چالیس سال کی روایت کیوں کر صحیح ہو گی؟۔

جواب یہ دیا گیا ہے کہ مسجد حرام کے بانیِ اوّل حضرت آدم علیہ السّلام ہیں، طوفانِ نوح میں یہ گھر اٹھا لیا گیا تھا اور پھر اسی حالت میں پڑا رہا۔ تا آنکہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے بحکم الٰہی اپنے زمانے میں اس کی دیواریں اٹھائیں جس میں آپ کے شریکِ کار آپ کے لاڈلے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام رہے، قرآنِ پاک نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ (البقرہ ۱۲۷)	اور جب اُٹھا رہے تھے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ خانہ کعبہ کی دیواریں۔
وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِیْمَ مَكَانَ	اور جب ہم نے بتلا دیا ابراہیمؑ کو خانۂ کعبہ کی

(۱) مشکوٰۃ باب المساجد فصل ثالث عن الصحیحین ص۲۷

الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَيْئًا۔ جگہ کہ میرے ساتھ کسی کو شریک مت
(الحج: ۲٦) کرنا۔

اور مسجد اقصیٰ کے بانیِ اوّل بھی حضرت آدم علیہ السّلام ہی ہیں۔ محققین کا بیان ہے کہ تعمیر کعبہ کے بعد آپ کو بیت المقدس جانے کا حکم ہوا تھا، غالباً اسی زمانہ میں آپ نے مسجد اقصیٰ کی بنیاد رکھی ہوگی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بانیِ ثانی کی حیثیت رکھتے ہیں، خلاصہ یہ ہوا کہ دونوں کے مؤسس حضرت آدم علیہ السلام ہی ہیں اور حضرت ابراہیم و سلیمان علیہما السلام مجدّد ہیں (۱) اس صراحت کے بعد اشکال باقی نہیں رہتا۔

کعبہ کی قدامت پر قرآن کی شہادت

مسجد حرام کی قدامت پر خود قرآن پاک بھی شاہد ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے جگر گوشہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑا تھا، اس وقت دعا کی تھی:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ اے ہمارے رب! بیشک میں اپنی بعض
بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ اولاد کو بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے
بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا محترم گھر کے پاس آباد کرتا ہوں تاکہ وہ
لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ الخ (ابراہیم: ۳۷) نماز قائم کریں۔

اس دعا میں عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (تیرے محترم گھر کے پاس) کا مطلب یہی تو ہے کہ مسجد حرام اس وقت بھی موجود تھی، اور یہ وہ

---

(۱) فتح الباری جلد اول واشعۃ اللمعات قلمی ج ۱ ص ۱۹۲۔

زمانہ ہے جب حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام شیر خوارگی کے دَور میں تھے (۱) اور مسجدِ حرام (بیت اللہ) کی دیواریں باپ بیٹے نے مل کر اس کے ایک عرصہ بعد کھڑی کی ہیں، جب حضرت اسمٰعیل علیہ السَّلام سنّ شعور کو پہنچے ہیں۔

حافظ ابن القیمؒ نے اس اشکال کا دوسرا جواب دیا ہے کہ مسجدِ اقصیٰ کے مؤسِّس حضرت یعقوب علیہ السَّلام ہیں، جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السَّلام کی تعمیر کعبہ کے چالیس برس بعد مسجدِ اقصیٰ بنائی اور سلیمان علیہ السلام مؤسِّس نہ تھے، مجدّد تھے (۲)

لیکن میں سمجھتا ہوں پہلا جواب اس سے زیادہ مناسب ہے کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السَّلام بھی مؤسس نہیں بلکہ تجدید ہی کرنے والے تھے جیسا کہ قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

فتح العزیز کا خلاصہ

تعمیر کعبہ کے متعلق حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مختلف کتابوں کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:-

یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اس محترم گھر (بیت اللہ) کی بنیاد ابتداءً عہد آدم علیہ السَّلام میں پڑی، اس کے بعد برابر یہ مقدس مقام انبیاء و صلحاء کا معبد اور قبولیتِ دعا کا مرکز رہا، آپ جب جنّت

(۱) احکام القرآن لابن العربی، سورۂ ابراہیم۔

(۲) زاد المعاد ج ۱ ص ۸۔

سے زمین پر اتارے گئے تو التجا کی، خدایا آسمان کی طرح یہاں بھی کوئی گھر ہو جہاں تسبیح و تہلیل کی گونج رہے، یہ درخواست مقبولِ بارگاہ ہوئی اور نشان دہی فرمادی گئی، اور اسی نشان پر بنیاد رکھی گئی، جو طوفانِ نوح علیہ السلام تک موجود رہا، طوفان میں اٹھالیا گیا مگر اس کے نشانات باقی تھے، اسی کی طرف لوگ قبولیتِ دعا کے لئے رجوع کرتے رہے تا آنکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنانے کا حکم ہوا، آپ نے بنانے کا ارادہ کیا تو ایک سکینہ سایہ فگن ہوا اور حضرت جبریل امینؑ نے اس کی مدد سے خطوط کھینچے جس پر ابراہیم علیہ السلام نے کھود کر بنائے آدمؑ نکالی اور اسی پر مقدس گھر تعمیر پایا (۱)

اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بنی آدم کے زمین پر قدم رکھتے ہی مسجد کی تعمیر عمل میں آئی اور ربّ العزت نے پورے اہتمام سے خود اپنی نگرانی میں اس محترم مسجد کی نشاندہی فرمائی جو مسجد کی عظمت و اہمیّت کا بیّن ثبوت ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ روزِ اوّل سے ہی اسے مرکزِ وحدت قرار دیا گیا۔

مسجد کی امتیازی شان

ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد اور دوسری مسجدیں قیامت کے دن اور چیزوں کی طرح فنا نہ ہوں گی بلکہ یہ ساری کی ساری اکٹھی ہو جائیں گی۔

تذھب الارض کلھا یوم   قیامت کے دن مسجدوں کے سوا ساری

---

(۱) تفسیر عزیزی سورۂ بقرہ صفحہ ۲۶۱۔

القیمۃ الا المساجد ینضم بعضھا الیٰ بعضٍ (کنز العمال ۴/۱۳۹) زمین فنا ہو جائے گی اور یہ مساجد ایک دوسرے سے مل جائیں گی۔

اس حدیث سے اتنی بات تو معلوم ہوتی ہے کہ مساجد کو امتیازی شان حاصل ہوگی اور یہ دوسری چیزوں کی طرح برباد نہ ہوں گی، باقی یہ سوال کہ سب مل ملا کر کیا ہوں گی؟ اس کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا، ہاں دوسری حدیث کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فردوس اعلیٰ کو منتقل ہو جائیں گی۔

اس قدر ثابت ہو جانے کے بعد مسجدوں کے نظامِ وحدت اور اس کی دینی مرکزیت کی طرف جو لطیف اشارہ ہے وہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔

عہد نبوی ﷺ کی پہلی مسجد

ابو البشر آدم علیہ السلام سے نبوت کا جو سلسلہ شروع ہو کر چلا آرہا تھا، وہ سید البشر خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ آپ پر دین کی تکمیل اور نبوت و رسالت کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ ۳:۵) آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دینِ اسلام پسند کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی جن مصیبتوں اور تکلیفوں میں گھری ہوئی اور جن دل ہلا دینے والی آفتوں اور

پریشانیوں سے لبریز تھی، اس کی کوئی ادنیٰ مثال تاریخ میں نہیں مل سکتی، مکّی زندگی جن مشکلات و مصائب سے پر گذری ہے اسے سیرت کی کتابوں میں مطالعہ کریں، آپؐ کو اور آپؐ کے جان نثاروں کو جس قسم کی اذیّتیں دی گئیں صرف اس کے تصوّر سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ایسے نازک اور کٹھن دَور میں باضابطہ مسجد کی تعمیر کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا، پھر مسجدِ حرام موجود ہی تھی جس سے حصولِ اطمینان کے وقت کام لیا جا سکتا تھا۔

یہی وجوہ ہیں کہ مکّی زندگی میں کسی باضابطہ مسجد کی تعمیر کا پتہ نہیں ملتا، چھپ چھپا کر لوگ نماز پڑھ لیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کے یہاں جلوہ افروز ہوتے اور تمام صحابۂ کرام پروانہ وار جمع ہو جاتے اور اسی مجلس میں آپ تبلیغ و تلقین فرماتے، گویا جماعت کی نماز کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا، جہاں وقت آجاتا نماز پڑھ لی جاتی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	مسجد بننے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ
یصلی قبل ان یبنی المسجد	علیہ وسلم جہاں وقت آتا نماز
حیث ادرکتہ الصّلوٰۃ (۱)	پڑھ لیتے۔

البتہ بعض صحابۂ کرامؓ نے اپنے گھروں میں نماز کے لئے ایک جگہ متعین کر لی تھی جہاں وہ تہجد و نوافل اور گریہ و زاری میں

(۱) ابن ماجہ ۱/۵۴۔

رات کے وقت مشغول ہوتے اور اللہ تعالیٰ سے طلبِ مغفرت کرتے جن کو فقہ کی اصطلاح میں "مسجد البیت" کہہ سکتے ہیں انہی کو بعض محدّثین نے مسجد سے تعبیر کیا ہے۔

باضابطہ مسجد اس وقت بنی جب کفارِ مکہ کی مسلسل ایذا رسانیوں سے زندگی دوبھر ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے مدینہ منورہ ہجرت فرماتے ہوئے مقامِ "قبا" میں نزولِ اجلال فرمایا، یہاں کے چند روزہ قیام میں سب سے پہلے مسجد وجود میں آئی جس کی بنیاد کی پہلی اینٹ خود ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی، پھر صدیقِ اکبرؓ نے، پھر فاروقِ اعظمؓ نے، پھر اور صحابۂ کرامؓ نے (۱) خود ہی معمار بھی تھے اور مزدور بھی اور اس شان و شکوہ سے عہدِ رسالت کی پہلی مسجد تیار ہوئی (۲) اس مسجد کو بارگاہِ احدیّت میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ قرآنِ پاک نے اِن لفظوں میں اس کی رفعت و عظمتِ شان کا اعلان کیا:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى	البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اوّل دن سے
مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ	تقویٰ پر رکھی گئی ہے زیادہ لائق ہے
فِيْهِ۔ (التوبۃ: ۱۰۸)	کہ آپؐ اس میں کھڑے ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پہلی مسجد سے ایسی والہانہ محبّت تھی کہ ہر شنبہ (سنیچر) کو اس میں تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے (۳) آپؐ کے اصحابؓ نے بھی اپنے وقتوں میں اس

---

(۱) وفاء الوفاء جلد اول ص۱۸۱۔

(۲) ابن قیمؒ لکھتے ہیں "ھو اول مسجد اسس بعد النبوۃ"، زاد المعاد ۲/۵۵ وفاء الوفاء ج ۱ ص۱۷۱۔ (۳) بخاری و مشکوٰۃ وغیرہ۔

پر عمل باقی رکھا، حضرت فاروقِ اعظمؓ کا دستور ہو گیا تھا کہ ہفتہ میں دو دن تشریف ضرور لاتے اور خدمت کی ضرورت محسوس کرتے تو خود خدمت انجام دیتے، حتیٰ کہ خود مسجد کو جھاڑتے تھے (۱) یہ مسجد مدینہ منورہ سے تین میل کی دوری پر ہے۔

مسجدِ نبویؐ

چند دنوں کے بعد قبا سے شہر کی طرف روانہ ہوئے، مدینہ پہنچ کر سب سے پہلا کام جو کیا وہ مسجدِ نبوی کی تعمیر تھی، ناقہ جہاں بیٹھی تھی اسی جگہ بنی نجار کے دو یتیموں کی پڑی ہوئی (ویران) زمین تھی۔ آپؐ نے اس کے متعلق خواہش کا اظہار فرمایا، اس خواہش کی اطلاع پاکر وہ زمین آپؐ کی خدمت میں بغیر کسی قیمت کے پیش کی گئی اور آپؐ سے قبول کرنے کی درخواست کی گئی، مگر آپؐ نے یہ گوارا نہ فرمایا اور قیمتاً ہی لینے پر راضی ہوئے۔ چنانچہ قیمت دے کر زمین مذکور حاصل کی گئی، قیمت ادا کرنے کا شرف صدیقِ اکبرؓ کی جیبِ خاص نے حاصل کیا (۲)۔

اب آپؐ نے صحابہ کرامؓ کی معیت میں اسی جگہ مسجد نبوی کا سنگ بنیاد رکھا، پہلی اینٹ خود ذات بابرکت سراپا رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی اور پھر آپؐ کے خلفاء واصحابؓ نے۔ اینٹوں کے ڈھونے کا کام خود بہ نفسِ نفیسؐ اور صحابہ کرامؓ کر رہے تھے اور آپؐ کی زبانِ وحی ترجمان اعلان کر رہی تھی:

---

(۱) وفاء الوفاء ۲/۲۱ وجذب القلوب بیان مسجد قبا۔
(۲) نووی شرح مسلم ۱/۲۰۰ مطبوعہ نول کشور۔

اللھم لاخیر الا خیر الاخرۃ　　بھلائی بس آخرت کی ہے اے اللہ
فارحم الانصار والمہاجرۃ۔　　انصار و مہاجرین پر رحم فرما۔

گویا اس مسجدِ محترم کے معمار اور مزدور بھی خود یہی داعیانِ اسلام اور اساطینِ اُمّت تھے (۱)

ان خدا پرستوں نے آپؐ کی نگرانی میں جو مسجد تیار کی وہ ساری تکلفات اور آرائش سے پاک تھی، نہ نقش و نگار تھے اور نہ جھاڑ اور فانوس، نہ چمکتے دمکتے پتھر تھے اور نہ آنکھیں خیرہ کرنے والا رنگ و روپ، بلکہ مسجد نبوی سادگی کی آپ اپنی مثال تھی، کچی اینٹوں کی دیواریں، کھجور کے پتوں کی چھت اور کھجور ہی کے ستون (۲)

اوّل اوّل ان مسجدوں کی بنیادیں اشارہ ہیں کہ مومن کو جہاں کہیں قابو بخشا جائے وہ سب سے پہلے بلکہ اپنے گھر سے بھی پہلے عبادت گاہ تیار کریں اور ان کو اپنے اجتماعی نظام کی روح اور اپنی دینی مرکزیت کی جان سمجھیں اور ان میں نمونہ ہے کہ ایسی سادہ ہوں کہ ہر امیر و غریب اپنی آبادی میں بآسانی اس مقدس گھر کو قائم کر سکے۔

مسجدِ نبویؐ کی حیثیت

مرکزِ اسلام کی یہ مسجد صرف رسمی مسجد نہ تھی بلکہ اسلام کا ناقابلِ تسخیر قلعہ تھی جہاں دین و دنیا کے سارے قوانین ترتیب پاتے تھے لشکرِ اسلام کو قواعدِ جنگ بتلائے جاتے تھے، یہیں سے جہاد میں فوج روانہ کی جاتی تھی، وفود یہیں اترتے تھے، اسی میں مدینہ کا پہلا

(۱) جذب القلوب کیفیت بنائے مسجد نبویؐ۔
(۲) بخاری باب بنیان المسجد۔

اسلامی دارالعلوم تھا، اسی میں رسول الثقلینؐ کا دربار لگتا تھا، اسی میں فصل خصومات سنائے جاتے تھے اور اسی میں مجرمین کو قید بھی کیا جاتا تھا، گویا دارالشریعت (پارلیمنٹ) دارالعلوم (یونیورسٹی) دارالعساکر (فوجی چھاؤنی) اور دارالحبس (جیل خانہ) سب کا کام اسی مسجد مقدس سے لیا جاتا تھا اور اسی میں وہ متبرک حصہ بھی ہے جس کو حدیث میں "روضۃ من ریاض الجنۃ" فرمایا گیا ہے، جس کی تشریح میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔

مگر محققین نے اسے اس کے ظاہر پر محمول کیا ہے کہ زمین کا یہ حصہ واقعی جنت سے لایا گیا ہوگا، جس طرح حجرِ اسود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے جنت سے لایا جانا کہا جاتا ہے اسی طرح یہ حصہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اتارا جانا ممکن ہے جن کو ہماری آنکھیں اپنی طبعی ظلمت کی وجہ سے تمیز کرنے سے قاصر ہیں (۱)

اسی مسجد محترم کے باب میں آپؐ کا ارشاد ہے:

صلوٰۃ فی مسجدی ھذا خیر من الف صلوٰۃ فیما سواہ الا المسجد الحرام (۲)	میری اس مسجد میں ایک نماز دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نماز سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے۔

مسجد مکہ اور مدینہ کی باہمی فضیلت

اس باب میں علماء مختلف ہیں کہ مسجد حرام و مسجد نبوی میں کس کو فضیلت حاصل ہے، بلکہ یوں کہئے کہ مدینہ اور مکہ میں کس کو فضیلت

(۱) اشعۃ اللمعات قلمی ۱/۱۸۲ وجذب القلوب فصل روضۃ من ریاض الجنۃ۔
(۲) بخاری

ہے، یہ تو اجماعِ امّت اور اتفاقِ علماء سے ثابت ہے کہ موضع قبرِ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تمام زمین و آسمان سے افضل ہے جس طرح آپؐ ساری کائنات سے اشرف و افضل تھے اسی طرح آپؐ کا روضۂ اطہر بھی تمام سے افضل و اشرف ہے، پھر کعبۂ مکرمہ کو (سوائے روضۂ اطہر) تمام پر فضیلت حاصل ہے، باقی مسجدِ حرام اور مسجد نبوی یا مکہ اور مدینہ میں اکثر علماء مسجد حرام کی فضیلت کے قائل ہیں، جس کی حدیث سے بھی تائید ہوتی ہے مگر امام مالک رحؒ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کو فضیلت حاصل ہے کیوں کہ یہ محترم و مقدس مسجد دس سال تک درسگاہِ نبوت اور سجدہ گاہِ رسولؐ رہ چکی ہے اور اسی زمین میں آپؐ آرام فرما ہیں، محققین علماء کی رائے ہے کہ من وجہٍ (مثلاً حق نماز میں) مسجد حرام کا درجہ بڑھا ہوا ہے اور من وجہٍ (مثلاً حق موت میں) مسجدِ رسول کا درجہ (۱)

مگر اس بحث میں پڑنا قرینِ عقل نہیں، ان دونوں میں سے ہر ایک کی فضیلت اپنی جگہ ہمارے لئے مسلّم ہے، ایک مقام آپ کی پیدائش، جوانی اور نبوت کے حصول کا ہے تو دوسرا اشاعتِ دین اور غلبۂ اسلام کا۔ مسجد نبوی کو دائمی قربت حاصل ہے تو مسجد حرام کو قبلہ و کعبہ اور مرجع عام ہونے کی فضیلت حاصل ہے، اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ قرآن پاک میں اس کا تذکرہ بار بار آیا ہے اور اسے "مُبَارَکًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ" کے معزّز خطاب سے سرفراز کیا گیا ہے، ہم گناہگاروں کے لئے دونوں ہی فیوض و

(۱) جذب القلوب باب ثانی ورسائل ارکان بحر العلوم ص: ۲۸۳۔

برکات کے منبع اور سرچشمہ ہیں (اللہ تعالیٰ بار بار سب کو زیارت نصیب فرمائے) باقی علماء احناف کا فیصلہ یہ ہے، افضل مسجد مکہ، پھر مسجد مدینہ، پھر قبا۔[1]

مسجد حرام، مسجد نبوی اور اقصیٰ

بلاشبہ مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ اپنی تاریخی اور دینی اہمیّت کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ اسلام میں جو مرتبہ اور بزرگی ان مسجدوں کو حاصل ہے وہ کسی اور کو میسّر نہیں، ان کی عظمت کا یہ حال ہے کہ تقرّب الی اللہ (ثواب) کی نیت سے ان مسجدوں کے لئے سفر کرنا جائز بلکہ مطلوب ہے، اوروں کے لئے اجازت نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لا تشد الرحال الا الی ثلثة	بالارادہ سفر کرنا درست نہیں ہے،
مساجد مسجد الحرام و	مگر تین مسجدوں کے لئے، مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ
المسجد الاقصیٰ و مسجدی	اور میری یہ مسجد (نبوی)
هٰذا (۲)	

یہ حدیث بہت واضح ہے اور ان تین مسجدوں کی عظمت کو نمایاں کر رہی ہے، بقیہ دوسری مساجد کی طرف ثواب کی نیت سے سفر کی اجازت نہیں دی گئی ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسرے مقاماتِ متبرکہ کی طرف بھی ثواب کی نیت سے سفر

(۱) درمختار ص ۱۲۔ (۲) بخاری و مسلم۔

جائز نہیں ہے، یوں جانا یا کسی اور ضرورت سے جانے میں البتہ کوئی مضائقہ نہیں ہے جیسے حصولِ علم، تجارت، تفریح وغیرہ (۱) بلکہ کبھی ایسی ضرورت بھی آپڑتی ہے کہ سفر مطلوب ہو جاتا ہے مثلاً کسی پر کوئی حق واجب الادا ہو، علومِ قرآن وحدیث مقصود ہوں۔

یہ دھوکہ ہرگز نہ ہو کہ کوئی سفر کرے تو مقاماتِ متبرکہ دیکھنے نہ جائے، یا مشہور و معروف مسجدیں نہ دیکھی جائیں، اس میں اس کو اختیار ہے، ہاں یہ نیت ہرگز نہ ہو کہ دہلی کی جامع مسجد کی زیارت سے نصف حج کا ثواب ملے گا اور اجمیر کی حاضری سے ایک حج کا ثواب حاصل ہوگا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس کی ممانعت کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"اہلِ جاہلیت چند جگہوں کو اپنے خیال میں باعظمت اور متبرک سمجھ کر ان کا قصد کرتے اور ان کی زیارت کو جاتے تھے، حالانکہ اس میں تحریف و فساد کھلا ہوا تھا، اسی وجہ سے آنحضرت صلعم نے فساد کا دروازہ ہی بند فرما دیا، تاکہ شعار دین دوسرے شعار سے جو دین نہیں ہیں خلط ملط نہ ہو، اور آگے چل کر غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ نہ بن سکے" (۲)

---

(۱) اشعۃ اللمعات قلمی ۱/۱۸۲۔

(۲) حجۃ اللہ البالغۃ ۱/۱۹۳۔

درجاتِ مساجد

اوپر کی حدیث سے اتنی بات ضرور معلوم ہوئی کہ مسجدوں کے درجے آپس میں متفاوت ہیں، اور یہ درست بھی ہے، خود ان تین مسجدوں کے مراتب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، چنانچہ ابن ماجہ شریف کی ایک حدیث میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فرض نماز جو گھر میں بغیر عذر شرعی پڑھی جائے ایک ہی نماز کے برابر ہے اور مسجدِ محلہ میں باجماعت پڑھی جائے تو پچیس گونہ اس کا ثواب بڑھا ہوا ہے اور جامع مسجد میں.....
..... پانچ سو نمازوں کے برابر ہے اور مسجد اقصٰی میں جو نماز پڑھی جائے وہ پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور جو نماز میری مسجد (نبوی) میں پڑھی جائے وہ اس سے پچاس ہزار درجہ بڑھی ہوئی ہے اور مسجد حرام کی نماز ایک لاکھ درجہ زیادہ رکھتی ہے (۱)

فقہاء کرام نے دوسری حدیثوں کے پیشِ نظر مسجد اقصٰی کے بعد مسجد قبا کا درجہ بتایا ہے پھر جامع مسجد کا، پھر محلہ کی مسجد کا، پھر شارع عام کی مسجد کا، لیکن پنج وقتہ کے لئے محلہ کی مسجد کو جامع مسجد پر فضیلت حاصل ہے، البتہ جمعہ کی نماز جامع مسجد ہی میں افضل ہے (۲) کیوں کہ سلفِ صالحین اور صحابۂ کرام کا تعامل

---

(۱) مشکوٰۃ باب المساجد فصل ثالث مع حاشیہ بحوالہ مرقاۃ۔

(۲) ردالمحتار (شامی) جلد اول ص: ٦١٧۔

آپ کے بعد یہی رہا کہ پنج وقتہ نماز اپنے محلہ کی مسجد میں پڑھتے رہے اور آج بھی صالحین کا یہی تعامل ہے۔

ایک محلہ میں چند مسجدیں ہوں تو سب سے زیادہ حق اس مسجد کا ہے جس میں جماعت بڑی ہوتی ہو پھر جو قریب تر ہو، پھر جو قدیم تر ہو اور ہر طرح مساوی ہوں تو جس مسجد میں قلبی رجحان پایا جائے اور اگر نمازی عالم دین ہے جس کی ذات سے لوگوں کے زیادہ سے زیادہ آنے کی توقع کی جاتی ہے تو اس کو اس مسجد میں نماز پڑھنی چاہئے جس میں نمازیوں کی آمد کم ہے تاکہ اس کی وجہ سے جماعت میں اضافہ ہو سکے اور مسجد آباد رہے (۱)

مگر طالب علموں کو یہ رعایت ہے کہ وہ جاکر اپنے استاذ کی مسجد میں نماز پڑھیں تاکہ استاذ سے بھی مستفید ہو سکیں، ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ محلہ کی مسجدوں میں اس مسجد کو خاص شرف حاصل ہے، جس کا امام عالم باعمل اور متقی ہو (۲)

تفاوتِ درجات کا راز

غور کیا جائے تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تفاوتِ درجات بے وجہ نہیں ہے بلکہ مصالح اور حکم پر مبنی ہے، مسجد حرام کے جو فضائل ضمناً گذر چکے ہیں وہ خود ایک مستقل وجہ فضیلت ہے، پھر حج کی فرضیت، اس میں ثواب کا چند در چند مضاعف ہونا یہ سب مل کر ایمان والوں کے دلوں میں ایک ہیجان کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں،

---

(۱) ردالمحتار ۱/۶۱۷-۶۱۸۔ (۲) حوالہ سابق، ص: ۶۱۶، ۶۱۷۔

اوراس طرح ہر خطۂ ارض سے لوگوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا سال میں ایک مرتبہ اور بھی سہل ہو جاتا ہے، وہاں فرشتوں کی ایک جماعت مقرر ہے جو وہاں کے باشندوں پر چھائی ہوئی رہتی ہے اور آنے والوں کے لئے دعا کرتی ہے (۱) مرد مؤمن کو وہاں پہنچتے ہی غفلت کا پردہ اٹھتا نظر آتا ہے اور یہ یاد ایک شور بپا کر دیتی ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے تولّد فرمایا، جوان ہوئے اور آپ کو نبوت کی عزت حاصل ہوئی اور پھر اس کے بعد بہت سی اذیتیں دین کے لئے برداشت کیں، یہی وہ جگہ ہے جہاں دنیا کی شیرازہ بندی کا اسلام کے نام پر اعلان ہوا، اس مسجد حرام کو بیت اللہ کہتے ہیں اور اسی میں حجر اسود جیسا ذی مرتبت پتھر نصب ہے۔

مسجد نبوی کو بھی ان میں سے بہت سی چیزیں حاصل ہیں، علاوہ ازیں اس کی نسبت فخر دو عالم صلعم کی طرف مقبولیت کی سند اور عظمت کا نشان ہے، یہی وہ مسجد محترم ہے جہاں دس برس تک مسلسل سیّد الکونین ؐ نے سجدے کئے اور خود بہ نفسِ نفیس ان صحابۂ کرامؓ کی امداد سے تیار کیا جن کے متعلق قرآن نے اعلان کیا "رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ"، یہاں پہنچ کر آپ ؐ کی زندگی کا دوسرا پہلو آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے، یہیں سے اسلام کی نورانی کرنیں عرب و عجم کو پہنچیں اور ایمان کی دولت لٹائی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس خاک پاک کو دائمی قربتِ رسول کا شرف حاصل ہے۔

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ ۱/۱۹۲۔

مسجد اقصیٰ یہ پہلینوں قبلہ کے شرف سے مشرف ہو چکی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلۂ اولیٰ یہی مسجد تھی، آپؐ سے پہلے یہ بہت سے نبیوں کا مرکز رہ چکی ہے، وہاں آج بہت سے انبیاءِ کرام آرام فرما ہیں، معراج میں آپؐ کو یہاں لایا گیا تھا جس کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے، یہ اور اس طرح کی دوسری فضیلتوں کی وجہ سے یہ بھی اپنا ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔

مسجد قبا کے متعلق ابھی لکھ آئے ہیں کہ یہ عہد نبوی کی پہلی مسجد ہے۔ آپ نے اپنے صحابۂ کرامؓ کی معیت میں اسے تیار فرمایا ہے اور قرآن پاک نے سندِ تقویٰ عطا کی ہے۔

ان کے بعد جامع مسجد کا مرتبہ ظاہر ہے، ہفتہ میں ایک مرتبہ یہ ایک بڑی تعداد کو اپنے دامن میں لے کر یکجا کر دیتی ہے اور محلہ کی مسجد دن رات کے پانچ وقتوں میں اپنے محلہ کے ایمان والوں سے پُر نور رہتی ہے، محلہ کی مسجد میں جماعت کا جو اہتمام رہتا ہے شارعِ عام کی مسجد کو حاصل نہیں ہوتا، غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے اجتماع کے التزام اور اس کے عظیم الشان ہونے میں بھی مرتبہ کی بلندی مضمر ہے۔

مسجدوں کا قدرتی نظام

انفرادی طور پر نماز پڑھی جا سکتی ہے اور نفل نمازیں پڑھی جاتی ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ ہوا کہ فرض نمازوں کو اجتماعی شکل دی جائے اور پراگندہ و منتشر افراد کی شیرازہ بندی

کا مظاہرہ کیا جائے اور قرآن نے تالیفِ قلوب(۱) کا جو احسان جتلایا ہے اس کا عملی طور پر بھی رات اور دن اعلان ہوتا رہے چنانچہ اس کے لئے ایک مستقل نظام قائم کیا، جس قدرتی نظام میں سارے مؤمنوں کو حتی الوسع یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہم اس نظام کو "نظامِ مسجد" سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی عظمتِ شان دلوں میں بٹھانے کے لئے ابتدائے آفرینش سے اس سلسلہ کو جاری فرمایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو خوب مستحکم کردیا گیا۔ جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ آپؐ نے اس نظام کی بنیاد خود اپنے ہاتھوں رکھی اور حکم فرمادیا کہ ہر ہر محلہ اور آبادی میں اس نظام کو پوری پختگی اور جرأت سے قائم کیا جائے کیوں کہ اس میں دینی اور دنیوی، حسّی اور معنوی بے شمار فائدے ہیں۔

اس نظام کی پختگی

اس نظام میں جس کو ہم مسجد کہتے ہیں بہت عمدہ تدریجی ترقی ملحوظ رکھی گئی ہے، ہفتہ بھر ہر محلہ اور ہر آبادی والے اپنے محلہ اور گاؤں کی مسجد میں جمع ہو کر پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں، پھر یہ پانچ وقت ہر ایک کے لئے متعین ہیں، کوئی اس کے خلاف کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تاکہ ایک ہی وقت میں پوری دنیا اپنی اپنی جگہ عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو۔

---

(۱) اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آلِ عمران: ۱۰۳)

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جس طرح دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں پیدا ہوا ہے اور نہ تنہا کوئی کام انجام دے سکتا ہے بلکہ اپنی دنیاوی زندگی میں وہ اپنے بہت سے معین و مددگار اور حامیوں کا محتاج ہے، دوستوں، بھائیوں، بہی خواہوں اور بے شمار ساتھیوں کے تعلقات کے ساتھ خوشگوار زندگی جکڑی ہوئی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام میں بھی بندہ کو اپنے شرکارِ کار، ہاتھ بٹانے والوں اور مدد کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ ایک خدا کے ماننے والے، ایک رسول کے امتی، ایک کتابِ مقدس کے قانون کے پابند اور ایک دین کے پیرو کار اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ایک پاک جگہ جمع ہوں اور ایک مقصد کی خاطر، عاجزی، تواضع اور ذلت و مسکنت کا اظہار کریں اور پروردگارِ عالم سے حصولِ مقصد کے لئے دعا اور مناجات کریں اور منظم ہو کر شیطانِ رجیم کا مقابلہ کریں، کیوں کہ اگر ہر ایک نے دوسرے کی پشت پناہی نہ کی، منظم ہو کر صف بستہ نہ آئے تو دشمن کا لشکر منتشر اور پراگندہ افراد کو موقع پا کر شکست دے سکتا ہے۔

پھر یہ تنظیم کھوکھلی نہ ہو بلکہ ہر پہلو اور ہر اعتبار سے مستحکم اور ٹھوس ہو، ظاہری اجتماع کے ساتھ باطنی اجتماع بھی پختہ تر ہو، جسم کی صفوں کی درستی کے ساتھ دل کی صفوں کی درستی بھی ہو اور ظاہری پاکی و صفائی سے بڑھ کر باطن کی پاکی اور صفائی حاصل ہو، ایک ہی اصول کے سب پابند اور ایک ہی امیر یا امام کے سب تحت میں ہوں۔

تدریجی ترقی

چنانچہ اسلام نے اس کا ایسا ہی مستحکم نظام قائم کیا ہے، مسجد کے نام سے ایک خاص گھر بنا دیا گیا ہے، جس میں کسی خاص شخص کی نہ ملکیت ہوتی ہے اور نہ اس کا شخصی قبضہ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر کہلاتا ہے، اس میں سارے مسلمان برابر کے شریک ہیں (۱)، اجتماع کے خاص خاص وقت متعین کر دیئے گئے ہیں تاکہ ایک ہی وقت میں دنیا کے سارے ارکینِ اسلام اپنی اپنی اس قدرتی اسمبلی میں جمع ہو جائیں اور ۔۔۔۔۔۔ سب مل کر ایک امام کے پیچھے ایک ساتھ شانہ سے شانہ ملا کر کھڑے ہو جائیں، اٹھنے بیٹھنے، کھڑے ہونے اور تمام حرکت وسکون میں اسی ایک کی پیروی کریں، نہ کوئی امام سے پہلے جھک سکتا ہے، نہ اس سے پہلے قیام وقعود کر سکتا ہے اور نہ کوئی ایسی حرکت کر سکتا ہے جو اس کے خلاف ہو، سب کے سب چاہے امیر ہوں چاہے غریب، بادشاہ ہوں کہ گدا، اسی کی متابعت کرتے ہیں اور یکجائی اظہارِ بندگی کرتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ہم اللہ کو دیکھ رہے ہیں ورنہ کم سے کم یہ کہ وہ تو ہمیں ضرور دیکھ رہا ہے۔

پورے ہفتہ کے بعد ایک مخصوص دن پہنچا تو ایک قدم اور بڑھایا، محلہ محلہ اور بستی بستی کے مسلمان نہا دھو کر حسبِ استطاعت خوشبو لگا کر اپنے اپنے گھروں سے نکلے، مسجد کا راستہ ایک عمدہ

---

(۱) احکام القرآن لابن العربی سورۂ بقرہ ۱/۱۵۔

منظر پیش کر رہا ہے، سب ہر طرف سے آکر ایک ہی گھر میں داخل ہو رہے ہیں، آج نسبتہً صاف ستھرے ہیں، چہروں پر وجاہت ہے اور چال میں وقار کی نمایاں جھلک، دیکھتے ہی دیکھتے بغیر کسی اشتہار اور اعلان کے مسجد بھر گئی، سب محلہ کے مسلمان یکجا ہو گئے، سنتیں پڑھی گئیں اور لوگ تسبیح و تقدیس اور تلاوت میں مشغول ہو گئے۔

سیکڑوں، ہزاروں ایمانی شمعیں مل ملا کر جمع ہو گئیں، ان کی ملی جلی روشنی نے پوری مسجد کو نور سے بھر دیا، ہر ایک دل کی کلی کھل کر مسکرانے لگی اور ہر ایک کا عکس دوسرے کو منوّر کرنے لگا، بغض وحسد، عداوت و نفرت اور دوسری برائیوں کی تاریکی سیماب پا ہو چلی۔

امام نکلا، مؤذن نے اذان ثانی دے کر لوگوں کی توجہ امام کی طرف پھیر دی، وہ سامنے کھڑا تلقین کر رہا ہے اور سب ہمہ تن متوجہ سن رہے ہیں، جب اس کی آواز میں تیزی پیدا ہوئی، اور آنکھیں سرخ ہو گئیں تو پھر کتنے دل کانپ اٹھے، کتنے جسموں پر لرزہ پڑ گیا، خشیتِ الٰہی اور محبّتِ مولیٰ کی ملی جلی کیفیت نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا، خطبہ ختم ہوا، نماز ادا کی گئی مگر کس شان سے؟ کہ آج جب ایک فرد (امام) اللہ اکبر کہتا ہے تو سارے شہر کے مسلمان اللہ اکبر کہتے ہیں، وہ جب رکوع میں جھکا تو سب کے سب بے چون وچرا رکوع کے لئے جُھک گئے اور جب وہ سجدہ میں گرا تو سب کے سب اکھٹے سجدے میں گر پڑے۔

....

دنیوی اور دینی اصلاح

اس شان وشکوہ سے ہفتہ کی جو عبادت ادا کی گئی، اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے ماہرین اور دینی و دُنیوی دورِ حیات کے تجربہ کار شریک تھے، رؤساء، تجار، غرباء، فقراء، علماء، صوفیاء اور وہ لوگ بھی جوق در جوق تھے جن کو علم و فضل سے کوئی مَس نہیں۔

ہر ایک نے دوسرے کو عبرت و بصیرت کی آنکھوں سے دیکھا، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا نقشہ کھنچ گیا، تاجروں اور رئیسوں کو مسلمانوں کی اقتصادی و معاشی حالت کی طرف توجہ ہوئی، علماءِ کرام کو علمی اور دینی سُدھار کی فکر ہوئی، صوفیاء کی نظر تزکیۂ قلوب کی طرف گئی، غریبوں میں محنت کی اُمنگ پیدا ہوئی، فقیروں کی خود داری میں جوش آیا، اَن پڑھ اور جاہلوں کے دلوں میں اشتیاقِ علوم نے کروٹ لی اور بے عملوں میں عمل کا جذبہ اُبھرا۔

آپ نے غور کیا، یہ کون دن تھا اور کون سی مسجد؟ جمعہ کا دن تھا اور جامع مسجد، جس کا یہ روح افزا اور حیات بخش منظر آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا،

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (الجمعۃ: ۹)

یہ قدرتی ہفتہ وار اجتماع "نظامِ مساجد" کے سِلسلہ میں

ہر ماہ چار مرتبہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی مہینہ میں پانچ مرتبہ بھی، اس اجتماع سے قوم و ملک کو ہمیشہ فائدے پہنچتے رہے ہیں جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

سالانہ تنظیم

اس نظم و ضبط کے ساتھ سال کے بارہ مہینے گذرتے ہیں مگر ان میں دو مخصوص دن ذرا اور امتیازی شان رکھتے ہیں، اور ان دنوں کا قدرتی اجتماع اور زیادہ مفید اور مہتم بالشان ہوتا ہے۔

آج فرزندانِ توحید کے قلوب وفورِ مسرّت سے لبریز معلوم ہوتے ہیں، ہر چیز میں نمایاں امتیاز پایا جاتا ہے، لباس بھی عمدہ سے عمدہ اور صاف ستھرے ہیں، کھانے پینے میں بھی خاص اہتمام ہے، جوان، بچّے اور بوڑھے سب تکبیر کہتے ہوئے ایک ہی جانب جا رہے ہیں اور شاید ایک ہی گھر کو جا رہے ہیں تھوڑی دیر میں ایک وسیع میدان کے اندر عظیم الشان اجتماع ہو گیا جس میں شائستہ شہری بھی ہیں اور سادہ دل دیہاتی بھی، کھلے میدان میں ایک عجیب دلکش منظر ہے، ایک آواز پر لاکھوں اونچی پیشانیاں خدائے واحد کی پرستاری میں خاک آلود ہو رہی ہیں، کبر و نخوت کا جنازہ نکل رہا ہے، مساوات کا پرچار ہو رہا ہے اور یہ سب ایک نظام کے ساتھ ہو رہا ہے۔

صدقۂ فطر کے نظام نے غریبوں اور محتاجوں کو بھی خوشی

کا موقع دے رکھا ہے، ایک آواز اٹھی اور وہ محلہ محلہ پہنچ گئی، شہر کے گوشہ گوشہ سے نکل کر اس کی گونج دیہاتوں میں سنی جا رہی ہے۔ یہ سالانہ قدرتی اجتماع، ہفتہ وار اجتماع سے کہیں زیادہ جاذب نظر اور نتیجہ خیز ہوتا ہے، آپ نے سمجھا یہ اجتماع کیسا ہے، یہ بھی ایک مسجد ہی کا ابرِ کرم ہے جو ہر خطۂ ارض پر برستا ہے جس کو ہم عید گاہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

عالَمِ اسلام کی یکجائی

اب اس کی ضرورت رہ گئی تھی کہ کوئی ایسی مسجد بھی ہوتی جو ساری دنیا کے خدا پرستوں کو یکجا کر دیتی، اور یہ نظامِ مساجد اس طرح عالمگیر ہونے کا دعویٰ کرتا، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نظام نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا ہے، ان دو مخصوص دِنوں میں ایک ایسا دن بھی ہر سال آتا ہے جو اس اہم کام کی انجام دہی کر دیتا ہے، یہ ذی الحجہ کا مہینہ اور سنتِ ابراہیم کی یاد تازہ کرنے کا دن ہے۔

یہ اونٹوں کا ہجوم قطار در قطار کتنا بھلا ہے۔ ریگستانی جہازوں کا حسین منظر بے انتہا دلچسپیوں کا مرقع ہے، ساربانوں کی حُدی خوانی، بدوؤں کی تانیں سبحان اللہ کس قدر ولولہ انگیز ہیں۔

دنیا کے کونے کونے سے ربِّ کعبہ کے متوالے، اس کی محبّت سے سرشار، فریادی بن کر آرہے ہیں، پیروانِ اسلام کے

یہ قافلے، مختلف خطہائے ارض سے چل کر آئے ہیں اور اس طرح داخلِ حرم ہو رہے ہیں کہ باوجود مختلف شکل وصورت کے سب کی ظاہری ہیئت ایک سی ہے۔ سب کی زبان پر ایک ہی طرح کی دُعائیں اور صدائیں ہیں، ذرا ان کی ادائیں تو دیکھئے، بال پراگندہ، جسم خاک آلود، سر کھلا، نہ بدن پر سلا ہوا کپڑا، نہ کپڑوں میں خوشبو، سب کی گردنوں میں سادہ کفنی پڑی ہوئی ہے، سب عیش و راحت سے دور، حرم محترم کا احترام کہ اس کی ایک ایک چیز عزّت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، نہ گھاس کاٹنے کی مجال، نہ پرند پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت اور نہ جوں مارنے کی ہمّت۔

اس عالمی اجتماع میں تمام ممالک کے نمائندے شریک ہیں، کالے گورے، حبشی، مصری، ہندوستانی، افریقی یورپی، ایشیائی، ان میں کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں سے مسلمان یہاں نہ آئے ہوں، مختصر یہ کہ عالمِ اسلام کے کونے کونے سے خدا پرستوں کے نمائندے آئے ہیں، سب آپس میں ملے، باہم ملاقاتیں ہوئیں، محبّت والفت بڑھی، تبادلۂ خیالات کا موقع میسر آیا، ہر ایک نے ..... دوسرے ملک والے کو غور و فکر کی نظر سے دیکھا اور سب ایک دوسرے کے غم اور خوشی سے واقف ہوئے۔

یہ بھی ایک مسجد ہی کا فیض وکرم ہے جس نے ساری دنیائے اسلام کے نمائندوں کو، ایک تاریخ، ایک دن اور

ایک شہر میں جمع کر دیا، اس مسجد کا نام مسجدِ حرام ہے جس کو بیت اللہ بھی کہتے ہیں۔ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا۔

(البقرة : ۱۲۵)

اسی مسجد کے بارے میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ارشادِ ربانی ہوا تھا:

وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ	اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو
يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ	کہ وہ تیرے پاس آئیں گے پیادہ
ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ	بھی اور ہر دبلی اونٹنیوں پر بھی
فَجٍّ عَمِيْقٍ۔	جو دور دراز راستوں سے پہنچی
(الحج : ۲۷)	ہوں گی۔

مساجد کی اجتماعی حیثیت

اس اجتماعی نظام سے بڑھ کر کوئی اور نظام ممکن بھی ہے؟ دنیا کا کوئی پولیٹکل نظام اس قدرتی نظامِ مساجد کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا، جو بکھرے ہوئے انسانوں کو بتدریج جمع کر دیتا ہے اور منتشر افراد کی بات بات میں شیرازہ بندی کا کام انجام دیتا رہتا ہے، اس نظام میں کاہلی پر ہر دن ضرب کاری لگتی رہتی ہے اور ہر پہلو سے یہ عالمی نظام ایک کو دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔

واقعی بات یہ ہے کہ ہم نے اب تک سچائی سے اس قدرتی نظام پر غور ہی نہیں کیا، اور کبھی غور بھی کیا تو محض

سرسری طور پر، ورنہ اس نظام میں دینی و دنیوی دونوں روگ کا کامل علاج ہے اور کہیں سے کوئی خامی نہیں چھوڑی گئی ہے، اس نظام کے بروئے کار لانے سے دین بھی پیدا ہوگا اور دنیا بھی سنورے گی، اتحاد و اتفاق کی ناقابل تسخیر قوت بھی پیدا ہوگی اور ارتقاء و عروج کا جذبہ بھی ابھرے گا، مرکزیت اور اجتماعیت بھی مستحکم ہوگی اور سیاسی قوت بھی راسخ ہوگی اور جس کی وجہ سے ہمارے سارے کام بگڑتے ہیں وہ بات بھی ختم ہو جائے گی، یعنی ایک بالادست طاقت کے اشارے پر زندگی گذارنے کا ڈھنگ پیدا ہو جائے گا۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آئین اسلام کی کامل اتباع کے ساتھ اس نظام میں نظمِ جماعت، ہمدردی، پاکیزگی، جسم کی صفائی، حسنِ ہیئت، وقت کی پابندی، آپس کی بہی خواہی اخلاص و تضرع اور دوسرے شعبہائے زندگی کے سارے لوازمات آجاتے ہیں۔

نظامِ مساجد کی برتری

قدرت کا یہ اجتماعی نظام جن لوازماتِ زندگی کو پورا کرتا ہے اور جن خامیوں کو دور کرتا ہے، وہ انجمن، پارٹی، کانفرنس اور جماعت سے پورا نہیں ہو سکتا ہے، انسان جو بھی اصول و قوانین مرتب کرے وہ ہر طبقۂ انسانی کے لئے مفید ہو ہی نہیں سکتے۔

اس اجتماع کے استحکام پر بار بار غور کیجئے، اوّل قرآنِ پاک نے بتایا کہ تخلیقِ انسانی کا مقصد عبادتِ الٰہی[1] ہے، پھر اسلام نے اس امر کو منقح کیا کہ اس نظام سے جو عبادت متعلق ہے وہ سب سے اہم اور عوام و خواص دونوں سے تعلق رکھنے والی ہے، مزید برآں یہ کہ اس نظام سے نسل و نسب کے بُت پاش پاش ہو جاتے ہیں، من و تو کی تفریق ختم ہو جاتی ہے، اور امیر و غریب کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔

دوسری طرف خوبی یہ ہے کہ ایک امام کی پیروی اس نظام کی روح ہے، لشکر اور فوج کو کمانڈر اور امیر کی اطاعت کی تعلیم دی جاتی ہے، ایک بِگل پر اکٹھا ہونے کی مشق کرائی جاتی ہے، اس شعبہ پر لاکھوں کروڑوں روپے پانی کی طرح بہائے جاتے ہیں مگر پھر بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ پورا نظم و ضبط باقی رہ سکے گا، لیکن نظامِ مساجد میں امام کی پیروی کا یہ حال ہے کہ اس سے اس کو کوئی مفر نہیں، دس سال کی عمر سے لے کر موت تک اس کی مشق ہوتی ہے اور کمال یہ ہے کہ کسی دن ناغہ کا نام ہی نہیں الا ماشاء اللہ، اجتماع کی شرکت کی دعوت دی جاتی ہے تو ایسے کلمات سے جو جاہ و جلال سے بھرپور ہوتے ہیں جن میں عقیدہ کی تازگی، خالق کی بڑائی اور فلاح اور کامیابی کی یقین دہانی ہوتی ہے۔

---

(۱) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (الذاریات: ۵۶)

اجتماعی نظام کا عملی تعطّل

ہاں افسوس اس کا ہے کہ ہم نے اس نظام پر عمل ترک کر دیا ہے، جو اس سے فائدے تھے اس سے ہم محروم ہیں، عہدِ رسالت اور عہد صحابہ کی تاریخ دیکھئے، اس نظام کو کس قدر قبولیت حاصل تھی اور وہ کتنے بامراد اور کامیاب تھے، خلافتِ راشدہ تک آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ بہت ساری باتیں انہی مساجد کے ذریعہ طے پاتی تھیں، خلیفہ کی پالیسی کا اعلان ان کے منبروں سے ہوتا تھا، گورنروں کے فرائض میں امامت بھی داخل تھی، یہ منصبی فرض گورنروں کا عہدِ عباسیہ تک ملتا ہے، جمعہ اور عیدین کی امامت بھی یہی کرتے تھے، خلفاء راشدین نے برابر امامت کی اور فاروقِ اعظمؓ نے تو اسی منصب کی ادائی میں جامِ شہادت نوش فرمایا، اپنے تو اپنے اغیار نے ہمارے خلفاءِ راشدین کے اس منصب کو سراہا ہے اور نظاموں پر اسلام کے اس نظام کو ترجیح دی ہے۔

کیا یہ واقعہ نہیں کہ مسجد کے منبر کو دستوری حکومت کے تخت کی حیثیت حاصل تھی جہاں سے جمہوری حکومت کی پالیسی کا اعلان ہوتا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل آئندہ اوراق میں ملاحظہ کرینگے۔

○

قدرتی نظامِ اجتماع

اَب ذرا تفصیلی طور پر اس قدرتی حسنِ انتظام کی حکمتوں میں غور و فکر کرنا ہے کہ حضرت حق جلّ مجدہ نے نظامِ مساجد میں مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی دینی و دنیوی فلاح و نجاح کو کس عمدگی کے ساتھ جمع فرما دیا ہے۔

اجتماع کے مرکزی گھر

اس میں تو شبہ نہیں کہ مسجدوں کا قدرتی نظام ہی اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ انتشار و تشتّت اور نفاق و شقاق کا قلع قمع کر دیا جائے اور بکھرے موتیوں کو ایک سِلک گُہر میں پرو کر اللہ تعالیٰ کے مقدس دربار میں ایک صف اور ایک جماعت کے اندر بغل گیر کر دیا جائے اور پوری نیازمندانہ شان سے کھڑا کر کے دن رات کے پانچ وقتوں میں ان کی زبان سے یہ دعا بار بار دہرائی جائے:

"اے وہ ذات، کہ سب تعریفیں تجھ ہی کو زیبا ہیں، ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان برگزیدہ بندوں کا راستہ جن پر تو نے انعام و اکرام فرمائے، ان ملعون انسانوں کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہے اور نہ ان کا راستہ جو راہِ راست سے بھٹک کر گمراہ ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ نماز کا درجہ توحید کے بعد ہی رکھا گیا ہے،

اور اسلام کی بنیادی چیزوں میں اس کو خاص اہمیت دی گئی ہے پھر توحید کی جھلک جماعت کی نمازیں قائم رکھ کر مسجدوں کا نظام قائم کیا اور ان کے ذریعہ عبادت کی روح اور اطاعت کی جان کو اجاگر کیا۔

مسجدوں کے مرکزی گھر ہونے کا ثبوت قرآن سے

قرآن پاک اور احادیث نبوی کے الفاظ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ نمازوں کی ادائی باجماعت مسجدوں ہی میں مطلوب ہے اور شریعتِ مطہرہ میں ان مسجدوں کو مرکزی گھر ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔

مندرجہ ذیل آیتوں اور حدیثوں میں غور فرمائیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ (الاعراف:۲۹)	اور سیدھا کرو اپنے چہروں کو ہر مسجد کے پاس اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طور پر کرو کہ عبادت اسی کے لئے خالص رہے۔

اس آیت کے تحت "صاحبِ تفسیراتِ احمدی" تحریر فرماتے ہیں:-

فَفِی الْاٰیَةِ دلیل علیٰ فرضیة القیام فی الصلوٰة و ادائها فی المسجد و عدم	اس آیت سے نماز میں قیام کی فرضیت ثابت ہوتی ہے اور یہ کہ وہ مسجد میں ادا کی جائے، ہاں

اختصاص بمسجد ھا۔	وہ کسی خاص مسجد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

ابو بکر جصاصؒ لکھتے ہیں:

والثانی فعل الصّلوۃ فی المسجد وذٰلك يدل علیٰ وجوب فعل المكتوبات جماعة لان المساجد بنيت للجماعات (۱)	دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ نماز مسجد میں پڑھی جائے، جس سے پتہ چلا کہ فرض نماز با جماعت واجب ہے، کیوں کہ مسجدیں قیامِ جماعت کے لئے بنائی گئی ہیں۔

ان سے نمایاں طور پر ثابت ہوا کہ فرض نماز با جماعت مسجد میں ہونی چاہیئے، کیوں کہ تعمیرِ مساجد کا مقصد یہی ہے۔ دوسری آیت لب و لہجہ کو سامنے رکھتے ہوئے ملاحظہ ہو:

فِی بُیُوتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیھَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ۔ (النّور: ۳۶-۳۷)	ان گھروں میں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے، ان (مسجدوں) میں صبح و شام ایسے لوگ (نمازوں میں) اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں، جن کو اللہ کی یاد سے اور (بالخصوص) نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے سے نہ خرید غفلت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت۔
.. ..	

(۱) احکام القرآن ۳/۳۸۔

اس آیت کا طرزِ بیان بھی بتلاتا ہے کہ مسجدوں کا یہ واجبی حق ہے کہ اللہ کی دوسری عبادت اور نماز انہی میں ادا کی جائے کیوں کہ بیوت سے مراد مسجد ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ جو نہی فرض نماز کے لئے اذان پکاری گئی، بازار والوں کی ایک جماعت سب چھوڑ چھاڑ مسجد چل کھڑی ہوئی، یہ منظر دیکھ کر آپ نے بے ساختہ فرمایا، انہی لوگوں کے متعلق کتاب مقدس کا اعلان ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ الخ (۱)

احادیث سے ثبوت

اس باب میں حدیثیں بکثرت آئی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازیں مسجدوں ہی میں ادا کی جائیں، مسلم شریف کی ایک لمبی حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں جس کے راوی عبداللہ ابن مسعودؓ ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
علیہ وسلم علمنا سنن	ہمیں سنن ہدیٰ کی تعلیم فرمائی،
الھدیٰ وان من سنن	اور سننِ ہدیٰ میں سے یہ ہے کہ نماز
الھدی الصلوٰۃ فی المسجد	اس مسجد میں ادا کی جائے جس میں
الذی یؤذن فیہ وان	اذان .... ہوتی ہو، اگر تم نے
کنتم صلیتم فی بیوتکم کما	اپنے گھروں میں نماز پڑھی جیساکہ

(۱) تفسیر ابن کثیر ۲۹۵/۳.

یصلی ھذا المتخلف فی بیتہ لترکتم سنۃ نبیکم ولو ترکتم سنۃ نبیکم لضللتم۔	یہ منافق اپنے گھر میں نماز پڑھتے ہیں، تو بلاشبہ تم نے اپنے نبی کی سنت ترک کر دی اور جس وقت تم نے اپنے نبی کی سنت ترک کر دی یقین کرلو گمراہ ہو چلے ہو۔
(ج ۱، ص: ۲۳۲)	

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

صلوٰۃ الرجل فی الجماعۃ تضعف علیٰ صلوٰتہ فی بیتہ وسوقہ خمساً وعشرین ضعفاً وذٰلک انہ اذا توضأ فاحسن الوضوء ثم خرج الی المسجد۔ (۱)	مرد کی جماعت کی نماز اس کی اس نماز سے جو اپنے گھر یا بازار میں پڑھے پچیس گنا زیادہ ہے اور یہ اس لئے کہ جب اچھا وضو کیا اور پھر مسجد کو چلا۔

ثم خرج الی المسجد کا جملہ واضح دلیل ہے کہ جماعت کی نماز مسجد ہی میں مطلوب ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

مقتضاہ ان الصلوٰۃ فی المسجد جماعۃ تزید علی الصلوٰۃ فی البیت والسوق جماعۃ وفرادیٰ۔ (۲)	اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جماعت کی نماز جو مسجد میں پڑھی جائے، وہ ثواب میں اس نماز سے بڑھی ہوئی ہے جو گھر اور بازار میں پڑھی جائے خواہ باجماعت ہو، خواہ تنہا تنہا۔

(۱) بخاری باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ۔ (۲) فتح الباری ۲/ ۹۲۔

پھر مزید بحث کے بعد خلاصہ تحریر فرماتے ہیں:۔

بل الظاھر ان التضعیف المذکور مختص بالجماعۃ فی المسجد۔ (۱)	بلکہ ظاہر بات یہ ہے کہ چند در چند ثواب کی زیادتی جو مذکور ہوئی وہ مسجد کی باجماعت نماز کے ساتھ مختص ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ علیہ باجماعت نماز کے سِلسلہ میں لکھتے ہیں:

وکان الاسود اذا فاتتہ الجماعۃ ذھب الیٰ مسجد اٰخر وجاء انس الیٰ مسجد قد صلی فیہ فاذن واقام وصلی جماعۃ۔ (۲)	حضرت اسودؓ کی جب جماعت چھوٹ جاتی تھی تو جماعت کے لئے دوسری مسجد میں تشریف لے جاتے اور حضرت انسؓ ایک مسجد میں آئے جہاں جماعت ہو چکی تھی تو آپ نے پھر اذان پکاری اقامت کہی اور باجماعت نماز ادا کی۔

ان تعلیقات سے بھی معلوم ہوا کہ جماعت کی نماز کو مسجد کے ساتھ خصوصیت حاصِل ہے تب تو حضرت اسود رضی اللہ عنہ جماعت نہ ملنے کی صورت میں دوسری مسجد کا قصد فرماتے اور وہاں جماعت سے نماز ادا کرنے کی سعی کرتے، گھر وغیرہ میں جماعتِ ثانیہ کا خیال تک نہ کرتے، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس کے تحت رقمطراز ہیں:

---

(۱) فتح الباری ۹۳/۲۔

(۲) بخاری

والذی یظھر لی ان البخاری قصد الاشارۃ باثر الاسودؓ وانسؓ الیٰ ان الفضل الوارد فی احادیث الباب مقصود علی من جمع فی المسجد دون من جمع فی بیتہ لان الجمع لولم یکن مختصا بالمسجد لجمع الاسود فی مکانہ ولم ینتقل الیٰ مسجد اٰخر لطلب الجماعۃ ولما جاء انس الیٰ مسجد ابن رفاعۃ۔

مجھ پر جو کچھ ظاہر ہوا وہ یہ ہے کہ بخاریؒ نے حضرت اسودؓ اور انسؓ کے اثر کو بیان کرکے اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہا ہے کہ جو فضیلت اور ثواب کی زیادتی اس باب کی حدیثوں میں مذکور ہے وہ اس باجماعت نماز کے لئے متعین ہے جو مسجد میں پڑھی جائے گھر کی جماعت کے لئے نہیں، اگر جماعت کی نماز مسجد کے ساتھ مخصوص نہ ہوتی تو یقیناً حضرت اسودؓ اپنے مکان میں جماعت کرتے اور طلب جماعت کے لئے دوسری مسجد نہ جاتے اور نہ حضرت انسؓ ہی ابن رفاعہ کی مسجد میں تشریف لاتے۔

ان تصریحات کے بعد یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ جماعت کی نماز مسجد ہی میں مطلوب ہے اور مسجد کو اس باب میں خصوصیت حاصل ہے، گھر میں باجماعت نماز مسجد چھوڑ کر پڑھی نہیں جا سکتی یہی حافظ ابن حجرؒ ایک دوسری حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

والمقصود الاصلی فی الجماعۃ ایقاعھا فی المسجد۔
(فتح الباری)

جماعت کا مقصدِ اصلی یہ ہے کہ وہ مسجد میں قائم کی جائے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

در بدائع گفتہ کہ واجب است برحر، عاقل بالغ کہ معذور نیست حاضر شدن بمسجد برائے جماعت. (۱)	بدائع میں ہے کہ آزاد، عاقل، بالغ جو معذور نہیں ہے اس پر جماعت کی نماز کے لئے مسجد میں حاضر ہونا واجب ہے۔

حافظ ابن قیمؒ تو تصریح فرماتے ہیں کہ عذرِ شرعی کے نہ ہونے کی شکل میں جماعت کی نماز کے لئے مسجد کی حاضری فرضِ عین ہے البتہ جب کوئی عذرِ شرعی در پیش آجائے تو مسجد کی حاضری لازمی نہیں رہتی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

ومن تامل السنة حق التأمل تبين له ان فعلها فى المساجد فرض على الاعيان الا لعارض يجوز معه ترك الجمعة والجماعة فترك حضور المسجد لغير عذر كترك اصل الجماعة لغير عذر۔ (۲)	جن لوگوں نے سنت میں پورے طور پر غور و فکر کیا ہوگا ان پر یہ بات منکشف ہو گئی ہو گی کہ نماز باجماعت کی ادائی مسجد میں فرضِ عین ہے البتہ اگر کوئی ایسا عارض در پیش آجائے کہ جمعہ اور جماعت کا ترک جائز ہو جائے تو دوسری بات ہے ورنہ بغیر عذر شرعی مسجد کی حاضری کا ترک ایسا ہی ہے کہ کوئی بغیر عذرِ شرعی اصل جماعت چھوڑ دے

---

(۱) اشعۃ اللمعات ۱/۴۶۲۔

(۲) کتاب الصلوٰۃ، ص ۱۰۶۔

ان کی یہ رائے متعدد حدیثوں کے اسلوبِ بیان کے پیشِ نظر ہے اگر ان کے حنبلی ہونے کی وجہ سے فرض عین ہونے کو نہ بھی مانتے تو اس کے وجوب اور اہم ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ وہ چیز ہے جس کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی بھر نبا ہا اور مسجد حاضر نہ ہونے والوں پر شدید ترین غصہ کا اظہار فرمایا۔ آپؐ کے صحابہ کرامؓ کا عمل بھی یہی رہا جس کی تفصیل ابھی آرہی ہے۔

افضل الرسل کا دستور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حافظ ابن قیمؒ جیسے ذمہ دار کا بیان ہے:

ان ھدیہ کان فعل الفرائض فی المسجد الا لعارض من سفر او مرض او غیرہ مما یمنعہ من المسجد۔ (۱)	رحمتِ عالم صلعم کا دستور یہ تھا کہ آپ فرض نمازیں مسجد میں ادا کرتے مگر یہ کہ کوئی مجبوری پیش آجاتی، جو مسجد سے روک دیتی جیسے سفر اور بیماری وغیرہ (جس میں بالکل طاقت نہیں رہتی)

قیامت کے دن "دیدارِ الٰہی" جو سب سے بڑی نعمت ہے اس کے لئے جب اجتماع ہوگا تو ان میں ان لوگوں کو جو بہ پابندی مسجد جا کر امام کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، ممتاز جگہ حاصل ہوگی (۲)

---

(۱) زاد المعاد ۱/۸۱۔ (۲) زاد المعاد ۱/۱۳۔

ایک صحابی کا وعظ

جیسا کہ عرض کیا گیا صحابۂ کرام کا جوشِ عمل جماعت کے باب میں جو تھا وہ اپنی جگہ تفصیل سے انشاء اللہ آئے گا مگر یہاں صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے جس سے عہدِ نبوی میں حاضریِ مسجد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کو کس قدر اہمیّت حاصل تھی، حضرت عتاب بن اسیدؓ مکہ کے گورنر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر جب مکّہ پہنچی تو یہ پہلے مارے خوف کے چھپ گئے، اس وقت حضرت سہیل بن عمروؓ نے خطبہ دیا، ان کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ اہلِ مکّہ اسلام پر علیٰ حالہٖ قائم ہیں تو حضرت عتابؓ کو نکالا اور انہوں نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

یا اھل مکۃ واللہ لا یبلغنی ان احداً منکم تخلف عن الصلوٰۃ فی المسجد فی الجماعۃ الاضربت عنقہ۔ (۱)	اے اہلِ مکّہ! خدا کی قسم اگر مجھے یہ خبر پہنچی کہ تم میں کا کوئی قصداً جماعت کی نماز کے لئے مسجد میں نہیں آیا تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔

یہ سن کر اہلِ مکّہ ان کے بہت ممنون ہوئے اور ان کی اس تقریر کو بہت سراہا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی دوربین نگاہ میں مسجد کی حاضری کو کتنی اہمیّت حاصل ہے۔

---

(۱) کتاب الصّلوٰۃ ابن القیم۔

نماز مسجد میں ادا کرنا شعارِ دین ہے

اس سلسلہ میں اب زیادہ طول دینا مناسب نہ ہوگا مگر یہ ذکر فائدے سے خالی نہیں کہ علماء نے انہی وجوہ کی بناء پر مسجد کے اندر جماعت کی نماز کو شعارِ دین قرار دیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ کے الفاظ ہیں:

فان الصلوٰة فی المسجد من اکبر شعائر الدین وعلاماته[1]	بلاشبہ مسجد میں جمع ہوکر نماز ادا کرنا دین کا ایک بڑا شعار اور اس کی علامت ہے۔

نظمِ جماعت اور اس کی اہمیّت

مسجد کے اندر نماز با جماعت کی جو حیثیت ہے اور مسجد کو نماز سے جو گہرا تعلق ہے اس کے ثابت ہو جانے کے بعد بتلانا ہے کہ جماعت کی نماز کو شریعت میں کیا خصوصیّت و مرکزیّت حاصل ہے اور اس کی تاکید قرآن و حدیث میں کس اہمیّت کے ساتھ آئی ہے۔

قرآن میں حکم

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۱) وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ۔ (البقرۃ: ۴۳)	اور نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ۔

---

(۱) کتاب الصلوٰۃ، ص: ۱۰۵۔

اس آیت سے مفسّرین نے جماعت کی نماز ثابت کی ہے، بیضاوی شریف میں ہے:

وارکعوا مع الراکعین ای	اور نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے
فی جماعتهم فان صلاة	ساتھ یعنی ان کی جماعت کے ساتھ
الجماعة تفضل صلوٰة	کیوں کہ جماعت کی نماز منفرد کی نماز
الفذ بسبع وعشرین درجة	پر ستائیس درجہ فضیلت رکھتی ہے
لمافیها من تظاهر النفوس (۱)	اس لیے کہ اس میں باہمی تعاون ہے

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

وثانیها ان المراد صلوا	دوسرا مطلب یہ ہے کہ نماز، نماز
مع المصلین وعلیٰ هٰذا	پڑھنے والوں کے ساتھ پڑھو، اس
یزول التکرار لان فی الاول	مطلب کے لینے میں تکرار بھی ختم
امر تعالیٰ باقامتها و	ہو جائے گی، گویا پہلی آیت میں
امر فی الثانی بفعلها	اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا اور دوسری
فی الجماعة۔	آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز باجماعت
(۲)	کا حکم فرمایا۔

علامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں کہ رکوع سے مراد یہاں نماز کا لینا جائز ہے، جس طرح سجود کا استعمال نماز کے لئے ہوتا ہے اور معنی یہ ہوں گے کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھا کرو، پھر ماحصل لکھتے ہیں:۔

---

(۱) ج ۱ ص ۷۱۔
(۲) تفسیر کبیر ۱/۲۲۵۔

كانه قيل واقيموا الصلوٰة وصلوها مع المصلين لا منفردين۔ (۱)	گویا یہ حکم دیا گیا کہ نماز قائم کرو اور اسے باجماعت ادا کرو، اکیلے اکیلے نہ پڑھو۔

اس آیت سے جماعت ہی کی نماز اس لئے مُراد ہے کہ اس سے پہلے بالکل متصل "اقیموا الصّلوٰۃ" کی آیت آچکی ہے جس میں اقامتِ نماز کا حکم ہے، جس کی طرف امام رازیؒ نے اشارہ بھی کیا ہے۔ اگر رکوع کے کئی معنی نہ ہوتے تو جماعت کی فرضیّت کا ثبوت ہوتا، مگر چوں کہ متعدد معنی ہیں اس لئے وجوب یا کم از کم سنتِ مؤکدہ کا ثبوت تو بہرحال ہوگا، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"خلاصہ یہ ہے کہ پنج وقتہ جماعت ہر ہر فرد پر سنتِ مؤکدہ ہے جو بغیر عذر شرعی جیسے بیماری، سفر، بارش، آندھی اور طوفان کے ترک نہیں کی جاسکتی ہے اور تمام مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے، اگر کل کے کل جماعت کے ترک پر اصرار کریں گے تو سب گنہگار ہوں گے کیوں کہ یہ سنت شعار دین ہے۔" (۲)

(۲) وَاِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ۔	اور آپؐ جب ان میں تشریف رکھتے ہوں، پھر آپؐ ان کو نماز پڑھانا چاہیں تو چاہیئے کہ ایک گروہ ان میں سے آپؐ کے ساتھ کھڑا ہو جائے ......

---

(۱) کشاف ۱/۵۳۔

(۲) تفسیرِ عزیزی فارسی، سورۂ بقرہ ص ۱۳۱۔

(النسآء: ۱۰۲) اور اپنے ہتھیار وہ لوگ لے لیویں۔

اس آیت کے سلسلہ میں صاحب "التعلیق الصبیح" لکھتے ہیں:

امرھم بالجماعۃ حال الخوف یدل علیٰ وجوبھا حال الامن بالاولیٰ۔ (۱)	اللہ تعالیٰ کا حالتِ خوف میں جماعت کا حکم دینا دلیل ہے کہ حالتِ امن میں جماعت بدرجۂ اولیٰ واجب ہوگی۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے:

وما احسن ما استدل بہ من ذھب الیٰ وجوب الجماعۃ من ھٰذہ الاٰیۃ الکریمۃ (۲)	اس آیت کریمہ سے جو لوگ جماعت کے وجوب کی طرف گئے ہیں ان کا استدلال بہت ہی خوب ہے۔
(۳) وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ۔ (یٰسٓ: ۱۲)	ہم لکھتے جاتے ہیں ان اعمال کو جو وہ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے قدم کے نشانوں کو بھی۔
ای اٰثار اقدامھم الی المساجد۔ (۳)	یعنی ان کے قدموں کے وہ نشان جو مسجد جانے میں ہوتے ہیں۔

علماء نے ان کے علاوہ اور آیتوں سے جماعت کا وجوب ثابت کیا ہے مگر میں نے انہی تین آیتوں پر اکتفا کیا کہ یہ مطلب کے حصول کے لئے کافی ووافی ہیں۔

---

(۱) التعلیق ۲/۳۴۔
(۲) تفسیر ابن کثیر ۱/۵۴۷۔
(۳) التعلیق الصبیح ۲/۳۴۔

احادیث میں شدید تاکید

اس باب میں احادیث بکثرت آئی ہیں جن سے جماعت کا لزوم، اس کی فضیلت اور تاکید نمایاں طور پر معلوم ہوتی ہے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال والذی نفسی بیده لقد هممت ان اٰمر بحطب یحطب ثم اٰمر بالصلوٰة فیؤذن لها ثم اٰمر رجلا فیؤم الناس ثم اخالف الی الرجال فاحرق علیهم بیوتهم و الذی نفسی بیده لو یعلم احدهم ان یجد عرقا سمینا او مرماتین حسنتین لشهد العشاء۔ (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، جی چاہتا ہے کہ لکڑیوں کے ڈھیر کرنے کا حکم دوں پھر نماز کیلئے اذان پکار دی جائے اس کے بعد کسی کو لوگوں کا امام بنا دوں پھر لوگوں کو چل کر دیکھوں اور جو اس وقت گھروں میں رل جائیں ان کو جلا ڈالوں، خدا کی قسم ان کا حال یہ ہے کہ اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ موٹی ہڈی یا دو کھریں مل جائیں گے تو وہ پھر ضرور عشاء میں بھی حاضر ہوں گے۔

⁂ ⁂ ⁂

اس حدیث میں "الرجال" سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو

---

(۱) بخاری باب وجوب صلوٰۃ الجماعۃ۔

بے نمازی ہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو مسجد چھوڑ کر بغیر عذر شرعی اپنے گھروں میں نماز پڑھتے ہیں جیسا کہ ابو داؤد کی مندرجہ ذیل حدیث میں وضاحت ہے۔

لقد هممت ان آمر فتيتي	بلاشبہ جی چاہتا ہے کہ جوانوں کو حکم
فيجمعوا اليّ حزما من	دوں کہ وہ میرے پاس لکڑیاں
الحطب ثم اتي قوما يصلون	ڈھیر لگا دیں پھر میں ان میں جاؤں
في بيوتهم ليست بهم	جو اپنے گھروں میں بلا عذر نماز
علة فاحرقها عليهم۔	پڑھتے ہیں اور ان کو گھر سمیت
(۱)	پھونک ڈالوں۔

ان حدیثوں کے ضمن میں امام احمد بن حنبلؒ لکھتے ہیں:

فلولا ان تخلفهم عن الصلوٰة	اگر مسجد میں جماعت کی نماز سے
في المسجد معصية كبيرة	غیر حاضری گناہِ کبیرہ نہ ہوتی تو آنحضرت
عظيمة لما هدد هم النبي	صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھروں کو
صلى الله عليه وسلم بحرق	جلانے کی تہدید (دھمکی) نہ فرماتے۔
منازلهم۔ (۲)	

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

پہلی حدیث میں "لشهد العشاء" کا جملہ بتا رہا ہے کہ یہ تاکید اور ساتھ ہی تہدید وقتی نمازوں کے لئے بھی ہے، صرف یہ جمعہ کی نماز کی تاکید کے لئے نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے۔ مسلم شریف میں ایک لمبی حدیث ہے جس سے مسئلہ کی اہمیت

---

(۱) باب التشديد في ترك الجماعة۔

(۲) كتاب الصلوٰة، امام احمد ص: ۲۱۔

خوب ذہن نشیں ہو جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:-

لقد رأيتنا ما يتخلف عن	بلاشبہ ہمیں معلوم ہے کہ بجز کھلے
الصلوٰة الا المنافق قد علم	ہوئے منافق یا بالکل نڈھال بیمار
نفاقه او مريض ان كان	کے اور کوئی جماعت کی نماز سے نہیں
المريض يمشى بين رجلين	بچھڑتا ہے بلکہ جو بیمار بھی ہیں وہ بھی
حتى يأتى الصلوٰة وقال ان	دو شخصوں کے سہارے چل کر نماز کیلئے
رسول الله صلى الله عليه	مسجد میں آتے ہیں اور انہوں نے یہ
وسلم علمنا سنن الهدىٰ	بھی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
وان من سنن الهدىٰ	"سننِ ہدیٰ" کی ہمیں تعلیم فرمائی اور
الصلوٰة فى المسجد الذى	بیشک اس مسجد میں نماز پڑھنا جس
يؤذن فيه وفى رواية	میں اذان دی جائے سننِ ہدیٰ سے
قال من سره ان يلقى	ہی ہے۔ ایک دوسری روایت میں
الله تعالىٰ غدا مسلماً	ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس کو یہ بات
فليحافظ على هؤلاء	خوش لگتی ہے کہ وہ کل (بعد موت)
الصلوات حيث ينادى	اللہ تعالیٰ سے حالت اسلام پر ملے تو
بهن فان الله شرع	اس کو چاہیئے کہ تمام نمازوں کے لئے
لنبيكم سنن الهدىٰ	جونہی اذان پکاری جائے مسجد میں
وانهن سنن من	حاضری دے، بیشک اللہ تعالیٰ نے
الهدىٰ۔ وان كنتم	اپنے نبیؐ کے لئے سننِ ہدیٰ کو مشروع
صليتم فى بيوتكم	فرمایا ہے اور انہی میں سے نمازیں ہیں

كما يصلي هٰذا المتخلف في بيته لتركتم سنة نبيكم ولو تركتم سنة نبيكم لضللتم وما من رجل يتطهر فيحسن الطهور ثم يعمد الى المسجد من هٰذه المساجد الا كتب الله له بكل خطوة يخطوها حسنة ويرفعه بها درجة ويحط عنه بها سيئة ولقد رأيتنا وما يتخلف عنها الا منافق معلوم النفاق ولقد كان الرجل يؤتى به يهادى بين الرجلين حتى يقام في الصف۔ (۱)

اور اگر دکھیں) تم نے بھی منافق کی طرح گھروں میں ہی نماز پڑھ لی تو بالیقین تم نے اپنے نبی صلعم کی سنت ترک کردی اور اگر تم نے (خدا نخواستہ) ترکِ سنت کو عادت بنا لیا تو پھر تمہاری گمراہی میں کوئی شبہ نہیں، جو بھی خوب پاک و صاف ہو کر کسی مسجد کی طرف جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کے ہر قدم کے بدلے ایک نیکی لکھتا ہے، ایک درجہ بلند کرتا ہے اور ایک گناہ مٹاتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ بغیر عذر شرعی بجز منافق اور کوئی جماعت کی نماز سے نہیں کتراتا، کیوں کہ مرد مومن جو دوسروں کے سہارے بھی آسکتا ہے تو بھی آتا ہے اور صف میں مل کر نماز پڑھتا ہے۔

ان حدیثوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جماعت کی نماز کی بہت سخت تاکیدیں آئی ہیں، اس راہ میں مشقت و

---

(۱) الصحیح لمسلم ۱/۲۳۲۔

دقت کی پرواہ نہ کرنا چاہیئے تاآنکہ بیمار وغیرہ جیسے معذورین کے لئے مسجد پہنچنا ممکن ہو تو اس کے لئے بھی مستحب ہے کہ مسجد ہی آئے۔ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی آپؐ تارکِ جماعت کو جلا کر مار ڈالتے اگر آپؐ کو عورتوں اور چھوٹے بچّوں کا خیال نہ ہوتا (۱)۔

جو لوگ اذان سنتے ہیں پھر بھی جماعت کی نماز کے لئے مسجد میں حاضری نہیں دیتے ان کے متعلق تہدیداً یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ان کی نماز ہی قبول نہیں ہوتی مگر اس وقت جب اس کو کوئی عذر درپیش نہ ہو (۲)

نظمِ جماعت میدانِ کارزار میں

یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرامؓ بجان و دل جماعت کی نماز پر فدا تھے، جان سے بڑھ کر پیاری اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے، میدانِ کارزار گرم ہے اور گردنیں کٹ کٹ کر گر رہی ہیں مگر اس وقت بھی اس دینی شیرازہ بندی کے توڑنے کی اجازت نہیں ملتی ہے بلکہ وہاں بھی سب حتی الوسع ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں اور ممکن حد تک نباہنے کی سعی کرتے ہیں۔

---

(۱) مشکوٰۃ باب الجماعۃ۔

(۲) اشعۃ اللمعات قلمی ۱/۲۴۵ عن ابی داوٗد۔

حضرت سالم بن عبداللہ اپنے باپ عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میرے باپ نے کہا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں شریک تھا، اس میں دشمنوں کی ہم سے مڈبھیڑ ہوگئی، چنانچہ ہم میدان میں نکل پڑے، نماز کا وقت آیا تو ہم دو حصوں میں بٹ گئے، ایک گروہ آپؐ کے ساتھ نماز میں شریک ہوگیا اور دوسرا دشمنوں کے مقابل ڈٹا رہا، پہلا گروہ جب آپؐ کے ساتھ ایک رکعت نماز پوری کرچکا تو یہ دشمنوں کے مقابلہ میں آگیا اور دوسرے گروہ نے آپؐ کے ساتھ آکر ایک رکعت نماز پڑھی، آپؐ نے اپنی نماز پوری کرکے سلام پھیر لیا اور اس کے بعد ہر ایک نے اپنی اپنی بقیہ ایک رکعت پوری کی (۱)۔

مشرکینِ عرب کو یقین تھا کہ ان جاں نثارانِ اسلام کو نماز اپنی اور اپنے بال بچّوں کی جان سے زیادہ پیاری ہے اس لئے وہ قصداً اوقاتِ نماز میں سخت سے سخت حملہ کرنے کی کوشش کرتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضجنان و عسفان کے درمیان نزول اجلال فرمایا یہ دیکھ کر مشرکین کہنے لگے ان لوگوں کو ایک ایسی نماز درپیش ہے جو ان کو ساری دنیا اور بال بچوں سے بھی زیادہ محبوب ہے جس کا نام عصر ہے، لہذا تم متفق ہوکر یکبارگی پوری قوت سے ان پر ٹوٹ پڑو۔ اُدھر مشرکین میں یہ مشورہ ہورہا تھا اِدھر جبریلِ امین نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ اپنے ساتھیوں کو

---

(۱) بخاری ابواب صلوٰۃ الخوف۔

دو حصوں میں بانٹ دیجئے اور ہر ایک کو ایک ایک رکعت نماز اس طرح پڑھائیے کہ دوسرا حصہ مسلح ہو کر دشمنوں کے مقابلہ میں ڈٹا رہے، اس طرح ان کی ایک ایک رکعت ہو گی اور آپ کی دو رکعتیں (۱)

میدانِ جہاد و قتال میں بھی شریعت نے جماعت ٹوٹنے نہیں دی اور اس نازک موقع پر خود اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ آپ کی رہنمائی فرمائی اور حکمتِ عملی بتا کر شکستِ جماعت سے بچا لیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ پروردگار عالم کو جماعت کی نماز محبوب ہے۔

نظمِ جماعت پر اجماعِ صحابہ

جماعت کی نماز کی اسی عظمتِ شان کے پیشِ نظر حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے تھے کہ آدم کے بیٹوں کے کان کا پگھلائے ہوئے سیسہ سے بھر جانا بہتر ہے کہ وہ اذان سنیں اور جماعت کی نماز کے لئے مسجد میں نہ آئیں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ جو لوگ مؤذن کی آواز سنتے ہیں اور عذرِ شرعی نہ ہوتے ہوئے بھی جماعت کے لئے نہیں نکلتے، ان کی نماز، نماز ہی نہیں ہے، حضرت علیؓ کا بھی یہی کہنا ہے (۲)

حضرت مجاہدؒ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک شخص نے پوچھا، اس شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو دن کو روزے رکھتا ہے اور رات کو تہجد و نوافل پڑھتا ہے مگر

---

(۱) مشکوٰۃ باب صلوٰۃ الخوف ۱/۱۲۵۔

(۲) کتاب الصلوٰۃ لابن القیم فصل سادس، ص ۹۹۔

جمعہ اور جماعت میں حاضر نہیں ہوتا، آپ نے جواب دیا "ہو فی النار" وہ دوزخی ہے، پھر دوسرے دن اس نے آکر یہی سوال کیا، راوی کا بیان ہے تقریباً ایک مہینہ برابر اس نے ایسا ہی کیا مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہمیشہ یہی فرماتے رہے کہ وہ دوزخی ہے (۱)

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں جس نے اذان سنی اور پھر بھی اس کو قبول نہیں کیا حالانکہ اس کو کوئی عذر شرعی بھی نہ تھا تو ایسے شخص کو خیر نصیب نہیں اور نہ اس کا اس میں کوئی جذبہ معلوم ہوتا ہے (۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک قول پہلے گذر چکا ہے کہ جماعت کی نماز میں وہی شخص نہیں آتا جو کھلا ہوا منافق ہے، یہ اور اس طرح کے دوسرے اقوال جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے آئے ہیں وہ درجۂ صحت و شہرت کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں، اور ان کی مخالفت میں کسی صحابی سے کوئی بات بھی نہیں آئی ہے کہ تذبذب کی گنجائش نکل سکے، پس ان تمام امور کے مدِ نظر ماننا پڑتا ہے کہ جماعت کی نماز پر صحابۂ کرام کا اجماع ہے (۳)

نظم جماعت فقہاء امّت کی نظر میں

اصولیین فقہ اپنی کتابوں میں جماعت کی نماز کو "ادائے کامل" اور منفرد کی نماز کو "ادائے قاصر" سے تعبیر فرماتے ہیں، "کامل" سے

---

(۱) کتاب الصلوٰۃ لابن القیم فصل سادس ص۹۹ ۔
(۲) ایضاً ۔
(۳) ۔ حوالۂ سابق ۔

ان کی مراد یہ ہے کہ جس طریقہ پر نماز مشروع ہوئی ہو اسی طریقہ سے ادا کی جائے اور "قاصر" وہ ہے جو طریقۂ مشروعہ کے خلاف طریقہ پر ادا کی جائے، ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت جبریل امینؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے پہل عملی تعلیم با جماعت دی تھی جیساکہ ترمذی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ واقعہ مُصرّح ہے (۱)

فقہائے امت میں محققین جماعت کی نماز کو واجب کہتے ہیں، چنانچہ ابن الہمامؒ نے بدائع سے وجوب کا قول اپنی تائید کے ساتھ نقل کیا ہے اور جن لوگوں نے اس کو لفظ "سنت" سے تعبیر کیا ہے اس کی وجہ بیان کی ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

یجب علی العقلاء البالغین الاحرار القادرین علی الجماعة من غیر حرج واذا فاتته لایجب علیه الطلب فی المساجد بلاخلاف بین اصحابنا بل ان اتی مسجداً اٰخر للجماعة یحسن وان صلی فی مسجد حیه منفرداً فحسن۔	جو عاقل، بالغ آزاد اور بغیر عذرِ شرعی جماعت کی نماز پر قادر ہو اس پر جماعت واجب ہے اور اگر سعی کے باوجود کسی کی جماعت چھوٹ جائے تو باتفاق ہمارے یہاں ایسے شخص پر واجب نہیں ہے کہ وہ مسجدوں میں جماعت تلاش کرتا پھرے، ہاں اگر ایسا کرے تو مستحسن ضرور ہے اور اگر اپنے محلہ کی مسجد ہی میں اکیلا نماز ادا کرے تو ایسی حالت میں یہ بھی درست ہے۔
(فتح القدیر ۱/۱۳۹)	

---

(۱) نورالانوار مع قمرالاقمار بحث کامل وقاصر صفحہ ۳۴۔

اس سے بھی جماعت کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے بلا شبہ اگر اپنی مسجد میں غیر ارادی طور پر جماعت نہ مل سکے تو دوسری مسجدوں میں جماعت کی تلاش واجب نہیں ہے مگر مستحسن ضرور ہے، البتہ اس کو اختیار ہے کہ اپنی ہی مسجد میں تنہا نماز پڑھ لے یا گھر میں یا پھر مسجد سے باہر کسی اور جگہ پر اپنے گھر والوں کو جمع کر کے جماعت کے ثواب کے حصول کی کوشش کرے، چنانچہ ابن الہمامؒ لکھتے ہیں:

وکذٰلك فی القدوری یجمع باهله ویصلی بهم یعنی ینال ثواب الجماعة وقال شمس الائمة الاولیٰ فی زماننا تتبعها۔[1]	اسی طرح قدوری میں ہے کہ اپنے گھر والوں کو جمع کر کے جماعت سے پڑھ لیا تو بھی جماعت کا ثواب مل جائے گا مگر شمس الائمہ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں جماعت تلاش کرنا اولیٰ ہے۔

جماعت جب واجب ہے تو پھر فقہاء اور محدثین نے اسے "سنت" کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا؟ اس کے متعلق ابن الہمامؒ لکھتے ہیں:۔

انها واجبة وتسمیتها سنة لوجوبها بالسنة۔[2]	بلا شبہ ہے تو جماعت واجب مگر "سنت" اس لئے کہا گیا ہے کہ جماعت کا وجوب سنت (حدیث) سے ہے۔

حدیث میں جماعت کے متعلق جہاں سنت کا لفظ آیا ہے اس

---

(۱) فتح القدیر ۱/۱۴۹۔

(۲) فتح القدیر ۱/۱۳۹۔

کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

مگر اینجا طریقۂ مسلوک کہ در دین مراد دارند یا آنکہ ثبوت وجوب از سنت است ۔ (۱)

"سننِ ہدیٰ" کی مراد یہاں دین کا چلا ہوا راستہ ہے یا یہ مراد ہے کہ جماعت کا وجوب سنت سے ثابت ہے۔

ابن الہمامؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی بغیر عذر شرعی بجائے مسجد گھر میں باجماعت نماز ادا کرے تو اس شخص کا ایسا کرنا بدعت ہے خواہ یہ فعل اس کا گاہے گاہے کیوں نہ ہو (۲) بشرطیکہ اس کے قصد و ارادہ کو دخل ہو۔

جماعت سے پیچھے رہ جانے والوں کی سزا

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جماعت کی نماز محققین کے یہاں کم از کم وجوب کا درجہ رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جو شخص بغیر عذرِ شرعی جماعت کی نماز کا تارک ہو اور وہ تقریباً اس کا عادی ہو چکا ہو تو شرعاً اس کی گواہی مردود قرار دیدی جائے گی اور اس کو پیٹا جائے گا پھر قید میں ڈال دیا جائے گا اور اس کے پڑوسیوں پر حق ہے کہ ایسے شخص کو سمجھائیں بجھائیں اور جماعت سے غیر حاضر ہونے پر سکوت نہ کریں ورنہ وہ شریعت کی نظر میں گنہگار ہوں گے۔

یہ سزا تو اس وقت ہے جب کوئی ایک دو شخص کریں — اگر خدانخواستہ پوری آبادی جماعت کی نماز چھوڑ دے تو ان سے قتال کیا جائے گا کیوں کہ یہ ایک بڑے شعارِ دین کو ترک کر رہے ہے

---

(۱) اشعۃ اللمعات قلمی ۱/۲۴۹۔

(۲) فتح القدیر ۱/۱۳۹۔

ہیں، صاحب "التحریر المختار" کے الفاظ یہ ہیں:

فلو ان اھل مصر ترکوھا قوتلوا واذا ترك واحد ضرب وحبس کما فی الخلاصة. (ج ۱ ص ۶۹)	اگر تمام اہلِ شہر جماعت کی نماز ترک کر دیں تو ان سے قتال کیا جائے اور جب کوئی ایک فرد تارکِ جماعت ہو تو اس کو پیٹا جائے اور قید کر دیا جائے، ایسے ہی خلاصہ میں ہے۔

نظمِ جماعت کا اہتمام عہدِ نبوی میں

فقہاءِ امّت کا تارکینِ جماعت کے متعلق یہ حکم بے وجہ نہیں. عرض کیا جا چکا ہے کہ ترکِ جماعت نفاق کی علامت سمجھی گئی ہے اذان سن کر بھی جو مسجد میں نہ آئے اس کی نماز نماز نہیں کہی جاتی تھی، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ بڑی سے بڑی مجبوری میں بھی ترکِ جماعت کی ہمّت نہ فرماتے تھے، کسی نے اپنے معقول عذر سے مجبور ہو کر پوچھا بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفی میں جواب دیا، حضرت ابوہریرہ رضؓ کا بیان ہے:

اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجل اعمٰی فقال یارسول اللہ انہ لیس لی قائد یقودنی الی المسجد فسأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یرخص	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک نابینا شخص حاضر ہوا اور اس نے آپؐ سے درخواست کی کہ مجھے کوئی راہبر نہیں ملتا جو لیجایا کرے لہذا مجھے گھر میں نماز پڑھ لینے کی

له فیصلی فی بیته فرخص له فلما ولی دعاہ فقال هل تسمع النداء بالصلوٰۃ قال نعم قال فاجب۔ (۱)

اجازت فرمادیں، آپؐ نے اس کو رخصت (اجازت) دے دی جب واپس ہوا تو پھر بلایا اور پوچھا تم اذان سنتے ہو یا نہیں؟ اس نے کہا جی ہاں سنتا تو ہوں، آپؐ نے فرمایا تو پھر قبول کرو اور مسجد آؤ۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت ابن ام کلثومؓ کا ہے کہ انہوں نے دربار رسالت میں درخواست کی کہ میں ایک نابینا آدمی ہوں، میرا گھر مسجد سے دور ہے اور مجھے مسجد تک لے جانے والا کوئی نہیں ہے مزید برآں یہ کہ شہر میں موذی جانور اور درندے عموماً پھرا کرتے ہیں، کیا ان عذروں کے ہوتے ہوئے جماعت سے غیر حاضری کی میرے لئے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے کہ حضرت کے حکم سے میں گھر میں نماز پڑھ لیا کروں، یہ سن کر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اذان سنتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا، ہاں حضرت سنتا ہوں آپؐ نے فرمایا تو پھر رخصت کیسے مل سکتی ہے، جماعت کے لئے مسجد ہی آیا کرو۔ (۲)

اس قدر مجبوریوں کا سامنا ہے پھر بھی خود سے ان کو اپنے لئے حیلہ بہانہ نہ بنایا، بلکہ خدمت رسالت میں عذر پیش کرکے اجازت چاہی اور پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عذروں کے رہتے

---

(۱) مسلم باب صلوٰۃ الجماعۃ ۱/۲۳۲۔

(۲) ابوداؤد باب التشدید فی ترک الجماعۃ ۔ ۱۲

ہوئے جو جواب دیا وہ جماعت کی اہمیّت کے اندازہ کے لئے کافی ہے۔

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ عتبان بن مالکؓ کا واقعہ حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے (۱) جس میں اس کی صراحت ہے کہ بظاہر اسی طرح کے عذر کی وجہ سے آپؐ نے ان کو رخصت دیدی تھی، اوراب بھی فقہاء اس واقعہ کے پیشِ نظر رخصت کے حق میں ہیں، اور جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت مذکور نہیں ہے اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ کا مقصد وہاں یہ تھا کہ رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل افضل اور خوب تر ہے اور دوسرے یہ کہ جماعت کی مخصوص فضیلت مسجد ہی سے وابستہ ہے اوران فیوض وبرکات سے پورے طور پر وہی متمتّع ہوسکتا ہے جو عزیمت پر عمل پیرا ہو (۲)

مگر صاحب "التحریر المختار" نے "سندی" کے حوالہ سے جو جواب نقل کیا ہے وہ نظم جماعت کے زیادہ مطابق ہے، فرماتے ہیں: عتبان بن مالکؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی کہ اپنے گھر کی ایک جگہ میں نماز پڑھیں جس کو انہوں نے مسجد بنایا تھا تو ہوسکتا ہے کہ مسجد بنانے کے بعد وہ اپنے قبیلہ کی اس میں امامت کرتے ہوں، پس ان کو تارکِ جماعت نہیں کہا جائے گا اور نہ یہ کہا جائے گا کہ انہوں نے مسجد کی حاضری ترک کردی۔

---

(۱) مسلم ۱/۲۳۳۔

(۲) فتح القدیر ۱/۱۳۹۔

بلکہ بات یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنی معذوری کی وجہ سے اَبْعد مسجد (دور والی مسجد) کو چھوڑ دیا اور قریب کی مسجد کو اختیار کیا اور اس میں کوئی کراہت نہیں ہے جس طرح محلوں میں مسجد بنا لی جاتی ہے اور جامع مسجد چھوڑ دی جاتی ہے اور یہ معلوم ہے کہ انصار کے ہر قبیلہ کے لئے مسجدیں تھیں، چنانچہ جب وہ لوگ کسی وجہ سے آپ کے ساتھ نماز میں نہ حاضر ہو پاتے تو اسی میں نماز پڑھتے تھے (۱)۔

خود رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت کا واقعہ بصیرت کا مرقع ہے۔ آپؐ بیماری کی شدت سے بالکل نڈھال ہو گئے ہیں، لاغری اور ضعف کا پورا اثر ہے اور غشی پر غشی طاری ہو رہی ہے مگر جب بھی معمولی افاقہ محسوس فرماتے ہیں تو رہ رہ کر یہی سوال کرتے ہیں کہ "جماعت ہو گئی"؟ کہا جاتا ہے۔ نہیں یارسول اللہ۔ یہ سن کر جماعت کی نماز کے لئے اٹھنا چاہتے ہیں کہ پھر غشی کا دورہ پڑ جاتا ہے، یوں ہی چار مرتبہ آپؐ نے دریافت فرمایا "أَصَلَّى النَّاس" (کیا لوگ نماز پڑھ چکے؟) اور ہر مرتبہ غشی کا حملہ ہوتا رہا تب جاکر آپؐ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اطلاع کرائی کہ آپ امامت کریں (۲)

اسی مرض الموت میں ایسا بھی ہوا کہ صدیق اکبرؓ نماز پڑھا رہے ہیں، آپؐ نے کچھ افاقہ محسوس فرمایا اور دو شخصوں کے سہارے اس طرح مسجد میں جماعت کے لئے تشریف لائے کہ دونوں بازوئے مبارک دو شخصوں کے کندھوں پر ہیں اور پائے مبارک اپنی ناطاقتی

---

(۱) التحریر المختار ۱/۷۰۔

(۲) مشکوٰۃ باب ما علی الامام عن البخاری و مسلم۔

کی وجہ سے زمین پر گھسٹتے ہوئے آرہے ہیں (۱)۔

یہ تھی اہمیت مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کی، اس ذاتِ مقدس کی نگاہ میں جو معصوم تھی اور اللہ تعالیٰ کے بعد اسی کا درجہ ہے، صرف قول ہی سے نہیں بلکہ عمل سے اپنی امت کو تعلیم فرماگئے اور بتاگئے کہ ایک گھر میں ایک مقصد کے لئے سب کا مجتمع ہو کر اللہ تعالیٰ کے آگے پیشانی رگڑنا کس قدر ضروری ہے، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

عہدِ صحابہؓ میں اہتمامِ جماعت

سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قول وفعل دونوں سے دینی شیرازہ بندی اور اجتماعی نظام کی تاکید فرمادی تو پھر آپؐ کے وہ صحابہؓ جنھوں نے آپؐ پر اپنی جانیں نثار کیں اور اسی کو اپنی زندگی کا ماحصل اور سرمایہ جانا اور جن پر آپؐ کی نگاہِ لطف وکرم بھی پڑ چکی تھی کیوں کر آپؐ کی ایک ایک ادا پر جان نہ دیتے، حق یہ ہے کہ شیفتگانِ رسولؐ نے حق ادا کر دیا، آپؐ جو راہِ حق بتاگئے زندگی کی اخیر سانس تک اس پر عمل پیرا رہنے کی سعیِ پیہم جاری رکھی اور دین کے ایک ایک مسئلہ پر عمل کرکے ثبتِ دوام حاصل کرگئے۔

مسجدوں میں جماعت کی نماز اسی اہمیت اور ہیئت کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی جو دین کا مطالبہ اور عاشقانِ رسولؐ

---

(۱) بخاری باب حد المریض ان یشہد الجماعۃ ۱۲

کا شیوہ تھا، اس وقت استقصار مقصود نہیں ہے بلکہ چند صحیح واقعات ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

حضرت ام درداءؓ کہتی ہیں ایک دن حضرت ابو درداءؓ غصّہ کی حالت میں تشریف لائے، میں نے پوچھا کیا بات پیش آئی کہ اس قدر رنجیدہ اور غضبناک ہیں، فرمانے لگے خدا کی قسم، میں امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بجز اس کے کچھ نہیں پاتا ہوں کہ با جماعت نمازیں پڑھی جائیں اور اَب دیکھتا ہوں کہ لوگ اسے بھی ترک کرنے پر اُتر آئے ہیں (۱)

فاروقِ اعظمؓ جماعت کی نماز کے عاشق تھے اور آخرکار اسی عشق میں جان دی۔ آپ کا حال یہ تھا کہ اگر کسی کو مسجد میں جماعت کے ساتھ نہیں پاتے تھے تو اس کے یہاں خود پہنچ کر وجہ دریافت فرماتے اور عذرِ معقول نہ پاتے تو اپنی خفگی کا اظہار فرماتے۔ ایک دن آپ نے کچھ لوگوں کو غیر حاضر پاکر فرمایا کیا بات ہے کہ وہ لوگ جماعت کے لئے مسجد نہیں آتے، ان کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی ایسا کرنے لگیں گے، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ یا تو وہ بہ پابندی مسجد آیا کریں ورنہ میں ان کی طرف ایسے اشخاص کو بھیجوں گا جو ان کی گردنیں ماردیں گے۔ پھر آپ نے فرمایا جماعت کی نماز کے لئے مسجد آیا کرو، یہ اخیر جملہ آپ نے تین بار فرمایا (۲)

---

(۱) مشکوٰۃ باب الجماعۃ عن البخاری۔

(۲) کتاب الصلوٰۃ ومایلزمہا للامام احمد صـ۲۱۔

انہی حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک دن صبح کی نماز میں سلیمان بن ابی حثمہؓ کو نہیں پایا (یہ جماعت میں کسی وجہ سے نہیں پہنچ پائے تھے) آپ کسی کام سے بازار تشریف لے جارہے تھے، حضرت سلیمانؓ کا گھر راستہ ہی میں پڑتا تھا، چنانچہ آپ ان کی ماں حضرت شفاءؓ کے پاس گئے اور ان کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی، ان کی ماں نے بتایا۔ بات یہ ہوئی کہ سلیمانؓ نے قیامِ لیل (تہجد) میں رات گذاری، اتفاق کی بات اخیر شب میں نیند کا غلبہ ہوگیا اور بلا قصد وارادہ سوگئے، یہ سن کر حضرت فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا، میرے نزدیک فجر کی نماز مسجد میں باجماعت پڑھنی اس ساری رات جاگ کر عبادت کرنے سے بہتر ہے کہ صبح کی جماعت چھوٹ جائے (۱)

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے بازار والوں کی ایک جماعت کو دیکھا کہ جوں ہی اذان ہوئی، سب سامان اور کاروبار چھوڑ چھاڑ مسجد چل کھڑے ہوئے، یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہے۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو تجارت وغیرہ جیسی پیاری چیز بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے نہیں روکتی) (۲)

حضرت عمر بن الخطابؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے

---

(۱) مشکوٰۃ باب الجماعۃ ۱/۹۷۔

(۲) ابن کثیر ۳/۲۹۵۔

ایک شخص کو جماعت کی نماز میں نہ دیکھا، اس کے یہاں تشریف لے گئے اور آواز دی، آپؓ کی آواز سن کر وہ شخص گھر سے نکلے، امیر المؤمنین نے دریافت کیا، نماز میں غیر حاضر کیوں رہے؟ جواب میں کہا۔ حضرت میں بیمار ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا، یا امیر المؤمنین اگر حضرت کی آواز کان میں نہ پڑتی تو گھر سے نہیں نکلتا۔ یا یہ کہا۔ کہ مسجد تک چلنے کی طاقت نہیں ہے، یہ سن کر آپ نے فرمایا تم نے اس کی پکار پر لبیک نہیں کہا جو سب سے زیادہ ضروری تھی اور میری آواز پر نکل آئے، اللہ کے بندے! اللہ تعالیٰ کی طرف جو پکارنے والا پکارتا ہے اس کی پکار پر جس قدر دھیان ضروری ہے میری پکار پر نہیں (۱)

انہی حضرت عمرؓ کا کہنا ہے کہ مسجد میں نماز کے اندر اپنے بھائیوں کی تلاش کرو کہ وہ سب جماعت میں شریک ہیں یا نہیں اگر کسی کو نہ دیکھو تو دریافت کرو، خدانخواستہ اگر بیماری کی وجہ سے نہ آئے ہوں تو ان کی عیادت کو جاؤ اور اگر وہ اپنی صحت و تندرستی کے باوجود نہیں آئے ہیں تو عتاب کرو (۲)

امام غزالیؒ جماعت کی فضیلت کے تحت لکھتے ہیں، جماعت کی نماز میں تساہل مناسب نہیں، پہلے لوگ نماز با جماعت کا بڑا اہتمام کرتے تھے، چنانچہ اگر ان کی تکبیر اولیٰ فوت ہو جاتی تو تین دن تک ایک دوسرے کی تعزیت کرتے اور اگر جماعت فوت ہو جاتی تو سات دنوں تک

---

(۱) کتاب الصلوٰۃ و مایلزمہا للامام احمدؒ ص۲۱۔

(۲) احیاء العلوم ۱/۱۳۹۔

حضرت سعید بن المسیب ؒ فرماتے ہیں، دس برس سے مؤذن نے کوئی اذان نہیں دی۔ مگر میں مسجد میں موجود رہا ہوں، کہنے کا مطلب یہ تھا کہ دس برس سے میری جماعت کی نماز میں کوئی فرق نہ آیا (۱)

مطر الورّاق ؒ کہتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے شوق جماعت کا یہ حال تھا کہ وہ خرید و فروخت میں مشغول ہوتے، ترازو ہاتھ میں ہوتی مگر جونہی اذان کی آواز کان میں پڑتی نماز کو دوڑ پڑتے (۲)

عمرو بن دینار الاعور ؒ کہتے ہیں کہ میں سالم ؒ بن عبداللہ کے ساتھ مسجد جا رہا تھا، مدینہ منورہ کے بازار میں پہنچا تو دیکھا وہ سب (تاجر) مسجد جا چکے ہیں، سبھوں کے سامان چھپے ہوئے ہیں، کوئی نگراں کی حیثیت سے بھی باقی نہیں ہے، یہ منظر دیکھ کر حضرت سالم ؒ کی زبان پر یہ آیت تھی "رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ" اور فرما رہے تھے، یہی لوگ اس آیت کے مصداق ہیں (۳)

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کے متعلق بیان ہے کہ آپ بازار میں تھے، اتنے میں نماز کے لئے اقامت کہی گئی، بس دیکھا، سبھوں نے دوکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے۔ یہ منظر دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ انہی لوگوں کے باب میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ الخ (۴)

---

(۱) احیاء العلوم ۱/۱۰۹۔

(۲) تفسیر ابن کثیر ۳/۲۹۵۔

(۳) حوالہ سابق۔

(۴) ایضاً۔

سلفِ صالحین کا جماعت سے عشق

ایک دفعہ میمون بن مہرانؒ مسجد پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ جماعت ہو چکی، یہ سن کر آپ نے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" پڑھا، پھر فرمایا جماعت کی نماز مجھ کو عراق کی گورنری سے زیادہ محبوب ہے (۱)۔

سلفِ صالحین جماعت کے جس قدر دلدادہ تھے، اس کی مثال اس دور میں ملنی مشکل ہے اگر کبھی ان کی تکبیر اولیٰ بھی فوت ہو جاتی تھی تو تین تین دن تک اس کا سوگ کرتے اور اگر اتفاق سے جماعت چھوٹ جاتی تب تو سات دن تک غم والم میں مبتلا رہتے۔(۲)

موجودہ دور میں علماء کا اہتمامِ جماعت

یہ چند واقعات آپ کے سامنے ہیں، ان کے پیشِ نظر بار بار غور کریں اور جماعت کی نماز کی اہمیت کا اندازہ لگائیں، جی چاہتا تھا کہ ہر دور کی چند مثالیں پیش کر دی جائیں مگر تطویل کے خوف سے نظر انداز کرنا پڑ رہا ہے، صرف موجودہ دور کے چند باخدا بزرگوں کے صحیح واقعات عبرت و بصیرت کے لئے لکھے جاتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب حج کے سلسلہ میں مکّہ معظمہ اور پھر کسی وجہ سے طائف تشریف لے گئے تو وہ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، کافی شورش پھیلی ہوئی تھی،

---

(۱) احیاء العلوم ۱/۱۰۹۔

(۲) ایضاً ص۱۱۱۔

ہر آن گولیاں چلتی رہتی تھیں، ورنہ خطرہ تو بہر حال تھا، اس وقت بھی حضرت پنج وقتہ نماز با جماعت ادا کرتے تھے اور جس طرح بن پڑتا مسجد پہنچنے کی کوشش کرتے۔ یہاں سے جب برطانیہ کے اشارہ پر شریف مکہ نے گرفتار کر لیا اور برطانیہ کی نگرانی میں مالٹا روانہ کیے گئے تو تمام راستہ حتی الوسع سنگین..... پہروں میں بھی با جماعت نماز ادا کرنے کی سعی جاری رکھی، گورے چمڑے والے فوجی چاروں طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہوتے اور حضرت اپنے معتقدین کے ساتھ با جماعت نماز میں مشغول ہوتے۔ مالٹا پہنچے وہاں سردی اپنے شباب پر تھی، خیمہ سے سر نکالنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی حضرت اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ایک خیمہ میں جمع ہو کر با جماعت نماز ادا کرتے (۱)۔

مولانا عبدالباری صاحبؒ فرنگی محلی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جماعت کی نماز کے اس قدر عاشق تھے کہ سفر میں بھی ان کو منفرد بن کر نماز پڑھنا گوارا نہ تھا (۲)، چنانچہ وہ (غالباً اپنے خرچ سے) دو آدمیوں کو اسی غرض سے ساتھ لے کر چلتے تھے اور وقت پر ان کے ساتھ مل کر جماعت سے نماز ادا فرماتے۔

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کا انتقال ابھی حال ہی میں ہوا ہے[۳]، جماعت کی نماز پر کیسے بجان و دل فدا

---

(۱) سفرنامہ اسیر مالٹا ص ۱۳، ۴۰، ۸۹۔

(۲) روایت مولانا مناظر احسن گیلانی۔

(۳) واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۵۰ء کی ہے۔ (ناشر)

تھے، اس کا تھوڑا بہت اندازہ ان اقتباسات سے لگائیے جو مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے "مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت" نامی کتاب میں مرض الموت کے واقعات کے سلسلہ میں لکھا ہے فرماتے ہیں:

"مارچ ۴۴ء میں ضعف بہت بڑھ گیا تھا، نماز بھی پڑھانے سے معذور تھے، لیکن جماعت میں دو آدمیوں کے سہارے تشریف لاتے تھے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔" (ص۱۴۹)

"اخیر میں جب حالت نازک ہو گئی تو اس وقت بھی مولانا موصوف نے جماعت ترک نہ فرمائی بلکہ ہوتا یہ تھا کہ آپ کی چار پائی صف کے کنارے لگا دی جاتی تھی اور آپ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے۔" (ص۱۶۸)

حضرت مولانا بشارت کریم رحمۃ اللہ علیہ گرھولوی جو ضلع مظفر پور (بہار) میں ایک بڑے باخدا بزرگ گزرے ہیں، آپ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو پاؤں کی کوئی ایسی بیماری تھی جس کی وجہ سے چلنے سے بڑی حد تک مجبور تھے مگر مولانا علیہ الرحمۃ کی شیفتگیِ جماعت کا یہ حال تھا کہ آپ نے ایک گاڑی بطور رکشا بنوا رکھی تھی جس سے پنج وقتہ مسجد حاضر ہو کر با جماعت نماز پڑھتے تھے (۱)۔

مولانا منظور نعمانی اپنے پدر بزرگوار کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"نماز باجماعت کا اہتمام جیسا میں نے اپنے والد ماجد میں دیکھا

---

(۱) روایت حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدظلہٗ دربھنگوی۔۱۲
(اب وہ مرحوم ہو چکے، اللہ مغفرت فرمائے — ناشر)

ایسا بہت ہی خاص بندگانِ خدا میں دیکھا گیا ہے اور یہ صرف اپنے ہی حق میں نہ تھا بلکہ ان کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ گھر کا ایک ایک آدمی بلکہ ہر صاحبِ شعور بچہ بھی جماعت کے وقت مسجد پہنچ چکا ہو۔ نماز کا وقت شروع ہوتے ہی تقاضا فرمانا شروع کر دیتے تھے، پھر جب مسجد کو جاتے تو راستہ کے لوگوں کو یاد دلاتے جاتے، ادھر چند مہینوں سے آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا اور بینائی قریباً معدوم ہو گئی تھی جس کی وجہ سے خود وقت کا اندازہ نہ فرما سکتے تھے تو ظہر اور عصر میں بہت پہلے سے دریافت فرمانا شروع کر دیتے تھے کہ بتلاؤ دروازہ کے سامنے سایہ کہاں تک گیا (۱)

میں نے اپنے طالبِ علمی کے زمانہ میں جب میں مفتاح العلوم میں پڑھتا تھا، حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی[۲] مدظلہ کے والد مرحوم کو دیکھا کہ باوجود اپنے مختلف مشاغل اور ضعف و کبر سنی کے ہمیشہ اپنے محلہ کی مسجد میں با جماعت نماز پڑھتے تھے۔ خود حضرت مولانا مدظلہ کو جب وہ مطالعہ میں مشغول رہتے کسی لڑکے سے بلواتے تھے۔ اسی طرح مولانا مدظلہ کے بچوں کو صبح تک کی نماز میں اپنے ساتھ مسجد لے جاتے۔

ضلع پورنیہ (بہار) کے مولانا ظفر صاحب کے متعلق بیان کیا جاتا ہے (۳) کہ وہ تو خود جماعت کے عاشق تھے ہی ساتھ ہی

---

(۱) الفرقان رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ۔ (۲) مولانا اب مرحوم ہو چکے، اللہ مغفرت فرمائے (ناشر)

(۳) روایت مولانا لطیف الرحمن صاحب دربھنگوی۔

یہ جذبہ اور جماعت کی اہمیت ایسی تھی کہ وہ عوام کو ترغیباً یہ مسئلہ بتاتے تھے کہ منفرد کی فرض نماز نماز ہی نہیں ہوتی (۱) بغیرِ عذرِ شرعی مسجد کی غیر حاضری پر بہت خفا ہوتے، کوئی ان سے تعویذ لینے آتا تو اس سے باجماعت نماز کے متعلق دستاویز لکھوا کر دیتے تھے۔

نظمِ جماعت کی وجہ اور اس کے فضائل

اب تک نظمِ جماعت کی اہمیت ثابت کی گئی، اب یہ بتانا ہے کہ آخر یہ اہتمامِ جماعت تھا کیوں؟ اس سلسلہ میں اختصار کے ساتھ چند حدیثیں ذکر کی جائیں گی جس سے امید کی جاتی ہے کہ نظمِ جماعت کے فضائل ذہن نشیں ہو جائیں گے۔ شرعی طور پر بھی اور بڑی حد تک عقلی طور پر بھی انشاء اللہ تعالیٰ۔ ارشادِ نبوی ہے:

صلوٰۃ الرجل فی الجماعۃ	مرد کی باجماعت نماز اس کی انفرادی
تضعف علیٰ صلاتہ فی بیتہ	نماز سے ثواب میں پچیس گنا بڑھی
وفی سوقہ خمساً وعشرین	ہوئی ہے جو وہ اپنے گھر یا بازار
ضعفاوذٰلك انہ اذا	میں پڑھے مگر یہ اس وقت کہ
توضأ فاحسن الوضوء ثم	وہ باقاعدہ وضو کرے۔ پھر
خرج الی المسجد لایخرجہ	اخلاص سے مسجد آئے، مسجد آنے
الا الصلوٰۃ لم یخط خطوۃ	میں جو قدم بھی اس کا اٹھے گا ہر
الا رفعت لہ بہا درجۃ	قدم کے بدلہ ایک درجہ بلند ہوگا

(۱) مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک جماعت سنتِ مؤکدہ یا زیادہ سے زیادہ واجب ہے ۱۲

وحطّ عنه بها خطيئة	اور ایک گناہ معاف ہوگا جب تک
فاذا صلی لم تزل	وہ اپنے مصلیٰ پر نماز وغیرہ میں
الملٰئکة تصلی علیه ما	مشغول رہے گا، اس کے لئے
دام فی مصلاه اللّٰهم	متواتر فرشتے دعائے مغفرت
صل علیه اللّٰهم	کریں گے کہ اے اللہ اس کو
ارحمه ولایزال احدکم	بخش دے، اے اللہ اس پر
فی صلاته ما انتظر	رحم فرما اور جب تک کوئی نماز
الصّلاة.	کے انتظار میں ہوتا ہے تو گویا
(بخاری باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ)	وہ نماز ہی میں ہوتا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ منفرد کی نماز سے جماعت کی نماز ستائیس درجہ زیادہ فضیلت رکھتی ہے (۱)، ان حدیثوں سے یہ بات نمایاں طور پر معلوم ہوئی کہ اکیلے اکیلے جو نماز پڑھی جائے اس میں اور جماعت کی نماز میں بلحاظ اجرو ثواب اور فضیلت بہت تفاوت ہے، پھر جماعتی کا ہر قدم ایک گناہ کو مٹاتا اور ایک درجہ بلند کرتا ہے۔ مزید براں جب تک وہ مسجد میں ہوتا ہے اس کے لئے فرشتے دعائے رحمت و مغفرت کرتے رہتے ہیں۔

الفاظ حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ثواب کی زیادتی میں جگہ اور مکان کو بڑا دخل ہے جو ثواب مسجد کی جماعت کا ہے وہ گھر کی جماعت کا نہیں اور جتنا ثواب گھر کی نماز با جماعت کا ہے بازار کی با جماعت نماز کا نہیں۔

---

(۱) مسلم باب صلوٰۃ الجماعۃ والتشدید فی التخلف عنہا ۱/۲۳۱۔

اس میں شبہ نہیں کہ منفرد کی نماز بھی ہو جاتی ہے اور اس طرح فرضیّت بھی ذمّہ سے ساقط ہو جاتی ہے مگر ثواب میں ان دونوں (باجماعت اور انفرادی) نماز میں بڑا فرق ہے، قلب و جگر پر اثرات کے ترتّب میں ایک کو جو درجہ حاصل ہے وہ دوسری (منفرد کی نماز) کو نہیں، اجتماع کو اس باب میں بڑا دخل ہے، یہی وجہ ہے کہ جماعت جس قدر بڑی ہوتی ہے اسی اندازہ سے فضیلت بڑھتی جاتی ہے، حدیث میں ہے :

ان صلوٰۃ الرجل مع الرجل ازکیٰ من صلوٰتہ وحدہ وصلاتہ مع الرجلین ازکیٰ من صلاتہ مع رجل وماکثر فھو احب الی اللہ۔	مرد کی نماز ایک شخص کے ساتھ اس کی تنہا نماز سے پاکیزہ تر ہے اور اس کی نماز دو شخصوں کے ساتھ ایک شخص کے ساتھ والی نماز سے افضل ہے اور جماعت میں جس قدر زیادتی ہو اللہ تعالیٰ کو وہ اور بھی محبوب ہے۔
(۱)	

نظمِ جماعت میں ثواب کی زیادتی کی تفصیل

ابھی ابھی جو ایک حدیث میں پچیس اور دوسری میں ستائیس گنا کا جملہ آیا ہے یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں کہ خواہ مخواہ اس کی کرید میں لگ جائیں، یہ دو کا فرق محض حسنِ عمل، حسنِ نیّت، مسجد کے قرب و بعد، خضوع و خشوع اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی

(۱) ابوداؤد باب ماجاء فی فضل الجماعۃ

وجہ سے ممکن ہے، یا صرف زیادتی ثواب بتانا ہے ، تعیین مقصود نہیں، اور بھی وجہ نکل سکتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے ان دونوں حدیثوں میں تطبیق کی بہت سی شکلیں لکھی ہیں مگر ان میں راجح انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق اس صورت کو قرار دیا ہے کہ یہ فرق سرّی اور جہری نماز کا ہے کہ سرّی میں دو کم یعنی پچیس گنا اور جہری میں دو زیادہ یعنی ستائیس گنا۔ پھر اس کی تفصیل بیان کر کے اپنے اس قول کو مدلّل فرمایا ہے، تفصیل اہلِ علم کے لئے قابل مطالعہ ہے، ملاحظہ فرمایا جائے۔

(۱) مؤذن کی دعوت جماعت کی نماز کی نیت سے قبول کرنا۔
(۲) اذان سنتے ہی نماز کے لئے جلدی کرنا اور اولِ وقت میں چلنا۔
(۳) باوقار مسجد کو روانہ ہونا۔
(۴) مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دعاء ماثورہ پڑھنا۔
(۵) مسجد میں پہنچ کر دو رکعت نماز تحیۃ المسجد پڑھنا۔
(۶) جماعت کا انتظار کرنا (جو نماز پڑھنے کے حکم میں ہے)
(۷) فرشتوں کا جماعت کی نماز پڑھنے والوں کے لئے دعاء رحمت و مغفرت کرنا۔
(۸) ان کے حق میں فرشتوں کی شہادت۔
(۹) تکبیر کے الفاظ کے جواب دینا۔
(۱۰) تکبیر کے وقت شیطانی وسوسہ سے محفوظ رہنا (کیوں کہ وہ بھاگ جاتا ہے)

(۱۱) امام کے تحریمہ کے انتظار میں توقف کرنا یا امام کے ساتھ اس کو جس حالت میں پائے، مل جانا۔

(۱۲) تکبیر تحریمہ کا پا لینا۔

(۱۳) صفوں کو درست کرنا اور اس کی کشادگی کو بند کرنا۔

(۱۴) امام کے "سمع اللہ لمن حمدہ" کے جواب میں "ربنا لک الحمد" کہنا۔

(۱۵) بھول چوک سے محفوظ رہنا اور امام سے بھول ہونے لگے تو اس کو "سبحان اللہ" کہہ کر خبردار کرنا۔

(۱۶) حالت جماعت میں خشوع و خضوع کا حصول اور غافل کرنے والی چیزوں سے عموماً سلامتی۔

(۱۷) عادۃً جماعت کے موقع پر حسنِ ہیئت کا خیال رکھنا۔

(۱۸) فرشتوں کا جماعت پر سایہ فگن رہنا۔

(۱۹) (امام کی وساطت سے) تجوید و ارکانِ صلوٰۃ سے واقفیت۔

(۲۰) (قیامِ جماعت میں) شعارِ اسلام کا اظہار۔

(۲۱) اجتماعی طور پر عبادت اور تعاون علی الطاعۃ کے ذریعہ شیطان کی رسوائی اور سُست و کاہل افراد میں جوش و نشاط پیدا کرنا۔

(۲۲) نفاق کی زد سے بچنا جو جماعت سے کترانے والے کی نشانی ہے اور اس الزام سے مامون رہنا کہ فلاں نے نماز ہی نہیں پڑھی۔

(۲۳) امام کے السَّلام علیکم ورحمۃ اللہ کی جو دعا ہے، دعا سے جواب دینا۔

(۲۴) یک جا طور پر اجتماعی دعا و ذکر میں مشغول ہو کر برکت سے منتفع ہونا۔

(۲۵) ایک گھر میں جمع ہو کر پڑوسیوں کا رات دن ملنا اور اس نظام کے ذریعہ ہر ایک کے حالات سے باخبر ہونا۔

یہ پچیس فائدے جماعت کی نماز کے ایسے ہیں جن سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی اور ان میں ہر ایک اپنی مخصوص فضیلت کی وجہ سے مستقل عبادت کی حیثیت رکھتا ہے، ان کے پیشِ نظر ماننا پڑتا ہے کہ اجر کا دو چند اور زیادہ سے زیادہ ہونا مسجد کے نظام سے جکڑا ہوا ہے۔ بہر حال یہ وہ فائدے ہیں جو ہر جماعت کی نماز میں پائے جاتے ہیں، وہ سرّی نماز (آہستہ قرأت والی) ہو یا جہری (کہ جس میں بلند آواز سے قرأت کی جائے) باقی دو فائدے ایسے ہیں جو جہری نماز کے ساتھ مختص ہیں، ایک امام کے پڑھتے وقت خموشی سے بغور سننا اور دوسرے امام کے آمین کہتے وقت مقتدی کا بھی آمین کہنا تاکہ فرشتوں کے آمین کہنے کی موافقت ممکن ہو سکے (۱)

دلوں پر قبضہ

اسلام نے جبر و تشدد کی راہ چھوڑ کر حتی الامکان دلوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے، وہ نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی عبادت کرے جس میں دل کو ارتباط نہ ہو، بلکہ اس نے یہ بھی پسند نہیں کیا کہ کسی درجہ میں انسان کا دل گرانی محسوس کرے، چنانچہ آپ احکامِ اسلام میں

---

(۱) یہ تفصیل فتح الباری جلد ثانی ص۹۶ سے لی گئی ہے۔ ۱۲

غور و فکر سے کام لیں گے تو معلوم ہو گا کہ ہر ہر قدم پر ترغیب کی راہ اختیار کی گئی ہے اور حتی الوسع جبر و اکراہ کو ترک کر کے تالیف قلوب سے کام لیا گیا ہے، ایک دفعہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اعظم الناس اجرا فی الصلوٰۃ ابعدھم فابعدھم ممشی والذی ینتظر الصلاۃ حتی یصلیھا مع الامام اعظم اجرا من الذی یصلی ثم ینام۔ (بخاری باب فضل صلوٰۃ الفجر فی جماعۃ)	نماز میں اس شخص کو زیادہ ثواب ملتا ہے جو جس قدر دور سے چل کر آتا ہے اور جماعت کے انتظار میں جو شخص بیٹھا رہتا ہے اور امام کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے وہ ثواب میں اس سے بڑھا ہوا ہے جو جماعت کا انتظار نہیں کرتا اور نماز پڑھ کر سو رہتا ہے۔

لب و لہجہ پر بار بار غور کیجئے، کس قدر شیریں اور دلنشیں ہے کلام میں درشتی اور سختی کا کہیں پتہ نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی موقعہ پر بھی سختی سے کام نہیں لیا گیا ہے، چوں کہ اسلام میں ایک مستقل گروہ منافقین کا تھا جو مسلمانوں میں اپنے طرزِ عمل سے تساہلی اور کاہلی کا پرچار کرتا تھا، اس لئے موقع موقع سے ایسی صورت بھی عمل میں لانی پڑی ہے کہ ان کے کیف و نشاط میں فرق نہ آنے پائے اور مؤمن کامل کیلئے تازیانہ کا کام دیتی رہے، سستی بے رغبتی جب کبھی ان میں قدم جمانے لگے تو اس طرح کی حدیثیں ان کو جھنجھوڑ دیں، چنانچہ فرمایا گیا:۔

ليس صلاة اثقل على المنافقين من الفجر والعشاء ولو يعلمون ما فيهما لأتوهما ولو حبوا ولقد هممت ان امر المؤذن فيقيم ثم امر رجلا يؤم الناس ثم اخذ شعلا من نار فاحرق على من لا يخرج الى الصلوٰة بعد۔
(بخاری باب فضل صلوٰۃ العشاء فی الجماعۃ)

فجر اور عشاء کی نماز سے بڑھ کر منافقوں پر اور کوئی نماز شاق نہیں ہے حالانکہ اگر ان کو ان نمازوں کی اہمیت کا علم ہو جائے تو جیسے بن پڑے دوڑے آئیں جی میں آتا ہے کہ مؤذن کو اقامت کا حکم کردوں اور کسی سے کہوں کہ وہ لوگوں کی امامت کرے اور خود آگ کا شعلہ لے کر نکل پڑوں اور ان کو پھونک ڈالوں جو اب تک جماعت کی نماز کے لئے نہیں نکلے ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:-

والمراد لاتوا الى المحل الذى يصليان فيه وهو المسجد۔ (فتح الباری ۲/۹۷)

مراد یہ ہے کہ وہ اس جگہ آئیں جہاں یہ دونوں نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور وہ جگہ مسجد ہے۔

نظم وارتباط، باہمی اتحاد اور دلوں کے ملاپ کے لئے ضروری ہے کہ اجتماع کا مرکزی گھر ایسا ہو جہاں ہر خاص وعام بغیر کسی حیلہ بہانہ کے بآسانی آسکیں اور اس کے لئے مسجدوں سے بڑھ کر اور کونسی جگہ ہوسکتی ہے جو خالص خدا کی ملکیت کہی جاتی ہے۔

مخصوص وقتوں کی فضیلت

اس میں شبہ نہیں کہ نسبتہً فجر، عشاء اور ظہر میں زیادہ دقتیں پیش آتی ہیں، سردی کے موسم میں عشاء اور فجر کی نماز کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نفس پر کتنا دباؤ ڈالنا پڑتا ہے، ٹھنڈی ہوا کا جھونکا، پانی کی بڑھتی ہوئی سردی، راستہ کی تاریکی اور نفس کی ایسے موقع پر آرام طلبی، یہ ساری باتیں مل ملا کر حوصلہ کو زیر کرنا چاہتی ہیں، گرمی کے موسم میں صبح کی میٹھی نیند برسات کی کالی رات اور دوسرے عوارض فجر و عشاء میں رکاوٹ بن کر سامنے آتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح کم و بیش ظہر کی نماز بہت کٹھن ہو جاتی ہے جبکہ دھوپ کی تمازت چہرہ کو جھلس رہی ہو، آسمان انگارے برسا رہا ہو، اور ہوا آگ لئے پھر رہی ہو، انسان طبعاً اس طرح کے موقع پرست و کاہل بن جاتا ہے، خطرہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ مرد مؤمن ان وقتوں میں مسجد جانے سے ہچکچائے اور جماعت کی نماز ترک کر بیٹھے، اس لئے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اہمیت کو اور بھی عمدہ پیرایہ میں ذہن نشیں فرمایا اور سمجھایا کہ میٹھی نیند، تیز دھوپ، سخت تاریکی اور گرمی و سردی تم کو دھوکہ نہ دے جائے، یہ نمازیں گو منافقین پر شاق ہیں کہ ان کو لذتِ ایمان میسر نہیں لیکن اگر ان کو ایمان کی شیرینی نصیب ہوتی اور پھر ان مشکل طلب وقتوں میں نماز باجماعت کے فضائل اور ان کے منافع کا علم و یقین ہو جاتا تو پھر

ہزار مجبوری ہوتی، پر یہ گھر میں بیٹھے نہیں رہتے بلکہ جس طرح بھی یہ مسجد پہنچ سکتے، پہنچنے کی سعیِ پیہم کرتے۔

عشار، فجر اور ظہر کی نمازوں کے اوقات جیسا عرض کیا گیا ذرا نفس کے لئے تکلیف دہ ہیں، اس لئے شریعت نے ان کے فضائل نسبتہً بڑھا کر بیان کئے اور گرانیِ طبع کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان وقتوں کی نماز باجماعت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

لو یعلم الناس ما فی النداء والصف الاول ثم لم یجدوا الا ان یستھموا علیہ لاستھموا علیہ ولو یعلمون ما فی التھجیر لاستبقوا الیہ ولو یعلمون ما فی العتمۃ والصبح لأتوھما ولو حبوا۔ (بخاری، باب فضل التھجیر الی الظہر)	لوگوں کو اگر علم ہو جائے کہ اذان پکارنے اور صفِ اول کی نماز میں کیا اجر اور فضیلت ہے، پھر وہ نہ پائیں تو قرعہ اندازی پر اتر آئیں اور اگر ان کو دوپہر (ظہر) کی نماز باجماعت کا علم و یقین حاصل ہو جائے اور پتہ لگ جائے کہ اس کا کیا ثواب ہے تو اس کے لئے دوڑ پڑیں، اسی طرح صبح اور عشار کی نماز کا جو درجہ ہے وہ معلوم ہو جائے تو یہ گھسکتے ہوئے بھی آئیں۔

فضائل و اجر کی کثرت:۔

ان حدیثوں میں جس قدر ہم غور کرتے ہیں فضائل و اجر کی

کثرت کا اور بھی یقین ہوتا ہے، ستائیس گنا ثواب کی توضاحت ہے مگر الفاظ حدیث کے ساتھ طرز بیان پر بھی نظر کیجئے تو معلوم ہو کہ اس متعینہ ثواب سے زیادہ بھی اور کوئی چیز ہے جس کو ہم نہیں سمجھتے یا وہ چیز ہماری عقل سے ماوراء ہے مگر ہے گرانقدر چیز جس کو حدیثوں میں "لویعلمون ما فی" جیسے جملوں سے بیان کیا گیا ہے اور ذخیرۂ احادیث کے پیش نظر تو یہ فیصلہ بڑی حد تک ناگزیر معلوم ہوتا ہے، پھر یہ حدیث "صحیح مسلم" میں موجود ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بیان فرمایا:۔

من صلی العشاء فی جماعة	جس نے عشاء کی نماز جماعت سے
فکانما قام نصف اللیل	پڑھی تو گویا وہ آدھی رات نماز
ومن صلی الصبح فی جماعة	میں کھڑا رہا اور جس نے جماعت
فکانما صلی اللیل کله۔	سے صبح کی نماز پڑھی تو گویا اس
(مسلم، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ الخ)	نے پوری رات نماز میں گذاری۔

اس حدیث کا اس کے سوا اور کیا منشاء ہے کہ ان دو وقتوں کی جماعت کی نماز کا اجر آدھی اور پوری رات کی عبادت اور نوافل کے برابر ہے اگر ایک طرف ان نمازوں کے لئے بندوں کے دلوں پر قبضہ کرنا مقصد ہے اور ان کو ساری دشواریوں سے گزار کر کیف و انبساط کے ساتھ جماعت میں لا کھڑا کرنا ہے تو دوسری طرف یہ بھی مقصد ہے کہ جماعت کی نماز کا ثواب ستائیس گنے سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے جو مخلص بندہ کو درگاہِ الٰہی سے ملتا ہے۔

سختی اور نرمی کا معیار

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھ لیا کہ اذان کے بعد وہ مسجد سے نکلا جارہا ہے تو آپؓ نے کس سختی سے فرمایا" اما ھٰذا فقد عصی ابا القاسم صلی اللہ علیہ وسلم" بلاشبہ اس نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی (۱)۔

پھر اسلام کی دلدہی پر قربان جائیے، اس نے اس شخص کو بھی جماعت کے ثواب سے محروم نہیں رکھا جو گھر سے جماعت کی نیت سے نکلا مگر اس کو جماعت نہ ملی بلکہ اس باب میں انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمادی کہ جو شخص باضابطہ باوضو مسجد آیا اور اس کو جماعت نہ مل سکی تو بھی اس کو جماعت کا پورا پورا اجر ملے گا، کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ (۲)

اس سے بڑھ کر یہ کہ معذورین کو رخصت بھی دی گئی ہے کہ اگر کسی کو عذرِ شرعی پیش آجائے تو وہ جماعت سے غیر حاضر بھی ہوسکتا ہے (۳) گو عزیمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خود حتی الوسع مسجد کی حاضری اپنے اوپر لازم جانے۔

---

(۱) مسلم، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ۔

(۲) ابوداؤد، بابٌ فی من خرج یرید الصلوٰۃ فسبق بہا۔

(۳) ان رسول اللہ صلعم کان یامر مؤذنا ثم یقول علیٰ اثرہ الا صلوا فی الرحال فی اللیلۃ الباردۃ المطیرۃ فی السفر۔ (بخاری، بابُ الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ)

نظمِ جماعت کی حکمتیں

یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ شریعت نے جن باتوں کی جتنی تاکید کی ہے ان میں اسی اندازہ سے مصالح اور حِکَم بھی پنہاں ہوتے ہیں جہاں تک ہر شخص کی نگاہ نہیں پہنچتی ہے۔ ہاں کچھ علماء راسخین فی العلم ہیں جو ایک حد تک حکمتوں کو پا لیتے ہیں اور پھر ان کے ذریعہ اور لوگ بھی ان مصلحتوں اور حکمتوں کو جان لیتے ہیں۔

بلاشبہ جماعت کی نماز جس کی اس قدر اہمیت ہے، بلاوجہ نہیں ہے، خیر و برکت اور اجر و ثواب کی زیادتی اپنی جگہ، علاوہ ازیں اس میں بیش بہا فوائد، وقیع منافع اور اَن گنت حکمتوں کا خزینہ پوشیدہ ہے، یہاں ان میں سے چند کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

"نماز کی جماعت" کے نام سے جو اجتماع ہوتا ہے وہ ایسے گھر میں ترتیب پاتا ہے جہاں ہر مسلمان کو برابر کا حق پہنچتا ہے اصولی طور پر اس میں شرکت کی عام اجازت ہوتی ہے، دیہاتی شہری، بڑے چھوٹے عالم اور غیر عالم سب مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس اجتماع کی شرکت باعث فخر و مباہات ہوتی ہے اور اس کثرت سے یہ اجتماع ہوتا ہے کہ لوگوں میں ایک رسم عام کی حیثیت قبول کر لیتا ہے، کوئی اپنی سستی، کاہلی اور بے رغبتی سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہے تو یہ کوئی آسان بات نہیں، اس لئے کہ غیر حاضری کی شکل میں تلاش اور جستجو ہوگی، وجہ دریافت

کی جائے گی اور معقول عذر نہ ہونے کی صورت میں لوگوں کی نگاہ میں وہ معتوب سمجھا جائے گا۔

کاہلی کا انسداد

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کاہل، سست اور بے رغبت مسلمان کے اندر چستی پیدا ہوگی اور وہ بڑی حد تک اپنے کو مجبور پائے گا کہ مسجد آئے، جماعت میں شریک ہو، کیوں کہ یہ امتحان گاہ ہے کہ کون لوگ ہیں جو دعوی اسلام کے ساتھ ساتھ اپنے دلوں میں اسلام کی محبت و وقعت بھی رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت برضا و رغبت بجا لاتے ہیں اور کتنے وہ ہیں جن کو صرف ادّعائے اسلام ہے اور درحقیقت ان کا دل دین کی محبت سے خالی اور ویران ہے اور رب العالمین کے ساتھ ان کا تعلق بے دلی، بے رغبتی اور دوری کا ہے۔

عالمانِ دین کا امتحان

اس اجتماع دینی میں چوں کہ دین کے جاننے والے اور اس کے ماہر بھی ہوتے ہیں اور دین سے ناواقف اور جاہل لوگ بھی، اس لئے عالمانِ دین اور احکام دین سے واقف افراد کا امتحان بھی ہے کہ یہ اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں یا نہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ان کو کس قدر احساس ہے۔

قبولیتِ دعا

یک جا ایک دو نہیں، پورے محلہ کے مسلمان کم از کم جمع ہوتے ہیں اور سب مل کر ایک عظیم الشان عبادت میں مشغول ہیں اور پھر اس طرح امید و بیم کے ساتھ ایک ہی مقصد کے لئے دل کی پوری گہرائی کے ساتھ پروردگار عالم سے دعا کرتے ہیں اور نماز کے ذریعہ اپنے خدا سے بہت قریب ہو کر کرتے ہیں۔ اس لئے توقع کامل ہے کہ رب العالمین دعا کو شرف قبولیت بخشے گا اور ان کو اجتماعی مقاصد میں کامیاب فرمائے گا۔

اعلائے کلمۃ اللہ

اللہ تعالیٰ کا امتِ محمدیہ سے جو یہ مقصد ہے کہ اس کا کلمہ بلند ہو، اسی کا بول بالا رہے اور دین اسلام اور ادیانِ باطلہ پر غالب ہو کر رہے تاکہ سارے انسانوں کو حقیقی امن و راحت میسر ہو تو بلاشبہ اس مقصد کی تکمیل بھی یک گونہ ہوتی ہے کیوں کہ یہ ایک ایسی دستوری عبادت ہے جس کو دین سے بڑا گہرا تعلق ہے اور اس طرح یہ عبادت علی الاعلان ادا ہوتی ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ کا ایک شعبہ انجام پذیر ہوتا ہے۔

شیطان کی رسوائی

شیطان جو بندۂ مومن کا کھلا ہوا دشمن ہے اور ان کے آپس

میں بعد و تفرقہ ڈال کر ان کو کمزور کرنا چاہتا ہے اور ان کو ٹولیوں میں بانٹ کر اپنے قابو کا متمنی ہوتا ہے، اس یکجائی عبادت سے اس کی بھی پوری رسوائی ہوتی ہے اور اس طرح اس کا داؤ پیچ بنا بنایا ختم ہو جاتا ہے جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پاکیزہ اشارہ فرمایا تھا۔

ما من ثلٰثة فی قریة او	کوئی آبادی ہو یا جنگل جس میں
بدو ولا تقام فیهم الصلاة	تین آدمی رہتے ہوں جب اس
الا قد استحوذ علیهم	میں نماز قائم نہیں کی جاتی ہے
الشیطان۔	تو شیطان ان پر قابو پالیتا ہے۔

ماحصل یہ تھا کہ جہاں جماعت ہو سکتی ہے وہاں جماعت ہرگز ترک نہ کی جائے کہ اس طرح شیطان کو موقع مل جائے گا اور پھر دین میں سستی کا دروازہ کھل جائے گا اور جماعت کا اہتمام جب شد و مد سے باقی رہے گا تو پھر شیطان کی رسوائی ضروری ہے (۱)

تزکیہ اور تالیفِ قلوب

ابن العربی مالکیؒ نے مسجد ضرار والی آیت کے ضمن میں لکھا ہے اور جماعت کے ایک پہلو تزکیہ و تصفیہ اور تالیف قلوب پر کافی روشنی ڈالی ہے، ان کے الفاظ چونکہ نچے تلے ہیں اس لئے خود اس عبارت کو بھی ملاحظہ فرمائیں :-

یعنی انهم کانوا جماعة واحدة	سارے مسلمان ایک جماعت تھے

(۱) یہ تفصیل حجۃ اللہ البالغہ۔ باب الجماعۃ جلد ثانی سے ماخوذ ہے۔ ۱۲

فی مسجد واحد فارادوا
ان یفرقوا شملهم فی الطاعة
وینفردوا عنهم للکفر
والمعصیة وهذا یدل
علیٰ ان المقصد الاکثر
والغرض الاظهر من وضع
الجماعة تالیف القلوب
والکلمة علی الطاعة وعقد
الذمام والحرمة بفعل
الدیانة حتی یقع الانس
بالمخالطة وتصفو القلوب
من وضر الاحقاد والخسارة
ولهٰذا المعنیٰ تفطن مالک
حتی انه قال لا یصل
جماعتان فی مسجد واحد
لا بامامین ولا بامام واحد
حتی کان ذلک تشتیتا
للکلمة وابطالا لهٰذه
الحکمة وذریعة ان
تقول من اراد الانفراد
عن الجماعة کان له

اور ایک مسجد میں نماز پڑھتے تھے
منافقین نے چاہا کہ طاعت میں
ان کا شیرازہ منتشر کر دیں اور
ان سے علیحٰدہ رہ کر کفر و معصیّت
کو فروغ دیں، اس واقعہ سے معلوم
ہوا کہ خدائی نظم جماعت کی غرض
وغایت یہ ہے کہ دلوں میں ارتباط،
طاعت میں یک رنگی اور شیرازہ
بندی قائم رہے تاکہ باہم انس و
محبت پیدا ہو اور کینہ وکپٹ اور
دنائت سے دل صاف اور پاک
رہے اور اس معنی کو امام مالکؒ
نے خوب سمجھا تا آنکہ انہوں نے
یہ فرمایا کہ ایک مسجد میں دو جماعتیں
نہیں پڑھی جا سکتی ہیں، نہ دو امام کے
ساتھ اور نہ ایک امام کے ساتھ
کہ یہ کلمہ کے تشتت اور اس کی
حکمتِ بالغہ کے ابطال کا سبب
بن جائے اور تاکہ یہ اس بات
کا ذریعہ ہو جائے کہ ہم جماعت
سے علیحٰدگی کے خواہاں اس کو

عذر فيقيم جماعة و يقدم امامه فيقع الخلاف وبطل النظام۔ (احکام القرآن ج ۱ ص: ۴۱۴، ۴۱۵)	عذر بنالیں کہ وہ ایک اور جماعت قائم کریں اور ایک دوسرا امام بنالیں اور اس طرح اختلاف کا چشمہ پھوٹ پڑے اور نظامِ وحدت درہم برہم ہو جائے۔

انتشارِ جماعت کی کراہیّت

بلاشبہ اس کلام میں جس طرف اشارہ کیا گیا ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جماعت کے بنیادی مقاصد سے ہے اور کہا جا سکتا ہے جماعت کی روح بڑی حد تک اسی میں پنہاں ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ائمۂ دین نہایت سختی سے اس طرف گئے ہیں کہ اذان و جماعت والی مسجد میں جماعتِ ثانیہ کراہیّت سے کسی حال میں خالی نہیں اور فضائل صرف جماعتِ اولیٰ ہی کو حاصل ہیں۔

ہم جب نمازِ خوف کا مسئلہ سامنے رکھتے ہیں تو اور بھی مسئلۂ جماعت کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے، میدانِ کارزار میں جب دو جماعت کا حکم نہیں تو رات دن اپنی پرسکون مسجد میں جماعتِ ثانیہ کی اجازت کیوں کر سمجھی جا سکتی ہے۔ ہاں راستہ کی مسجد ہو تو البتہ اجازت سمجھ میں آتی ہے کہ وہاں کوئی نظم و ضبط ممکن ہی نہیں۔ احادیث میں اس طرح کا واقعہ جہاں آیا ہے اس کی مراد یہی ہے کہ وہ گذرگاہ کی مسجد ہو گی، نظمِ جماعت کے سلسلہ میں جو حدیث ہم نقل کر آئے ہیں ان میں بھی اس طرف کافی اشارہ موجود ہے کہ

جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صرف ایک ہی ہوتی تھی اور یہی مطلوب بھی تھا۔

دلوں کی نورانیت

جماعتِ ثانیہ کو جب جماعت کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی تو پھر قدرتی طور پر جماعتِ اولیٰ میں ہر شخص حاضری کی سعی کرے گا اور وہ سستی جو جماعتِ ثانیہ کے نام پر پیدا ہو سکتی ہے راہ نہ پائے گی اور اس صورت میں جماعت بڑی سے بڑی ہوگی، پھر ہر ایک قلب روشن ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی معرفت و طاعت کا نور، ایک قلب مؤمن سے دوسرے مؤمن کے دل پر پرتو ڈالے گا اور اس طرح ان کی روحوں کی مثال ایسی ہو جائے گی کہ چند صاف شفاف آئینے ایک دوسرے کے آمنے سامنے رکھ دیئے گئے ہیں اور ان پر سورج کی آزاد کرنیں پڑ رہی ہیں، جس طرح اس وقت ان آئینوں کا حال ہوتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کو اپنے عکس سے منور کر دیتا ہے، یہی حال جماعت میں شریک ہونے والی روحوں کا ہوتا ہے۔

صبح کی جماعت میں تو یہ کیفیت اور بھی پورے شباب پر ہوگی، کیوں کہ آرام و چین کی نیند دماغ کو سکون بخش دیتی ہے، دل اس وقت نسبتہً بہت زیادہ پرسکون اور افکار کے گرد و غبار سے پاک ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی جماعت کا ثواب یہ بتایا گیا ہے کہ پوری رات کی عبادت کے برابر ہے۔

دین سے دنیا کی اصلاح

جو کچھ عرض کیا گیا اس کی روشنی میں غور کیجئے کہ ان کیفیتوں کے حصول کے وقت ایک کا دوسرے سے بغل گیر ہونا کس قدر اثر انداز ہوسکتا ہے، دنیاوی اعتبار سے بھی اور دینی نقطۂ نظر سے بھی، اتحاد و ارتباط جسمانی اور روحانی دونوں کائنات کے لئے مفید ثابت ہوگا اور ان کیفیات کے استحضار کے ساتھ جو بھی اجتماع ہوگا کیا ان میں یہ احساس تازہ نہ ہوگا کہ جس طرح ہم ایک گھر میں، ایک ضابطہ کے تحت، صرف ایک ذات کی خوشنودی کے لئے جمع ہوتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ دنیاوی زندگی میں ہماری لائنیں مختلف ہوں اس لئے جس طرح یہاں ہم مل کر اپنے ایک بڑے دشمن شیطانِ رجیم کو رسوا کر ڈالتے ہیں، اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی متحد ہو کر اپنے دشمنوں پر غالب آسکتے ہیں۔

اسلامی مساوات

صرف یہی نہیں بلکہ ایک امام کی ماتحتی ان کے دلوں پر یہ نقش چھوڑے گی کہ دنیاوی زندگی میں بھی ہمارا امام ایک ہی ہونا چاہیئے۔

ایک گھر میں ایک مصلّے پر بلا امتیاز ہر ایک کا دوسرے کے بغل گیر ہونا اور ایک سیدھ میں کھڑا ہونا، ان میں مساوات کی وہ

روح پیدا کرے گا جو لاکھوں کا نفرنسوں سے ممکن نہیں، یہاں شاہ وگدا، امیر وفقیر، منصب دار اور غیر منصب دار، ذات پات، نسل ونسب اور رنگ وروپ کا کوئی سوال نہیں ہوتا، کسی کی کوئی جگہ متعین نہیں، یہاں اگر کسی درجہ میں معیارِ فضیلت ہے تو زہد وتقویٰ، خدا شناسی اور خدا ترسی، علم وفضل اور اسی طرح کی کوئی اور چیز، بلکہ نظمِ جماعت میں تو ان چیزوں کو بھی دخل نہیں ہے سوائے علم وفضل کے کہ ان کا بعض امور میں لحاظ ہوتا ہے۔

بغض وحسد کی روک تھام

اور پھر اس نظمِ جماعت سے خود بخود الفت ومحبت کے رشتے استوار ہوتے ہیں، نفاق وخصومت، حسد وبغض، عداوت ونفرت اور اس طرح کی ساری نقصان دہ اور ضرر رساں باتوں کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے بھی نماز کے اس وصف کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا۔ (الروم: ۳۱۔۳۲)

محبّت واُلفت

رات دن کی باہم ملاقاتیں خاص کیفیت کے ساتھ ہونگی توجہاں الفت ومحبت اور مساوات کا جذبہ راسخ ہوگا وہاں

دردمندی و غمخواری بھی اپنی جگہ پیدا کر لے گی۔ ایک دوسرے کو بُرے اور پھٹے حال میں جب دیکھے گا تو طبعی طور پر ہمدردی، حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ کا جذبہ ابھرے گا اور اجتماعی جذبہ ان کو سب کچھ کرنے پر مجبور کرے گا۔ یہ اور اس طرح کے بیسیوں فائدے خود بخود مترتب ہوں گے۔ مسجد کے اس نظم جماعت کے مصالح و حِکَم اگر استقصاء سے قلمبند کئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب صرف اسی عنوان پر ترتیب دی جاسکتی ہے۔

رحمتِ عالم صلعم کی مسرّت

بہرحال انہی حِکمتوں اور مصلحتوں کا نتیجہ تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نظمِ جماعت بہت محبوب تھا اور اپنی اخیر ساعت عمر تک آپؐ نے اس سے والہانہ محبت فرمائی، حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ دوشنبہ کو صدیقِ اکبرؓ امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور لوگ صف بستہ پیچھے کھڑے تھے اور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی آخری بیماری میں کمزوری کی وجہ سے گھر میں آرام فرما تھے، آپؐ اپنے بستر سے اٹھ کر دروازہ پر تشریف لائے اور پردہ اٹھا کر جماعت کو دیکھنے لگے جو مسجد میں مشغولِ نماز تھی، آپؐ یہ دیکھ کر خوشی سے مسکرا اٹھے (۱)

جانتے ہیں آپؐ کی یہ مسرت کیوں تھی؟ محض اس وجہ سے کہ آپؐ نے صحابۂ کرام کو دیکھا، نماز باجماعت ادا کر رہے ہیں،

(۱) مسلم ۱/۱۷۹۔

ہر ایک امام کی پوری پوری پیروی کرتا ہے اور اس طرح یہ اپنی شریعت پر قائم، آپس میں متحد اور ان کے دل ملے ہوئے ہیں۔

جامع مسجدوں کا نظام

یہ پنج وقتہ جماعتوں کا حال ہے جو محلہ میں اشاعتِ دین، انضباط، اتحاد اور بے شمار دینی وسیاسی منافع کا باعث ہوتی ہیں، باقی شہروں اور بڑی آبادی کے مختلف محلوں میں اشاعتِ دین وغیرہ کا مسئلہ، تو اس کے لئے شریعت نے جامع مسجدوں کا نظام قائم کیا ہے اور اس کو ٹھوس بنیاد پر قائم کر دیا ہے کیوں کہ ہر دن تمام محلوں کا یکجا ہونا دِقّت و پریشانی اور حرج سے خالی نہ تھا اور ہفتہ بھر میں ایک ہی بار اس طرح کا اجتماع اپنی مخصوص خوبیوں کی بناء پر مناسب بھی تھا۔

ہر جگہ جمعہ کی ایک ہی جماعت عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں

چونکہ جامع مسجدوں سے گرانقدر فوائد متعلق ہیں اس لئے شریعت نے اس مسئلہ کو واضح کر دیا ہے کہ ایک شہر یا قصبہ میں ایک ہی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی جانی چاہیئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین کے زمانہ میں یہی رائج تھا (۱)، ایک شہر

(۱) حافظ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی فتوحات کے زمانہ میں گورنروں اور فوجی افسروں کو لکھا تھا کہ جمعہ کی نماز ایک جگہ جمع ہو کر پڑھی جائے۔

(اصلاح المساجد للقاسمی ص۵۵ و ۵۶)

کی متعدد مسجدوں میں جمعہ کی نماز نہیں پڑھی جاتی تھی، صاحب مبسوط جو خود بھی تعددِ جمعہ کے عدم جواز کی طرف مائل ہیں لکھتے ہیں:

ان فی زمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخلفاء بعدہ فتحت الامصار ولم یتخذ احد منہم فی کل مصر اکثر من مسجد واحد لاقامۃ الجمعۃ ولو جاز اقامتہا فی موضعین جاز فی اکثر ذلک فیؤدی الی القول بان یصلی اہل کل مسجد فی مسجدہم واحد لایقول بذلک وفی تجویز اقامۃ الجمعۃ فی موضعین فی مصر واحد تقلیل الجماعۃ واقامۃ الجمعۃ من اعلام الدین فلایجوز القول بمایؤدی الی تقلیلہا۔

(مبسوط سرخسی باب الجمعۃ ۱/۱۲۱)

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے خلفاء رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں بہت سے شہر فتح ہوئے مگر ان میں سے کسی نے بھی ایک شہر میں ایک جامع مسجد سے زیادہ نہ بنائی اگر اقامتِ جمعہ ایک شہر میں دو جگہ جائز ہوتا تو دو سے زیادہ جگہوں میں بھی جائز ہوگا اور بالآخر یہ بات یہاں تک پہنچے گی کہ ہر ہر مسجد والے اپنی ہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے اور ایک شہر میں دو مسجدوں کے اندر نمازِ جمعہ جائز قرار دینا جماعت کی قلت کا باعث ہوگا، حالانکہ اقامتِ جمعہ دین کی نشانیوں سے ہے، لہذا ایسی بات کا قائل ہونا جائز نہ ہوگا جو اس کی تقلیلِ جماعت کا باعث ہو۔

انہوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ تعددِ جمعہ کی شکل میں اقامتِ جمعہ کا مقصدِ اصلی فوت ہو جائے گا، کیوں کہ جماعت میں انتشار پیدا ہو کر قلت پیدا ہو جائے گی، حالانکہ یہ دن شریعت نے اس لئے مخصوص کیا ہے کہ ہفتہ میں ایک بڑی جماعت جس میں سارا شہر شریک ہو، شعارِ دین کا عظیم الشان مظاہرہ کرے اور دینی و دنیاوی فوائد سے متمتع ہو۔

خیر القرون بلکہ قرونِ ثلٰثہ تک تعددِ جمعہ کا پتہ نہیں چلتا(۱) امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو تیسری صدی ہجری کے ہیں انہوں نے اپنے زمانہ میں تعددِ جمعہ کا انکار فرمایا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ تعددِ جمعہ میں نقل کیا ہے:

ذکر الاثرم من احمد انه	اثرم نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے
قال لا اعلم بلدا من بلاد	کہ انہوں نے فرمایا "میں نہیں جانتا
المسلمین اقیمت فیه الجمعتان	کہ مسلمانی شہروں میں سے کسی شہر
اذا تقرر هذا واحمد	میں بھی دو جمعے قائم کئے گئے ہوں"
من القرن الثالث ظهر	یہ جب ثابت ہو چکا اور یہ بھی معلوم
ان خیر القرون لم یقع	ہے کہ امام احمدؒ تیسری صدی کے

(۱) خطیب نے "تاریخ بغداد" میں لکھا ہے کہ اسلام میں تعددِ جمعہ کی بدعت کا موجدِ اول معتضد ہے، اسی کے زمانہ میں پہلے پہل قدیم جامع مسجد کے علاوہ ایک دوسرا جمعہ دار الخلافت میں قائم کیا گیا مگر یہ جمعہ بغیر مسجد بنائے ادا کیا گیا تھا، یہ واقعہ ۲۸۰ھ کا ہے۔ باضابطہ مسجد تعددِ جمعہ کے لئے مکتفی کے زمانہ میں بنی۔

(اصلاح المساجد للقاسمی ص۵۵)

فی زمانہم التعدد۔ | ہیں پس معلوم ہوا کہ خیر القرون میں
(مجموعہ فتاویٰ عبدالحی ۲/۱۱۴) | تعددِ جمعہ واقع نہیں ہوا۔

ائمۂ اربعہ عدمِ تعددِ جمعہ کے حق میں

اکثر علماء احناف اور دوسرے ائمہ کا قول بھی اسی کی تائید میں ہے کہ تعددِ جمعہ نہ ہونا چاہئے، بعض تو بالکل ناجائز کہتے ہیں اور بعض اولیٰ اور احوط کے خلاف قرار دیتے ہیں، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت جواز کی اور دوسری عدمِ جواز کی ہے، عدمِ جواز والی ہی روایت کو علمائے احناف میں امام طحاوی، تمرتاشی اور صاحب مختار نے راجح قرار دیا ہے۔ ائمہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ عدم تعدد کے قائل ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور روایت بھی یہی ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کو راجح قرار دیتے ہیں۔ سبکی شافعیؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ کسی بھی صحابی یا تابعی سے ایک شہر میں تعددِ جمعہ ثابت نہیں (۱)

ف انہی (سبکی) کا بیان ہے کہ تعددِ جمعہ کی بدعت مصر و شام میں بہت بعد میں آئی ہے۔ قاہرہ میں دوسرا جمعہ ملک ظاہر کے زمانہ میں قائم ہوا ہے جس کی مخالفت اس وقت کے قاضی القضاۃ تاج الدین نے کی تھی۔ اس سے پہلے ایک ہی جگہ جمعہ کی نماز ہوتی تھی اور شہر دمشق میں تو فتح عمرؓ سے لے کر رمضان ۷۵۶ھ تک ایک ہی جمعہ ہوتا رہا ہے۔

(اصلاح المساجد للقاسمی ص۶۴)

(۱) فتاویٰ عبدالحیؒ ج ۱ ص۱۱۱ و رد المحتار جلد اول۔ ۱۲

مروّجہ تعددِ جمعہ

تمام روایتوں پر پوری بصیرت کے ساتھ غور کرنے کے بعد فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ایک شہر میں (اگر اس میں دریا یا بڑی نہر نہیں ہے تو) صرف ایک ہی مسجد میں جمعہ بڑی حد تک ضروری ہے اور اگر ایسا دریا شہر میں ہے جو اِدھر سے اُدھر ہونے میں مانع ہے یا اتنی بڑی آبادی ہے جہاں ایک مسجد میں نہ گنجائش ہو سکتی ہے اور نہ آنا آسان ہے تو دو جگہ نمازِ جمعہ پڑھی جا سکتی ہے، باقی آج کل جیسا تعدد جمعہ مروج ہے وہ کسی درجہ میں بھی اصولِ شریعت کے قریب نہیں، مروجہ تعدد جمعہ کے جواز کی بحث میں دخل انداز ہونے کی چاہے گنجائش نہ ہو مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ طریقہ اقامت جمعہ کے بنیادی منشا اور اس کی روح کے خلاف ہے۔

اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں کہ جمعہ کے دن معذورین (مسافر، مریض وغیرہ) کا مصر میں ظہر کی نماز با جماعت ادا کرنا مکروہ ہے، اس کی وجہ علماء نے جو لکھی ہے وہ یہ ہے کہ جماعت جمعہ میں اختلال کا اندیشہ ہے۔ مولانا بحر العلوم جو خود تعددِ جمعہ کے قائل ہیں مگر یہ بھی معذورین کی جماعت ظہر کو غیر دیہات میں مکروہ لکھتے ہیں اور وجہِ کراہت جو بتاتے ہیں وہ یہ ہے:

لان الجمعۃ جامعۃ	نماز جمعہ ایک شہر کی مختلف جماعتوں
للجماعات فی المصر ولو صلی	کو یک جا کرنے والی ہے اور
المعذورون بالجماعۃ	معذورین با جماعت نماز پڑھیں گے

عسیٰ ان یدخل غیرھم فیختل جماعۃ الجمعۃ۔ (ارکان ص۱۱۱)	تو ممکن ہے غیر معذور بھی ان کے شریک ہو جائیں، پس اس طرح جماعت جمعہ میں اختلال پیدا ہو جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ جب جماعت جمعہ کا اس قدر لحاظ ہے تو پھر خود جمعہ کی جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا کیوں کر قرینِ اصول ہو سکتا ہے۔

قیامت کی یاد

جب اتنی بات سمجھ میں آگئی تو اب جامع مسجدوں کے نظام پر غور فرمائیں کہ کیوں کر ہفتہ میں ایک مخصوص دن، ایک وقت میں ہر ہر جگہ کے مسلمان اپنی اپنی جامع مسجد میں یکجا ہونگے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی پورے شان و شکوہ کے ساتھ ادا کریں گے اور پھر اس اجتماع کو کیا حیثیت حاصل ہو گی۔

علامہ ابن القیمؒ اجتماعِ جمعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بلاشبہ جمعہ لوگوں کے جمع ہونے اور ان کو مبداء و معاد یاد دلانے کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر اُمّت کے لئے ہفتہ میں ایک دن بنایا ہے جس میں وہ عبادت کے لئے ہر کام سے علیٰحدہ ہوتے ہیں اور جمع ہو کر مبداء و معاد اور ثواب و عقاب کو یاد کرتے ہیں اور اس اجتماع سے اس بڑے اجتماع کی یاد تازہ کرتے ہیں جو پروردگارِ عالم کے روبرو ہو گا اور یہ مسلّم ہے

کہ اس مقصد کے لئے دنوں میں وہ دن مناسب تھا جس میں ساری مخلوق جمع کی جائے گی اور وہ جمعہ کا دن ہے، لہذا اللہ تعالیٰ نے اس دن کی فضیلت و شرافت کے پیشِ نظر اس امت کے لئے اسی دن کو یہ فخر عطا کیا اور اپنی بندگی کے لئے اس دن میں ان کا اجتماع مشروع فرمایا اور اسی کو اس کی شرافت کی وجہ سے مقدر فرمایا، پس یہ دن شرعی طور پر دنیا میں جمع ہونے کا دن ہے اور قدر و منزلت کے لحاظ سے آخرت میں۔" (زاد المعاد باب الجمعۃ)

قیامت کے دن حشر میں جو اجتماع ہوگا وہ بھی جمعہ ہی کا دن ہوگا، اس لئے یقینی طور پر مردِ مؤمن کا ذہن جمعہ کے اجتماع سے بڑے دن کے اجتماع کی طرف جائے گا اور پھر ساتھ ہی وہ سارے حالات جو میدانِ حشر میں پیش آنے والے ہیں ایک ایک یاد آئیں گے اور اپنے اعمال و اخلاق کا نقشہ تھوڑی دیر کے لئے آنکھوں میں پھر جائے گا اور اس سے یقینی طور پر قلبِ مومن متأثر ہوگا۔

پند و نصیحت

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم شاید اسی وجہ سے کبھی کبھی نمازِ جمعہ میں "سورۂ جمعہ" تلاوت فرماتے تھے جس میں نمازِ جمعہ کے لئے تاکیدی حکم ہے، سعی الی الجمعہ کا وجوب ہے اور ان تمام امور کے ترک کا حکم ہے جو نمازِ جمعہ اور اجتماعِ جمعہ کی شرکت سے مانع ہو سکتے ہیں، پھر ذکر اللہ کی کثرت پر بھی زور دیا گیا ہے، تاکہ یہ

صلاح وفلاح دارین کا ذریعہ بن سکے اور کامیابی سے ہمکنار کر دے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہونا باعثِ ہلاکت ہے اور آپؐ دوسری رکعت میں سورۂ منافقون پڑھتے تھے، جس سے غالباً آپؐ کا منشاء یہ تھا کہ امّت کو نفاق سے ڈرائیں جو دینی و دنیاوی تباہی و بربادی کا سرچشمہ ہے، نیز امّت کو اس بات پر متنبّہ کرنا مقصود تھا کہ مال، اولاد اور دنیا کا لالچ تم کو نمازِ جمعہ اور اللہ کی یاد سے خبردار کہیں روک نہ دے اور آخر میں موت کی یاد تازہ کرا کے اصل مقصد کی طرف متوجہ کرنا اور اس کے موانع سے ہشیار کرنا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے یہیں کر لو، وہاں اس کا موقع نہیں ہے، بعد موت ساری تمنّا اور آرزو بے سود ہوگی (۱)

آج بھی امّت کے لئے وہی طریقہ مسنون ہے جو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، چنانچہ ہفتہ میں جب یہ عظیم الشان اجتماع ہوگا، مسلمان خلوص کے ساتھ جمع ہوں گے تو قیامت کی وہ سخت گھڑی یاد آئے گی جب نفسی نفسی کا عالم ہوگا، نفس اور اعمال کے احتساب کا موقع پیدا ہوگا اور امام جب کبھی نماز میں سورۂ جمعہ اور منافقون کی تلاوت کرے گا تو ہمارے قلوب میں ایک بے چینی کی کیفیت پیدا ہوگی۔

پورا شہر ایک امام کے پیچھے

پھر اس ہفتہ وار اجتماع میں پنج وقتہ جماعت کے فائدوں کے

---

(۱) زاد المعاد ۱/۱۱۸۔

ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ چند مسجدوں کی جماعتیں ایک مسجد میں سمٹ آتی ہیں اور سب کے سب صرف ایک امام کی پیروی کرتے ہیں گویا یہ امام پورے شہر کا امام ہوتا ہے اور آج اس کی ہر حرکت و سکون کی پوری پوری مطابقت کی جاتی ہے، یہ امام اس دن ایک بلیغ خطبہ دیتا ہے جس میں حمد و ثنا کے بعد قرآن و احادیثِ پاک کی روشنی میں فرائض اور ذمہ داریوں کی یاد دہانی کی جاتی ہے۔ امام شہر کی سیاسی و دینی رہنمائی کرتا ہے اور ہفتہ بھر کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین کا تذکرہ کرتا ہے اور خیر القرون کی یاد تازہ کراتا ہے اور اس طرح اس دور کے احیاء کے لئے ابھارتا ہے۔

تبلیغ واشاعت کی اہمیّت

یہی وجہ ہے کہ خطبہ کا سننا واجب قرار دیا گیا ہے، امام جہاں خطبہ دینے کی نیّت سے نکلا، دنیا کی ساری باتیں باعثِ گناہ ہوگئیں جن امور کی اجازت تھی وہ بھی شرعی طور پر اَب باقی نہیں رہی، کوئی بھی کچھ بول نہیں سکتا، حتیٰ کہ نفل و سنت پڑھنے کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اذا قلت لصاحبك يوم الجمعة انصت والامام يخطب فقد لغوت (۱)۔	اگر امام کے خطبہ دیتے وقت تونے اپنے کسی بھائی سے یہ کہا کہ چپ رہو تو یہ بھی تونے ایک لغو کام کیا۔

(۱) بخاری باب الانصات یوم الجمعۃ۔

اندازِ خطابت

گویا امام کے سوا کسی اور کو یہ حق نہیں کہ کچھ بولے یا امر بالمعروف کرے، یہ ساری چیزیں صرف امام ہی کے لئے اس وقت مخصوص ہوتی ہیں، خطیب، قوم کا بہترین شخص ہوگا۔ اس پر اثنا، خطبہ میں ایسی کیفیت طاری ہو کہ اس کی زبان سے جو بات نکلے، اثر میں ڈوبی ہوئی ہو تاکہ قوم کے قلب و جگر پر تیر کی طرح وہ بات لگتی چلی جاتے، ..... سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ خطابت اس دن اسی انداز کا ہوتا تھا حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا خطب احمرت عيناه وعلا صوته واشتد غضبه حتى كأنه منذر جيش يقول صبحكم و مساكم و يقول بعثت انا والساعة كهاتين ويقرن بين اصبعيه السبابة والوسطىٰ۔ (۱)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے تو آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور آواز بلند اور لب و لہجہ میں شدت پیدا ہو جاتی، معلوم ہوتا آپ کسی لشکر سے ڈرا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ وہ لشکر اب صبح و شام میں ٹوٹ پڑنے والا ہے اور فرماتے کہ قیامت اور میرے درمیان بس اتنا فرق ہے جتنا شہادت اور درمیانی انگلی کے درمیان۔

(۱) مسلم، کتاب الجمعۃ ۱/ ۲۸۴۔

امام کی ظاہری ہیئت

اس دن امام کی ظاہری ہیئت بھی ذرا عمدہ اور نمایاں ہونی چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کتبِ حدیث میں اس طرح کی باتیں ملتی ہیں۔ حضرت عمرو بن حریثؓ کا بیان ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطب وعلیہ عمامۃ سوداء قد ارخی طرفیھا بین کتفیہ یوم الجمعۃ۔ (مسلم)۔	جمعہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سیاہ عمامہ باندھ کر خطبہ ارشاد فرماتے جس کے دونوں کنارے آپ کے شانوں کے درمیان لٹکتے ہوتے۔

سامعین کا لحاظ

جمعہ کے دن جو مستحبات و مسنونات ہیں ان کو سامنے رکھ لیجئے، تو اجتماع کی شان و شوکت اور بھی نمایاں معلوم ہوگی، غسل، مسواک، خوشبو حتی المقدور، اچھا لباس وغیرہ وغیرہ۔ پھر امام کو ہدایت ہے کہ خطبہ یسا دے کہ سامعین پورے کیف و نشاط کے ساتھ سنیں، ان کے وش و انبساط میں کوئی فرق نہ آئے، ارشادِ نبویؐ ہے:۔

ان طول صلوٰۃ الرجل وقصر خطبتہ منبئۃ من فقھہ فاطیلوا الصلوٰۃ واقصروا الخطبۃ وان من البیان لسحرا۔ (مسلم، کتاب الجمعۃ ۱/۲۸۶)	مردِ مؤمن کی لمبی نماز اور مختصر خطبہ اس کے فقیہ ہونے کی علامت ہے پس نماز لمبی کرو اور خطبہ مختصر اور بلاشبہ بعض بیان جادو ہے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ضرورت کے وقت بھی اختصار ہی سے کام لیا جائے جس سے ضرورت پوری نہ ہو سکے بلکہ امام کو ضرورت کے وقت اس کا اختیار ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور بھی یہی تھا، کبھی خطبہ کو طول دیتے اور کبھی اختصار سے کام لیتے، جیسی ضرورت محسوس فرماتے۔ علامہ ابن القیمؒ لکھتے ہیں:

وکان یقصر خطبته احیانا ویطیلها احیانا بحسب حاجة الناس (۱)

جیسی لوگوں کی ضرورت ہوتی اسی کے مطابق آپؐ خطبہ دیتے، کبھی مختصر اور کبھی لمبا۔

امام کی توجہ

خطبہ میں اس کا بھی لحاظ رہے کہ امام خطبہ دیتے ہوئے کھڑا رہے اور اس کا رخ قوم کی طرف ہو تاکہ امام کی طرف قوم کا رجحان باقی رہے اور اس کی باتیں قوم کو متاثر کر سکیں۔ سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔

وکان یخطب قائماً واذا صعد المنبر اقبل بوجهه علی الناس۔ (۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے اور منبر پر لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے۔

اس طرف اشارہ گذر چکا ہے کہ امام (خطیب) محض اپنے جسم ہی سے قوم کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو دلی اور روحانی توجہ بھی قوم پر رکھنی چاہیئے۔

---

(۱) زاد المعاد ۱/۴۷۔ (۲) ایضاً۔

قبولیتِ دعا کی گھڑی

جمعہ کے دن ایک گھڑی ایسی ہے جس میں دعائیں خصوصیت سے مقبولِ بارگاہ ہوتی ہیں۔ حدیث کے الفاظ تو بتاتے ہیں کہ دعا ضرور قبول ہوتی ہے، اس گھڑی میں مومن کی دعا رد نہیں کی جاتی رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ جمعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فیه ساعة لایوافقها عبد مسلم وهو یصلی یسأل الله شیئاً الّا اعطاه اشار بیده یقللها۔ (مسلم کتاب الجمعہ ۱/۲۸۱)	جمعہ کے دن ایک ایسی گھڑی ہے جس میں مرد مسلمان نماز پڑھے اور اپنے اللہ سے کسی چیز کی درخواست کرے تو اللہ تعالیٰ وہ چیز اسے عطا کرے گا مگر وہ گھڑی مختصر ہوتی ہے۔

یہ ساعت استجابت باقی ہے یا اٹھالی گئی؟ ہر جمعہ میں یہ ساعت آتی ہے یا کسی خاص میں، اس باب میں مختلف اقوال ہیں مگر جو صحیح مذہب ہے وہ یہ ہے کہ یہ ساعتِ استجابت (قبولیت کی گھڑی) باقی ہے اور ہر جمعہ میں آتی ہے، یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے کہ وہ کونسی گھڑی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس باب میں بیالیس اقوال نقل کئے ہیں اور پھر ہر ایک قول کا ماخذ اور اس کی دلیل بھی لکھی ہے مگر راجح یہی ہے کہ اس قبولیت کی گھڑی کو چھپالیا گیا ہے، کوئی خاص گھڑی متعین نہیں ہے اور اس سے مقصود یہ ہے

کہ بندہ اس گھڑی کی تلاش و جستجو میں ہمیشہ ہر جمعہ کو پورے دن رغبت سے عبادت میں مصروف رہے۔

اس سلسلہ میں دوسرا قول یہ ہے کہ قبولیت کی ساعت وہ ہے جب امام (خطیب) منبر پر خطبہ کے لئے بیٹھے اس وقت سے لے کر ختم نماز جمعہ تک ہے یا پھر عصر سے لے کر غروب آفتاب تک۔ سئل علیہ السلام عن ساعۃ الاجابۃ فقال مابین جلوس الامام الیٰ ان یتم الصلوٰۃ۔ (درمختار) اس روایت کی بنیاد پر دعا دل سے کی جائے گی نہ کہ زبان سے، اس لئے کہ اس وقت میں مقتدیوں کو خاموش رہنے کا حدیث میں حکم دیا گیا ہے۔ فیسن الدعاء بقلبہ لا بلسانہ لانہ مامور بالسکوت۔ (ایضاً) وقیل وقت العصر والیہ ذھب المشائخ (ایضاً) وفی حدیث اٰخر انھا اٰخر ساعۃ فی یوم الجمعۃ وصححہ الحاکم وغیرہ۔ (ایضاً)

نماز جمعہ کی تاکید

انہی خصوصیات کی وجہ سے نماز جمعہ کی سخت تاکید ہے اور باجماعت نماز کا حکم ہے، جمعہ کی انفرادی نماز سرے سے جائز ہی نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ معذور و مجبور ہیں وہ بجائے جمعہ ظہر کی نماز پڑھ سکتے ہیں، قرآن میں اس نام سے ایک مستقل سورہ موجود ہے اس میں یہ آیت بھی آئی ہے:

یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ	اے ایمان والو! جمعہ کے دن جب اس کی نماز کے لئے تم کو پکارا جائے

الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ   تو اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف دوڑو
وَذَرُوا الْبَیْعَ (الجمعۃ: ۹)   اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔

حدیث میں مختلف پیرایہ سے اس کی اہمیت ذہن نشین کی گئی ہے، یہاں صرف چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔

الجمعۃ حق واجب علیٰ کل مسلم فی جماعۃ الا علیٰ عبد مملوک او امرأۃ او صبی او مریض۔(۱)	ہر مسلمان مرد پر جمعہ کی جماعت ایک ضروری حق ہے البتہ چار پر نہیں، غلام، عورت، بچہ اور بیمار۔

ترکِ جمعہ و جماعت کی وعید بیان کی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:۔

سمعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول علیٰ اعواد منبرہ لینتھین اقوام من ودعھم الجمعات او یختمن اللہ علیٰ قلوبھم ثم لیکونن من الغافلین۔ (۲)	ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا کہ یا تو لوگ جمعوں کے ترک سے باز آئیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دیگا، پھر وہ غافلوں میں ہو جائیں گے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے جو ابوداؤد میں ہے کہ جو شخص سستی کی وجہ سے تین جمعہ ترک کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر کر دیتا ہے۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں آیا کہ جو لوگ جمعہ کی نماز میں نہیں آتے جی چاہتا ہے ان کو پھونک ڈالوں (۳) علامہ

---

(۱) ابوداؤد۔
(۲) مسلم، کتاب الجمعہ ۱/۲۸۴۔
(۳) مسلم، باب صلوٰۃ الجماعۃ الخ ۱/۲۳۲۔

ابن القیمؒ نے انہی حدیثوں کے پیشِ نظر لکھا ہے کہ "جمعہ کی نماز فرائض اسلام میں مؤکد تر ہے اور اس کا اجتماع، عظیم الشان اجتماع ہوتا ہے، اتنا عظیم الشان کہ عرفہ کے بعد فرض اجتماع یہی ہے جو اس کی شرکت محض اپنی سُستی و دنیا طلبی کی وجہ سے ترک کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے دل پر غفلت کی مہر لگا دیں گے، اس کا رتبہ اعلیٰ ہے اور اتنا اعلیٰ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی قربت اور سب سے اول اس کا دیدار ان لوگوں کو نصیب ہوگا جو جمعہ کے دن امام کے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور سویرے جامع مسجد حاضر ہوتے ہیں (۱)

یہ سب تاکید اسی لئے ہے کہ جامع مسجدوں کا قدرتی نظام ہمیشہ مضبوط بنیاد پر قائم رہے اور ان کے اجتماعوں سے جو بھی دینی و دنیاوی فائدے ہوسکتے ہیں، فرزندانِ توحید اس سے پورے طور پر مستفید ہوتے رہیں اور غفلت، کاہلی اور بے رغبتی وغیرہ ان میں اثر پذیر نہ ہوسکے۔

ایک عام فائدہ

شروع میں عرض کر آیا ہوں کہ جمعہ کے اجتماع میں شہر کے ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے ہیں، علماء و صوفیاء، رؤساء، تجار، غرباء، فقراء مختصر یہ کہ ہر شعبۂ زندگی کے تقریباً ماہرین ہوتے ہیں، ہر ایک دوسرے کو عبرت و بصیرت کی نظر سے دیکھیں گے، کسی کو تعلیم اور علوم و فنون کی اشاعت کی فکر ہوگی، کسی کو تزکیۂ قلوب

(۱) زاد المعاد ۱/۱۰۲۔

اور روحانی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوگی، کوئی مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی کا جائزہ لے گا، کوئی پست خیال افراد کی ترقی کی اسکیم بنائے گا اور کچھ لوگوں میں کسب حلال کی امنگ پیدا ہوگی، گویا یہ سارے طبقے مل کر ہر ہفتہ اور کچھ نہیں تو مسلمانوں کی اصلاح کا احساس تو ضرور ہی اپنے اندر پیدا کریں گے اور ہر قلب پر ایک چوٹ سی لگے گی۔

مسجدوں کا ایک اور نظام عید گاہ کے نام سے

اس ہفتہ وار اجتماع کے علاوہ سال میں دو مخصوص اجتماع اور بھی ہوا کرتے ہیں، ایک کو عید الفطر کہتے ہیں اور دوسرا عیدِ اضحیٰ کے نام سے موسوم ہوتا ہے، ان کا نظام "عید گاہ" کے نام سے قائم ہے۔ اس کو مسجدوں سے بڑا گہرا تعلق ہے اور یہ مسجدوں کے نظام سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ عید گاہ بہت سے شرعی احکام میں مسجد کے تابع ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ عموماً یہ اجتماع مسجد میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ پنج وقتہ نمازوں میں داخل نہیں بلکہ علیحدہ ہے اور سال میں یہ دو نمازیں روزانہ نماز سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں، شریعت میں ان نمازوں کو وجوب کا درجہ حاصل ہے۔ اسی وجہ سے اس کے لئے نہ اذان ہوتی ہے نہ تکبیر، بقیہ شرائط تقریباً وہی ہیں جو جمعہ کے لئے ہیں۔

یہ اجتماع ہفتہ وار اجتماع کی نسبت سے ذرا شاندار ہوتا

ہے، اس میں اہتمام کچھ زیادہ ہوتا ہے اور عموماً اس کی ادائیگی بجائے مسجد کے باہر میدان میں ہوتی ہے۔ ایک میں صدقۂ فطر کا حکم ہے اور دوسرے میں "قربانی" کا، جس سے غرباء و فقراء کی تھوڑی بہت امداد ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ بھی اس مسرّت میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔

ذخیرۂ احادیث کو سامنے رکھ کر جب غور کیجئے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس موقع سے جہاں اور بہت سے فائدے اور مصالح مقصود ہیں وہاں شکوہ اسلام اور شوکت مسلمین کا اظہار بھی ہے اور غالباً اسی وجہ سے حکم ہے کہ ایک راستہ سے جائے اور واپسی دوسرے راستہ سے ہو، بلکہ ایک میں تو آوازِ بلند تکبیر کا بھی حکم ہے۔

کتب حدیث میں یہ واقعہ بھی مندرج ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے موقع پر عورتوں کے اجتماع کا بھی حکم دیا ہے حتی کہ ان عورتوں کو بھی نکلنے کا حکم ہے جو نماز نہیں پڑھ سکتی ہیں، اس کی وجہ بعض علماء یہی بتاتے ہیں کہ شروع اسلام میں اس سے بڑی حد تک اظہار شان و شکوہ تھا اور اب چونکہ یہ ضرورت اس پیمانہ پر باقی نہیں رہی، اس لئے عورتوں کا اجتماع ناپسند کیا جاتا ہے اور بعض لوگ تو اب بھی اس موقع پر خروجِ نساء کے قائل ہیں، تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

اجتماعِ عیدین کی اہمیّت

ان اجتماعِ عیدین سے بھی خیر القرون میں کام لیا گیا ہے اور

آج بھی ان سے کام لیا جا سکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ ہم دین کی ان حکمتوں سے واقف نہیں اور یہ کہ اس اجتماع سے کام لینا چھوڑ دیا، آج بھی اگر ارباب فضل و کمال اس طرف توجہ کریں تو ان اجتماع سے ایک بڑی کانفرنس کا کام لیا جا سکتا ہے، دین کی باتوں کی اشاعت بسہولت ہو سکتی ہے۔ بہت سے ان مسلمانوں کو جو دین سے ناآشنا ہیں انہیں دین کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔

بہرحال آج ہم اپنی غفلتوں کی وجہ سے جو بھی کریں مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اجتماعِ دینی سے بڑا کام لیا۔ تبلیغ و اشاعت میں ان سے آپؐ کو بڑی مدد ملی ہے جہاد جیسا اہم کام بھی اس موقع سے آپؐ نے انجام دیا ہے، بلکہ حدیث میں اس کا کچھ خصوصیت سے ذکر ملتا ہے، حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں:۔

كان النبی صلی الله علیه	نبی اکرم صلعم عید الفطر اور عید
یخرج یوم الفطر والاضحیٰ الی	الاضحیٰ میں عید گاہ تشریف لاتے،
المصلی فاول شئ یبدأ	سب سے پہلے نماز ادا فرماتے
به الصلوٰة ثم ینصرف فیقوم	پھر فارغ ہو کر لوگوں کی طرف
مقابل الناس والناس	توجہ فرماتے اور لوگ اپنی جگہ
جلوس علیٰ صفوفهم	بیٹھے ہوتے، ان کو نصیحت فرماتے
فیعظهم ویوصیهم و	اور تاکیدی حکم دیتے اگر لشکرِ
یأمرهم وان کان یرید	اسلام کی روانگی کا ارادہ ہوتا تو
ان یقطع بعثا قطعه او	اس کو روانہ فرماتے، یا کسی ضروری

یامر بشیٔ امر بہ ثم ینصرف۔ | کام کا انجام دینا ضروری ہوتا تو اس کے متعلق حکم نافذ فرماتے، پھر واپس ہوتے۔

(بخاری، باب الخروج الی المصلی)

ملکی اور دینی کام

یہ حدیث کتنی واضح ہے، الفاظِ حدیث میں اسی اجتماع کے مہتم بالشان ہونے پر کس قدر زور معلوم ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا عظیم الشان مصرف لیا، مجاہدین کی روانگی کا کام کوئی معمولی کام نہیں ہے، کاش اس سے ہم سبق حاصل کریں اور ملکی یا دینی جس طرح کا کام درپیش آئے اس سے مدد لیں، اس وجہ سے اور بھی کہ اس طرح کا اجتماع آج کل آسان کام نہیں اور غالباً اسی حکمت کے پیشِ نظر عید کا خطبہ نماز بعد رکھا گیا ہے کہ باطمینان تبلیغ و اشاعتِ دین کا کام انجام پاسکے، بخلاف جمعہ کے کہ وہ نسبتۃً جلد جلد ہوتا ہے، خطبہ نماز سے پہلے رکھا گیا ہے، بلاشبہ یہ بھی بات ہے کہ جمعہ بعد نوافل و سنن ہیں جو عید بعد نہیں ہیں۔

عن ابن عمرؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکرؓ وعمرؓ یصلون العیدین قبل الخطبۃ۔

(بخاری، باب الخطبۃ بعد العید)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ عیدین کی نماز خطبہ سے پہلے ادا فرماتے۔

اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو بھی نصیحت

فرماتے اور انہیں بھی ان کے فرائض یاد دلاتے تھے، حدیث میں یہ واقعہ مصرح ہے، ملاحظہ ہو۔

ثم اتی النساء فوعظهن وذکرهن وامرهن بالصدقة رأیتهن یهوین الیٰ اٰذانهن و حلوقهن یدفعن الی بلال ثم ارتفع هو وبلال الیٰ بیته۔	(مردوں سے فارغ ہوکر) آپؐ عورتوں کے مجمع میں تشریف لاتے اور ان کو وعظ و نصیحت فرماتے اور صدقہ دینے کی تلقین فرماتے راوی کا بیان ہے کہ میں عورتوں کو دیکھتا تھا کہ اپنے کانوں اور گردنوں کے زیورات پر جھک پڑتی تھیں اور حضرت بلالؓ کے حوالے کرتی تھیں، پھر آپؐ حضرت بلالؓ کے ساتھ گھر تشریف لاتے۔
(مشکوٰۃ، صلوٰۃ العیدین)	

مسجدِ حرام کا اجتماع

عیدِ اضحیٰ کے موقع پر دنیائے اسلام کا عظیم الشان اور بے مثال اجتماع ہوتا ہے اور وہاں ہوتا ہے جو آنحضرت کا مولد ہے، جو مقام ابتدائے بنی آدم سے مرجع خاص و عام ہے، جو عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں کا قدیم مرکز ہے اور جس کو "سرة الارض" (نافِ زمین) کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ دنیائے اسلام کا شیرازہ ہے جس میں سارے فرزندانِ توحید بندھے ہوئے ہیں، چاہے وہ کسی گوشۂ زمین کا باشندہ ہو اور جس نسل و خاندان سے بھی تعلق رکھتا ہو... اس

نشان دہی سے بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ میری مراد مکّہ معظمہ یا دوسرے لفظ میں مسجدِ حرام سے ہے جو روئے زمین کی پہلی مسجد ہے "اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ" (آلِ عمران ۹۶)

اسلامی عالمگیر کانفرنس

اسی مسجد حرام کو یہ شرف حاصل ہے کہ اولِ یوم سے یہ انسانوں کا مرجعِ عام رہی اور جب سے عالم میں اسلام کی نورانی کرنیں پھیلیں ہر سال یہاں "اسلامی عالمگیر کانفرنس" ہوتی ہے جس میں پورب سے لے کر پچھم اور اتر سے لے کر دکھن تک کے اسلامی نمائندے شریک ہوتے ہیں اور ایک مقام اور ایک تاریخ میں جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیّت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان کرتے ہیں اور جمع بھی ہوتے ہیں کس شان سے؟ کہ ان سب کی سرکاری زبان ایک ہوتی ہے، سب کی ظاہری ہیئت ایک سی ہوتی ہے، سب کی آواز اور پکار بھی تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔ یہاں ملک و قوم کا سوال مٹ جاتا ہے، نسب و نسل کا بت پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ایک رشتہ سارے رشتوں پر غالب ہو جاتا ہے، مختصر یہ کہ سب ایک خاندان کے افراد بن کر جمع ہوتے ہیں۔

کونسا ایسا کام ہے جو اس عظیم الشان تاریخی اجتماع سے انجام نہ پاسکے، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عالمی مجلس سے بڑا کام لیا ہے، مکّی زندگی میں بھی اور مدنی دورِ حیات میں بھی،

اسی اجتماع کی برکت سے اوّل اوّل اسلام مدینہ منورہ پہنچا تھا، اور وہاں پہنچ کر پورے عالم پر چھایا تھا، آپؐ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس عالمی اجتماع سے کام لیا، سیاسی بھی اور دینی بھی، اور صحابۂ کرامؓ کے بعد بھی ہر دور میں محدثین اور علماء نے اس اجتماع سے فائدہ اٹھایا جس کی تفصیل یہاں مقصود نہیں ہے۔

اشاعت و تبلیغ کا موقعہ

آج بھی ہم اس اجتماع سے دینی اور دنیاوی فائدے حاصل کرسکتے ہیں۔ یہاں اشاعتِ دین کا بڑا اچھا موقع ہے، لوگ سب سے علیٰحدہ ہوکر صرف دین کے لئے جمع ہوتے ہیں اور سب سے کٹ کر ایک مقصد کے لئے دور دراز سے چل کر آتے ہیں، خدا کرے مسلمانوں کی سوئی ہوئی بستی جاگے اور "نظامِ مساجد" کے ان اہم شعبوں پر غور و فکر کرے۔ اسی مسجد حرام کے باب میں قرآن کا اعلان ہے "وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا" (البقرۃ: ۱۲۵) اور اسی کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ارشادِ ربانی ہوا تھا "وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (الحج: ۲۷)

دعوتِ اجتماع

اَب تک جو لکھا گیا وہ نظامِ اجتماع اور نظمِ جماعت یا ان کی افادیت پر ـــــــ یہاں یہ بتانا ہے کہ اس قدرتی اجتماع کے لئے دعوت کیسے دی جاتی ہے اور شریعتِ مطہرہ نے اس کے لئے بھی کس قدر دلنشیں طریقہ مقرر کیا ہے۔ یہ نظامِ دعوت بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے اور یہ اپنے بے شمار فائدے کے پیشِ نظر تفصیلی بحث کا متقاضی ہے۔

ضرورتِ اذان

نظامِ اجتماع میں یہ بات ہم ثابت کر چکے ہیں کہ جماعت کی نماز ہی کامل نماز کہی جاتی ہے اور قرآن پاک نے اسی نماز کا ہم سے مطالبہ کیا ہے، بلاشبہ نماز کے وقت مقرر و متعین ہیں مگر وقت اتنا محدود نہیں کہ صرف اس میں وہی نماز ادا کی گئی اور وقت ختم ہو گیا، بلکہ ہر ایک نماز کا وقت کچھ نہ کچھ وسیع ہے، اس لئے اس کی ضرورت پڑی کہ کوئی ایسا ہو جو اس متعین وقت کے اس حصہ کی خبر دے جس میں جماعت ہوگی اور اس طرح دے کہ محلہ بھر میں خبر پہنچ جائے۔

اذان کی ابتدار

چنانچہ اس مسئلہ پر پہلے پہل عہدِ رسالت میں مشورہ ہوا جس

مجلسِ مشاورت میں صحابۂ کرامؓ کے علاوہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے، ہر ایک نے اپنی اپنی رائے پیش کی، کسی نے کہا کہ آگ روشن کردی جائے، کسی نے نرسنگھا پھونکنے کی تجویز پیش کی اور کسی نے ناقوس کا مشورہ دیا، آپؐ نے ان مشوروں میں سے کسی کو منظور نہیں فرمایا، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک غیر کے طریقہ کی پیروی تھی، مجوس آگ جلاتے ہیں، یہود نرسنگھا پھونکتے ہیں اور عیسائی ناقوس بجاتے ہیں، گویا اس مجلس میں کوئی بات طے نہ پاسکی (۱) لوگ منتشر ہوگئے۔

اس واقعہ کو بخاری ومسلم نے بھی نقل کیا ہے جس کے راوی عبداللہ بن عمرؓ ہیں، لکھا ہے کہ مدینہ میں پہنچ کر یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا، لوگوں نے وہی تجویزیں پیش کیں جو گذریں، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا:

اولا تبعثون رجلاً ینادی بالصلوٰۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا بلال قم فناد بالصلوٰۃ۔	کیوں نہیں کسی کو بھیج دیتے کہ نماز کے لئے پکار دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ سے فرمایا، جاؤ نماز کے لئے آواز دیدو۔
(مشکوٰۃ باب الاذان)	

اسی زمانہ میں حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہؓ نے ایک خواب دیکھا، جس میں ان کو کلماتِ اذان واقامت سکھائے گئے، انہوں نے اپنا یہ خواب آنحضرت صلعم کی خدمت میں بیان کیا

(۱) حجۃ اللہ البالغہ باب الاذان ۱/۱۹۰۔

آپؐ نے اس خواب کی تصدیق فرمائی، خواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے دیکھا ایک شخص ہاتھ میں ناقوس لئے ہوئے ہے، یہ دیکھ کر انہوں نے پوچھا، ناقوس فروخت کروگے؟ ناقوس والے نے مقصد دریافت کیا، انہوں نے کہا، نمازیوں کو بلاؤں گا، اس نے کہا تم کہو تو اس کام کے لئے اس سے اچھی شکل بتلادوں۔ انہوں نے کہا، اچھا ہے سکھلادو، اس مردِ خدا نے اذان و اقامت کے کلمات مرتب طور پر بتادیئے۔ یہ جب نیند سے بیدار ہوئے، آپؐ کی خدمت میں آئے، واقعہ بیان کیا، آپؐ نے فرمایا "انہا لرؤیا حق ان شاء اللّٰہ" خدا نے چاہا تو یہ خواب حق ہے، جاؤ بلالؓ کو جو تم سے بلند آواز ہیں ان کو بتلاؤ اور وہ ان کلمات کو پکاریں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت عمرؓ نے اس آواز کو جب سنا اپنی چادر کھینچتے ہوئے حاضر ہوئے اور فرمانے لگے:

یارسول اللّٰہ والذی بعثک بالحق	یارسول اللہ قسم ہے اس ذات کی
لقد رأیت مثل ما اُری فقال رسول	جس نے آپؐ کو حق دے کر بھیجا ہے
اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فللّٰہ	میں نے بھی وہی دیکھا جو ان کو دکھلایا
الحمد۔ (مشکوٰۃ باب الاذان)	گیا، یہ سن کر آپؐ نے اللہ کا شکر ادا کیا

کلماتِ اذان کی حیثیت

اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

"یہ واقعہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ احکامِ شرعیہ کا مدار حکمتوں

اور مصلحتوں پر ہے، حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا ہوا کہ اذان صرف اعلام اور آگاہی ہی نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ شعائرِ دین میں ایک مستقل شعار بھی ہو، اس طرح سے جو لوگ غافل ہوں یا خبردار لیکن مسجد سے دور رہتے ہیں ان کے سروں پر پکار دی جائے اور اس شعار دین کی عزّت و توقیر کی جائے اور جو جماعت اسے قبول کرے اس کے متعلق یہ علامت قرار پا جائے کہ یہ دینِ الٰہی کے تابع اور اس کے منقاد ہیں اور یہی وجہ ہوئی کہ کلماتِ اذان ذکراللہ اور شہادتین سے مرتب ہیں اور ان میں سے ایسے کلمات بھی ہیں جن میں صراحتاً نماز کی طرف دعوت پائی جاتی ہے۔ (۱)

اذان کی تاریخ

اذان کی ابتداء کب ہوئی؟ اس میں محققین علماء حدیث کا یہ فیصلہ ہے کہ دارالہجرت مدینہ منورہ میں ہوئی (۲) جیسا کہ اس طرف اشارہ اوپر کی روایت میں گذر چکا ہے، قرآن کی جن آیتوں میں اذان کا ذکر ہے وہ بھی مدنی ہی ہیں۔

وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّ لَعِبًا ط ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ۔ (المائدۃ: ۵۸)	اور تم جب نماز کے لئے اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ اس کے ساتھ ہنسی اور کھیل کرتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ بالکل عقل نہیں رکھتے۔

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ۔ الاذان ج۱/۱۹۱۔
(۲) فتح الباری باب بدء الاذان۔

مفسرین نے شانِ نزول جو بیان کیا ہے اس میں نصرانی یا یہودی کا نام لیا ہے کہ وہ تمسخر کیا کرتے تھے۔ مدینہ کا جو نصرانی اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ" پر" قد حرق الکاذب" (جھوٹا جل جائے) کہتا تھا، اس کا پورا گھر جل کر ہی مرا (۱)

دوسری آیت یہ ہے اور یہ بھی مدنی ہے:-

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا   اے ایمان والو! نماز کے لئے

نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ الخ (جمعہ: ۹)   جب اذان پکاری جائے۔

اس کے بعد شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، یہ بات البتہ تحقیق طلب ہے کہ اذان کی مشروعیت کیا صرف عبداللہ بن زیدؓ کے خواب ہی پر ہوئی؟ یا اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی وحی بھی آئی؟ جواب یہ ہے کہ آپؐ کے پاس وحی بھی آئی اور وحی پیشتر آئی (۲)

اذان کی عظمت

اذان کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا شعارِ دین ہے جس کی وجہ سے دار، دارالاسلام کے حکم میں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں کہیں اذان سن لیا کرتے، رک جاتے، حملہ نہیں کرتے، دوسرے یہ کہ یہ اذان شعبہائے نبوّت سے ایک شعبہ ہے، اس لئے کہ اس میں ایک

---

(۱) بیان القرآن ۳/۳۴ بحوالہ ابن جریر وغیرہ۔

(۲) فتح الباری باب بدء الاذان۔

عظیم الشان عبادت اور ایک مہتم بالشان رکن کی طرف ترغیب پائی جاتی ہے، خیر متعدی اور اعلاءِ کلمۃ الحق میں اللہ تعالیٰ کی جو خوشنودی ہے کسی اور چیز میں نہیں، اس میں شیطان کی سوزش بھی خوب ہے اسی طرف حدیث میں اشارہ ہے کہ "ایک فقیہ شیطان کے حق میں ہزار عبادت گذار سے سخت ہوتا ہے"۔ اور جب نماز کے لئے اذان پکاری جاتی ہے تو شیطان بے تحاشا بھاگتا ہے (۱)

اذان کو مسجد کے اجتماع میں بڑا دخل ہے، اسی وجہ سے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شعارِ دین میں داخل فرمایا ہے حضرت انسؓ کا بیان ہے:

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یغیر اذا طلع الفجر وکان یستمع الاذان فان سمع اذانا امسك و الا اغار رواہ مسلم (۲)	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فجر طلوع ہوتی تو چھاپہ مارتے اور کان لگا کر اذان سنتے، اگر اذان سن لیتے تو رک جاتے ورنہ حملہ کرتے۔

انہی حضرت انسؓ کا ایک اور بیان ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا غزا بنا قوما لم یکن یغزو بنا حتی یصبح وینظر الیہم فان سمع اذانا کف عنہم وان لم یسمع اذانا اغار علیہم۔ (مشکوٰۃ باب الکتاب الی الکفار)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم کو لیکر غزوہ کے لئے نکلتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی اور ان کو دیکھ نہ لیتے حملہ نہ کرتے، اذان سنتے تو رک جاتے اور نہیں سنتے تو حملہ آور ہوتے۔

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۹۱۔ (۲) مشکوٰۃ باب فضل الاذان۔

اذان شیطان کے لئے

اذان چونکہ نمازیوں کے لئے مسجد آنے کی دعوت ہے اور شیطان اس کارِ خیر کا دشمن ہے، وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس بندگی کو کوئی ادا نہ کرے اور وہ ہمیشہ وسوسہ کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس اذان میں ایسی تاثیر رکھی ہے جس سے شیطان پناہ مانگتا ہے، یہ اس پر بجلی کا اثر رکھتی ہے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ یقول ان الشیطان اذا سمع النداء بالصلوٰۃ ذھب حتی یکون مکان الروحاء۔ (۱)	میں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے سنا، نماز کی اذان جب شیطان سنتا ہے تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے تاآنکہ مکان روحاء پر رکتا ہے۔

راوی نے اس روایت میں یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ مقامِ روحاء۔ مدینہ سے چھتیس میل کی دوری پر واقع ہے۔ ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ اذان سنتے ہی وہ پریشان اور گھبرا کر چلتا بنتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اذان نہ سن سکے، اذان جب ختم ہوتی ہے تو پھر پلٹ کر آتا ہے، تکبیر کے وقت پھر چلتا بنتا ہے، اس کے بعد آکر وسوسہ پیدا کرتا ہے اور بھولی ہوئی بات یاد کراتا ہے تاآنکہ تعداد رکعت میں نمازی احتمال میں پڑ جاتا ہے کہ کتنی رکعت ہوئیں (۲)

---

(۱) مشکوٰۃ فضل الاذان۔ (۲) مشکوٰۃ باب الاذان۔

علمی بحث اور اس کا جواب

اس حدیث کو نقل کر کے شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے ایک اعتراض کیا ہے اور خود ہی جواب دیا ہے۔ اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ شیطان اذان سے تو بھاگتا ہے مگر کیا وجہ ہے کہ تلاوتِ قرآن اور نماز سے نہیں بھاگتا، حالانکہ ان دونوں کا درجہ نسبتاً بڑھا ہوا ہے۔ جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کلماتِ اذان میں ایک ایسی عظمت اور ہیبت رکھی ہے جو اس کو خوف زدہ اور مرعوب کر دیتی ہے۔ پھر اذان نماز سے کوئی علیٰحدہ چیز نہیں بلکہ نماز کا مقدمہ ہے، ہاں اتنی بات البتہ ہے کہ اس میں عُجب وریا نہیں، بخلاف نماز و تلاوت قرآن کے کہ یہ دونوں اپنی غایتِ فضیلت کی وجہ سے آدمی کو عُجب وریا میں ڈال دیتی ہیں جس سے شیطان کو وسوسہ کا راستہ مل جاتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اذان میں خاصیت رکھی گئی ہے (۱)

حافظ ابن حجرؒ نے بھی اس سلسلہ میں مختلف جواب نقل کئے ہیں، چنانچہ یہ بھی نقل کیا ہے کہ شیطان اس لئے اذان سے بھاگتا ہے کہ قیامت کے دن مؤذن کے حق میں گواہی نہ دینی پڑے، کیوں کہ جو بھی مؤذن کی آواز سنتا ہے جن ہو یا آدمی مگر اس کو گواہی دینی پڑتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اذان سے متنفّر ہو کر بھاگتا ہے (۲)

---

(۱) اشعۃ اللمعات قلمی ۱/۱۷۶۔ (۲) فتح الباری ۲/۵۸۔

مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک مجرم جتنا تھانیدار اور سپاہیوں سے ڈرتا ہے منصف اور جج سے نہیں ڈرتا، جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ چور یا جو بھی مجرم ہوتا ہے وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ یہاں ذرا بات بگڑی پٹائی شروع ہو جائے گی، مگر کمرۂ عدالت میں یہ بات نہیں ہے، وہ قانون کے تحت میں فیصلہ لکھے گا اور پھر اس پر عمل ہوگا، حالاں کہ سب کو معلوم ہے اپنے عہدہ میں منصف اور جج تھانیدار اور سپاہی سے بہت اونچے عہدہ کا مالک ہے۔

اذان شعارِ دین ہے

اذان اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے دین کا شعار قرار پائی اور ایسا شعارِ دین کہ اگر کوئی آبادی اسے ترک کرڈالے تو اس سے قتال اور جہاد کا شریعت حکم دیتی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں :-

ان الاذان شعار الاسلام و	بلاشبہ اذان شعار اسلام ہے اور
انہ لایجوز ترکہ و ان	اس کا ترک جائز نہیں ہے اور اگر
اھل البلد اجتمعوا علیٰ ترکہ	اہلِ شہر اس کے ترک پر اجماع کرلیں
کان للسلطان قتالھم علیہ۔	تو سلطان ان سے لازمی طور پر
(فتح الباری ۲/۶۱)	قتال کرے گا۔

ترکِ اذان پر قتال کا حکم بے وجہ نہیں ہے، ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں :

لما یلزم الاجتماع علیٰ ترکہ من	ترکِ اذان پر اتفاق چوں کہ ان

استخفافهم بالدین بخفض	کی طرف سے دین کا استخفاف ہے
اعلامہ لان الاذان من اعلام	اور دین کے علم کو گرانا ہے اس لئے
الدین۔ (فتح القدیر ۱/۹۳)	کہ اذان دین کی نشانیوں میں ہے

ترکِ اذان باعثِ قتال ہے

اور کھلی بات ہے جو دین کی نشانی کو مٹائے اور دین کی خفت پر اُتر آئے اس کو دین سے تعلق اَب باقی نہ رہا، لہذا وہ اسی قابل ہے کہ اس پر اسلامی فوج ٹوٹ پڑے۔

بعض علماء نے لکھا ہے، اذان چھوڑنے کی صورت میں پہلے اہلِ شہر کو زدوکوب کیا جائے گا اور قید۔ اور ابھی جو نقل کیا گیا اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس پر اسلامی فوج بھیجی جائے گی، مطلب یہ ہے کہ اگر وہ قبضہ میں ہوں اور دباؤ قبول کریں تو پہلے ضرب و حبس کو عمل میں لایا جائے گا اور خدا نخواستہ اس پر بھی سرکشی پر قائم رہیں اور اذان کے حکم کو قبول نہ کریں تو پھر جہاد کرکے اس کو قبضہ میں لانے کی سعی کی جائے گی اور سزا دی جائے گی۔

فان المقاتلة انما تکون عند	مقاتلہ اس وقت ہے جب وہ حکم
الامتناع وعدم القهر والضرب	نہ قبول کریں دباؤ سے باہر ہوں
والحبس انما یکون عند	اور دباؤ میں جب ہوں تو مار پیٹ
قهرهم فجاز ان یقاتلوا	اور قید کرنا ہے اور جب بات
اذا امتنعوا عن قبول الامر	کے ماننے اور اذان کے دینے
بالاذان ولم یسلموا	سے انکار کریں اور ماتحتی قبول

انفسھم فاذا قوتلوا فظھر علیھم ضربوا وحبسوا۔ (فتح القدیر ۱/۹۳)

نہ کریں تو قتال جائز ہے، قتال کے بعد جب غلبہ حاصل ہوگا تو ان کو پیٹا جائے گا اور قید کیا جائے گا۔

✲ ✲ ✲

معلوم ہوا، اس شعارِ دین کو جو اگرچہ سنتِ مؤکدہ ہے، قائم ودائم رکھنا نہایت ضروری ہے اور اس کا ترک اجتماعی طور پر کسی وقت بھی جائز نہیں ہے۔

مؤذّن کی حیثیّت

جس شعارِ اسلام کی اہمیّت کا یہ عالم ہے بلاشبہ جو ان کلمات کو رات دن ادا کرے گا اس کا رتبہ بھی بلند ہوگا، بلال حبشیؓ کو تاریخِ اسلام میں جو مرتبہ حاصِل ہے اس سے کون واقف نہیں۔ مگر معلوم ہے یہ کون تھے؟ مسجد نبویؐ کے خاص مؤذن تھے، یہ جب کلماتِ اذان پکارتے تو آواز میں غضب کی تاثیر ہوتی جو دلوں پر بجلی کا کام کرتی تھی، صحابۂ کرامؓ کی جماعت میں ان کی بڑی قدر ومنزلت تھی، مؤذّن کی حیثیت ان حدیثوں میں ملاحظہ کیجئے:-

المؤذن اطول الناس اعناقاً یوم القیامة رواہ مسلم (مشکوٰۃ)

مؤذن قیامت کے دن لوگوں میں بلند گردن ہوگا،

لایسمع مدی صوت المؤذن جن ولا انس ولا شئ الا شھد لہ یوم القیامة۔ (بخاری)

جو بھی جہاں اذان کی آواز سنتا ہے، جن ہو یا انسان یا کچھ اور مگر وہ قیامت کے دن مؤذن کے لئے گواہی دے گا۔

المؤذن يغفرله مد ىٰ صوته ويشهد له كل رطب ویابس وله اجر مثل من صلّٰی۔ (مشکوٰۃ)	جہاں تک آواز جاتی ہے مؤذن کے لئے وہ مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور ہر تر، خشک اس کی گواہی دیں گے اور اس کو نمازی کے برابر اجر ملے گا (جو اس کی آواز پر آتے ہیں)

⁂ ⁂ ⁂

مؤذّن جس طرح اذان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا اعلان کرتا ہے اور اس کی وحدانیت کا ترانہ گاتا ہے، اسی طرح کا اس کو اجر بھی اللہ رب العزت مرحمت فرمائیں گے کہ قیامت کے دن یہ تمام پر بلند ہوگا، اس کو امتیازی شان حاصل ہوگی اور وہ ساری کائنات جس نے اس کی آواز سن لی ہے اس کے حق میں گواہی دے گی، یہ وہ اجر ہے جو حدیثوں میں مذکور ہے اور شاید اللہ تعالیٰ ان کے علاوہ بھی عظیم الشان بدلہ عطا کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

لو یعلم الناس ما فی النداء والصف الاول ثم لم یجدوا الا ان یستھموا علیہ لاستھموا۔ رواہ البخاری ومسلم (١)	صفِ اوّل اور اذان دینے کی فضیلت لوگوں کو معلوم ہو جائے تو قرعہ کی نوبت آئے تو بھی حاصل کریں۔

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اگر مؤذّن نے حسبۃً لِلّٰہ خوشنودیٔ الٰہی کی خاطر کچھ دنوں مسلسل اذان دی تو اس کو دوزخ کی آگ سے خلاصی مل جائے گی۔

---

(١) مشکوٰۃ۔

من اذن سبع سنین محتسباً کتب لہ براءۃ من النّار (مشکوٰۃ)

حسبۃً لِلّٰہ جو شخص سات سال اذان دے گا اس کے لئے دوزخ سے برأت لکھ دی جائے گی۔

اذان پر اُجرت

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اذان پر اُجرت قبول نہ کرنی چاہیئے حدیث میں صراحۃً بھی آیا ہے کہ مؤذّن اس کو رکھو جو اذان پر اُجرت نہ لے (۱)۔

یہیں یہ مسئلہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اذان کی اُجرت کے متعلق فقہاء اور علماء کا کیا فیصلہ ہے اور اسی کے ضمن میں امام کے مشاہرہ کے متعلق بھی بات طے ہو جائے۔

مؤذّن کے متعلق ابھی گذرا کہ ایسا ہو جو اپنا بدلہ خدا سے چاہتا ہو، آدمی سے نہ وصول کرے اور اسی پر آگ سے برأت کی خوشخبری ہے۔

متقدمین نے عبادات پر اُجرت کی اجازت نہیں دی ہے اور متأخرین نے حالات کے پیشِ نظر اجازت دی ہے۔ دونوں جماعتیں اپنے زمانہ کے حالات و واقعات سے متأثر ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ متقدمین کا فیصلہ مشکوٰۃِ نبوّت کی روشنی میں زیادہ انسب ہے مگر دین سے جب بے رغبتی بڑھ گئی اور علماء نے دیکھا کہ اُجرت کی اجازت نہیں دی جاتی تو رہا سہا دین بھی جاتا رہے گا، دوسرے معاوضہ کی

---

(۱) ابوداؤد باب اخذ الاجر علی التاذین۔

شکل بڑی حد تک جواز کے حدود میں آتی ہے تو اجازت دے دی، شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر ایک جامع تحریر لکھی ہے، فرماتے ہیں:-

"امامت، اذان اور خطبہ دینے پر اُجرت قبول کرنے میں علماء کا اختلاف ہے، ایک جماعت کہتی ہے یہ سب امورِ عبادات میں داخل ہیں اور عبادات پر معاوضہ ثواب کے لئے مبطل (ضائع کردینے والا) ہے، لہٰذا جائز نہیں ہوسکتا، دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ ان خاص عبادات (نفس عبادت) پر اُجرت نہیں لی جاتی ہے بلکہ یہ اُجرت تو اس لئے ہے کہ ان کو مخصوص مقام اور متعیّن وقت میں بہ پابندی ادا کرایا جاتا ہے اور یہ مسلّم بات ہے کہ جگہ اور وقت کی خصوصیّت عبادت نہیں ہے اور نہ یہ شرط عبادت میں داخل بلکہ یہ بالکل خارج چیز ہے۔ لہٰذا اُجرت اس پابندی پر جائز ہوگی، اور تحقیق یہ ہے کہ سابق زمانہ میں ائمہ، مؤذنین اور خطیب ان کاموں کو حسبۃً للّٰہ انجام دیتے تھے، چنانچہ یہ کام قاضی، مفتی، محتسب اور عامل بھی کرتے تھے اور لوجہ اللہ کرتے تھے، خلفاءِ راشدین اور منصف سلاطین نے دیکھا کہ ایک جماعت نے اپنی خدمت ان عبادات کے لئے وقف کر رکھی ہے تو ان کے لئے بقدرِ معاش بیت المال سے وظیفہ جاری کردیا، جو بطورِ امداد و اعانت جاری ہوا، معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہ ہوا تھا، لیکن بتدریج یہ شعبہ بھی شعبۂ معاش بن گیا اور امداد و اعانت، معاوضہ اور اُجرت میں تبدیل ہوگئی، اسی وجہ سے یہ ذریعۂ معاش اس موجودہ دَور میں مشکوک بلکہ قریب بہ حرمت

ہے، حتی المقدور اس سے احتراز لازم ہے"(۱)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات لکھی ہے اس کا ماحصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اب بھی معاوضہ اور اُجرت کے نقطۂ نظر سے نہ دے بلکہ امداد و اعانت کے طور پر دیا جائے تو جائز ہے مگر حالات کے پیشِ نظر احتراز اولیٰ ہے۔

علامہ ابن عابدینؒ "ردّ المحتار" میں لکھتے ہیں:-

"اگر اذان و امامت وغیرہ کی وجہ سے امام و مؤذن وغیرہ دوسرے ذریعۂ معاش سے محروم ہیں تب توان کے لئے بقدر ضرورت لینا جائز ہے اور اگر یہ ذمّہ داریاں دوسرے ذریعۂ معاش میں حارج نہیں ہیں تو مشاہرہ قبول نہ کرنا چاہیئے"(۲)

موجودہ دَور میں اذان

اس بحث سے یہ معلوم ہوا کہ مؤذّن کو حتی الوسع اُجرت سے بچنا چاہیئے مگر کیا کیا جائے ہمارے زمانہ میں اذان دینا کسرِ شان ہے۔ بڑے لوگ اذان دینے میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں، اگر یہ بات نہ ہوتی تو با مشاہرہ مؤذن کی نوبت ہی نہ آتی، خوشحال لوگوں نے دین غریبوں کو بخش دیا ہے اور خود بریٔ الذمہ ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ جس اذان اور اذان دینے والے کی اتنی عظمت ہو، دین کے ماننے والے اس کو عار سمجھیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ حالانکہ

---

(۱) تفسیر عزیزی (فتح العزیز) پارہ اول ص۱۲۸۔

(۲) ردالمحتار ج ۵۔

یہ وہ مرتبہ ہے جو پہلے زمانہ میں بڑے بڑے علماء اور ذی ثروت اصحاب نے بخوشی قبول کیا ہے اور اسی میں اپنی پوری زندگی گذار دی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بحث ہے کہ اذان دی یا نہیں، ایک جماعت کہتی ہے کہ آپؐ نے خود بھی اذان دی ہے اور ترمذیؒ کی روایت اس کی شہادت میں پیش کرتے ہیں۔ اس جماعت میں نوویؒ اور سہیلیؒ جیسے بزرگ ہیں، اگرچہ صحیح یہی ہے کہ آپؐ نے بذاتِ خود اذان نہیں دی ہے۔ ترمذیؒ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کے حکم سے بلالؓ نے اذان دی، مسند احمدؒ میں یہ واقعہ مصرّح ہے (۱) پھر بھی یہ بات تو نہیں ہے کہ آپؐ نے مؤذّن کے لئے فضائل نہ بیان کئے ہوں بلکہ دعاء فرمائی ہے:۔

اَللّٰھُمَّ ارشد الائمۃ واغفر للمؤذنین (۲)	اے اللہ امام کو رشد و ہدایت عطا فرما اور مؤذّنوں کو بخش دے

اور مؤذّن کے رتبہ کا بیان خود آپؐ کی زبانِ مبارک سے پہلے گذر چکا۔

اذان کا جواب

اس مرتبہ کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام نے یہ پسند نہ کیا کہ کوئی اس سے محروم رہے بلکہ سب اس کا ثواب حاصل کرلیں اور اپنی زبان سے دُہرا کر ہدایتِ الٰہی کے قبول کرنے کا اقرار کریں، چنانچہ آنحضرت

(۱) شرح سفر السعادت صفحہ ۴۰۴ واشعۃ اللمعات قلمی ۱/۱۷۴۔

(۲) ابوداؤد باب مایجب علی المؤذن۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمات کو دہرانے کی ترغیب دی ہے اور فرمایا ہے کہ جو دل سے ان کلمات کو دہرائے گا جنت میں داخل ہوگا (۱)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلعم کے ساتھ تھے حضرت بلالؓ نے کھڑے ہو کر اذان پکاری، جب اذان ہو چکی تو آپؐ نے فرمایا:-

من قال مثل هٰذا يقينا	جو یقین کے ساتھ اسی طرح کہے
دخل الجنة (۲)	جنت میں داخل ہوگا۔

اذان کے بعد دعاء

اسی طرح آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو اذان سن کر دہرائے پھر اس کے بعد دعائے ماثورہ پڑھے اس کے لئے بڑا درجہ ہے اور اُمید ہے کہ وہ میرے ساتھ جنّت میں ہوگا (۳)

اذان کے تمام کلمات تو ہو بہو وہی کہے جائیں گے، صرف حیَّ علی الصَّلوٰة اور حیَّ علی الفلاح کے جواب میں لَاحول وَلَا قوۃَ اِلَّا بِاللہ کہے گا اور صبح کی اذان میں حیَّ علی الفلاح کے بعد دو مرتبہ الصلوٰۃ خیر من النّوم کہا جاتا ہے۔ اس کے جواب میں سننے والا "صَدَقْتَ وَبَرَرْتَ وَبِالْحَقِّ نَطَقْتَ" کہے گا۔

یہ جواب ہر وہ شخص دے گا جس کے لئے کوئی مانعِ شرعی نہ ہو، جیسے پائخانہ میں نہ ہو، جماع کرتا نہ ہو، پیشاب کرتا نہ ہو اور اسی

---

(۱) مسلم و ابوداؤد باب مایقول اذا سمع المؤذن۔

(۲) مشکوٰۃ باب الاذان۔ (۳) مسلم شریف۔

طرح نماز میں نہ ہو وغیرہ وغیرہ، جب اس سے فارغ ہو کر پاک ہو لے تو کہہ سکتا ہے، معذورین میں خطبہ سننے والا، تعلیم و تعلّم میں مشغول، کھانا کھانے والا، حیض و نفاس میں مبتلا عورت بھی داخل ہے، ان پر جواب ضروری نہیں۔

کلماتِ اذان کی طرح اقامت (تکبیر) کے کلمات بھی دُہرائے جائیں گے، وہاں "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ" کے جواب میں کہا جائے گا اَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا[1]۔

آپ نے دیکھا کلماتِ اذان واقامت کی کتنی فضیلت ہے، اور ان کلمات پر غور کیجئے تو ان کی عظمت کا اور بھی یقین راسخ ہوتا چلا جائے۔

آدابِ اذان

اس دعوتِ اجتماع میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اب کچھ آداب بھی لکھے جاتے ہیں، جن سے اس کی اہمیّت پر روشنی پڑے گی۔

(۱) کلماتِ اذان ٹھہر ٹھہر کر کہے جائیں گے اور کلماتِ اقامت جلد جلد، مگر جملوں کی ادائیگی میں ایسی جلدی نہ ہو کہ تلفظ بگڑ جائے۔
(۲) مؤذن کے لئے ضروری ہے کہ وہ نماز کے مستحب اوقات اور سمتِ قبلہ سے واقف ہو۔ (۳) اذان پکارنے میں اتنا نہ چیخے کہ حلق کو نقصان پہنچے۔ (۴) اگر کوئی اس کی عدم موجودگی میں اذان پکار دے تو غصہ

---

[1] ابوداؤد باب مایقول اذا سمع الاقامۃ۔۱۲

نہ ہو۔ (۵) اذان خوش آوازی سے پکارے مگر لحن کی حد کو نہ پہنچے (۶) اذان حسبۃً لِلّٰہ دے، کسی پر احسان نہ جتلائے نہ معاوضہ لے (۷) نیکی اور بھلی بات کا حکم دے اور ناپسندیدہ باتوں سے منع کرے اور کلمۂ حق کے کہنے میں امیر و غریب کا امتیاز نہ کرے (۸) امام کا اس قدر انتظار کرے جو قوم کے لئے گراں نہ ہو (یعنی وقتِ مقررہ کے بعد) (۹) مسجد میں کوئی اس کی جگہ پر بیٹھ جائے تو غصّہ نہ ہو (۱۰) اذان و تکبیر کے درمیان اتنی لمبی نماز نہ پڑھے کہ نمازی گھبرا جائیں (۱۱) مسجد کی ہر طرح حفاظت کرے (۱۲) مؤذّن مرد ہو، عاقل ہو اور مسائلِ ضروریہ سے واقف ہو (۱۳) متقی اور دیندار ہو (۱۴) لوگوں کے حالات سے واقف ہو اور جماعت میں شریک نہ ہونے والوں کو تنبیہ کر سکے مگر اس وقت جب کہ اذیّت کا خوف نہ ہو (۱۵) بلند آواز ہو (۱۶) اذان پابندی سے دے (۱۷) اذان اونچی جگہ سے پکاری جائے تاکہ آواز دور تک جا سکے (۱۸) مسجد میں اذان نہ دی جائے، مأذنہ ہو تو اس پر چڑھ کر ورنہ خارجِ مسجد سے (۱۹) اذان الفاظِ ماثورہ کے ساتھ عربی زبان میں دی جائے، کوئی لفظ بڑھنے نہ پائے (۲۰) غیر عربی میں اذان نہیں دی جا سکتی (۲۱) اذان اور تکبیر میں منھ قبلہ کی جانب ہو، ترکِ قبلہ مکروہ ہے (۲۲) حیّ علی الصّلوٰۃ پر دائیں اور حیّ علی الفلاح پر بائیں طرف چہرہ پھیرے مگر اس طرح کہ قدم اپنی جگہ جمے رہیں۔
(۲۳) دونوں کانوں میں دونوں ہاتھ کی شہادت کی انگلی ڈالے۔۔۔۔۔ (۲۴) اذان اور تکبیر میں فصل نہ کرنا مکروہ ہے (۲۵) ان دونوں کے درمیان کم از کم دو رکعت یا چار رکعت کی مقدار فصل کرنا چاہیئے، اور ہر

رکعت کی مقدار اتنی ہو کہ دس آیتیں پڑھی جا سکیں (۲۶) اذان میں بات چیت نہ کرے ورنہ پھر سرے سے کہنی ہو گی (۲۷) اذان نماز کے اوّل وقت میں پکاری جائے تاکہ نمازی آسانی سے مسجد آسکیں۔
(۲۸) اذان کے بعد نمازیوں کا انتظار کیا جائے گا مگر محلہ کے باثروت اور رئیسوں کا انتظار نہ کیا جائے گا (۲۹) اذان پنج وقتہ فرائض اور جمعہ کی نماز کے لئے دی جائے گی، نوافل، سنن و واجبات اور دوسری نمازوں کے لئے اذان نہیں ہے (۳۰) کھڑے ہو کر اذان پکاری جائے، بیٹھ کر اذان دینا مکروہ ہے (۳۱) سوار کی اذان مکروہ ہے مگر یہ کہ وہ مسافر ہو (۳۲) ایک مؤذن ایک ہی مسجد میں اذان دے، ایک کا متعدّد مسجدوں میں اذان دینا مکروہ ہے (۳۳) مغرب کی اذان کے بعد تین چھوٹی آیت یا ایک بڑی آیت کے مقدار ٹھہرا جائے (۳۴) اذان کے کلمات میں تقدیم و تاخیر ہو جائے تو ترتیب ٹھیک کر لی جائے گی[۱] (۳۵) مشہور ہے کہ اذان نماز کے لئے مسجد میں بائیں جانب سے ہو اور اقامت (تکبیر) داہنی طرف سے۔ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں (۳۶) بعض لوگ اذان دینے والے کے سامنے سے یا دعا کرنے والے کے سامنے سے گزرنا ناجائز سمجھتے ہیں، اس کی کچھ اصل نہیں (۳۷) شہادت کی انگلیوں کو کانوں کے سوراخ میں ڈالنے کی جگہ صرف کان کے اوپر رکھ لینا کافی نہیں[۲]۔

---

[۱] تنبیہ الغافلین للفقیہ ابی اللیث و عالمگیری باب الاذان و فتح القدیر لابن الہمام باب الاذان سے ماخوذ۔ ۱۲

[۲] اغلاط العوام مصنفہ مولانا تھانویؒ کے الفاظ ہیں۔ ۱۲

قدرتی نظامِ وحدت

نظمِ جماعت کا نفع تشنۂ تکمیل رہ جاتا اگر اس کی شیرازہ بندی عمل میں نہ آتی، مگر حضرت حق جلّ مجدہٗ کی حکمتِ بالغہ ایسا کیوں کر کر سکتی تھی، چنانچہ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کی تکمیل جیسی چاہیئے تھی ربُّ العزّت نے فرمادی، اور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس کے ایک ایک شعبہ کو اُجاگر اور مستحکم فرمادیا اور اس طرح امامتِ صغریٰ کے سلک گہر میں نظمِ جماعت کو منظم و منضبط کر کے امامتِ کبریٰ کی شاہراہ قائم فرما گئے تاکہ دینی نظام سے دن رات دنیاوی نظامِ حیات کا سبق تازہ ہوتا رہے اور منتشر اور پراگندہ افراد کو اجتماعی زندگی کی پوری مشق ہو جائے۔

نظامِ وحدت اور یکجہتی کی جو مثال مسجدوں کے اس دینی نظام میں ملحوظ رکھی گئی ہے کہیں اور نہیں مل سکتی، توحید کا نظارہ اور اس کی نورانی شعائیں جو یہاں پائی جاتی ہیں وہ آئندہ تفصیل سے معلوم ہو سکیں گی۔

امامت و اجتماعیت

مسجدوں کے اس قدرتی نظام میں جو مضبوطی اور استحکام ہے

اور اجتماعی زندگی سے کٹ کر انفرادی زندگی کے خوگر رہنے کو جس طرح عملی طور پر روکا گیا ہے وہ اپنی

آپ مثال ہے۔ کوئی ایسا سوراخ باقی نہیں چھوڑا گیا ہے جہاں سے متفردانہ زندگی کا چشمہ پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم نافذ فرما دیا ہے کہ کہیں تین یا دو شخص بھی ہوں تو بھی ان میں سے ایک کو اپنا امام منتخب کر لیا جائے۔

اذا کانوا ثلٰثۃ فلیؤمھم احدھم واحقھم بالامامۃ اقرأھم۔ (۱)	تین ہوں تو بھی ان میں کے ایک کو امامت کرنی چاہیئے اور حقِ امامت بڑے عالم کو ہے۔

تین کی قید اتفاقی ہے، مطلب یہ ہے کہ جب ایک سے زیادہ ہوں تو لوگوں کو چاہیئے کہ ایک کو پیشوا منتخب کر لیں اور اس کو منتخب کریں جو قرآن اور دین کا زیادہ علم رکھتا ہو، حضرت مالک ابن الحویرث رضؓ ایک مرتبہ اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے، سفر کے تذکرہ پر آپ نے ان کو حکم فرمایا:۔

اذا سافرتما فاذنا واقیما ولیؤمکما اکبرکما۔ (بخاری)	تم دونوں جب سفر کرو تو سفر میں نماز کے لئے اذان پکارو، اقامت کہو اور جو بڑا ہو امامت کرے۔

نظامِ وحدت کا استحکام

پیشوا بنایا جائے تو اس طرح کہ اس کی ہر حرکت وسکون کی پیروی کی جائے، وہ جب مالک حقیقی کے روبرو مناجات کرے تو

(۱) مسلم ۱/۲۳۶ باب من احق بالامامۃ۔

سب کے سب خاموشی سے ہمہ تن گوش ہو کر سنیں اور باادب سیدھے کھڑے رہیں، وہ جب اس کی باعظمت ربوبیّت کے آگے جھکے تو بے چون وچرا سب جُھک جائیں اور اس کی عظمت و ربوبیت کا بار بار اقرار کریں اور وہ جب پھر سر اُٹھا کر سجدے میں گر جائے تو بلا پس وپیش ایک ایک فرد اپنی اپنی اونچی پیشانی اس کے آگے ڈال دے اور اپنی عاجزی اور اس کی صفتِ علو کا عملی طور پر اعلان کرے۔ مختصر یہ کہ باضابطہ اس کی پیروی کی جائے کیونکہ ارشادِ نبوی ؐ ہے :-

انما جعل الامام لیؤتم به۔ (۱)	امام تو بس اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

پیروی اور اقتدار نام ہی اس کا ہے کہ امام جو بھی کرے ہو بہو اس کی پیروی میں وہی مقتدی اور پیرو کار بھی کرے، اپنے امام سے پہلے کوئی بھی مقتدی جنبش نہیں کر سکتا اور نہ کسی حرکت وسکون میں اس کی مخالفت کی اس کو گنجائش ہے۔

لا تبادروا الامام اذا کبر فکبروا اذا قال ولا الضالین فقولوا اٰمین واذا رکع فارکعوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ۔	امام پر سبقت نہ کرو، جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور جب وہ وَلَا الضَّالِّين کہے تو آمین کہو اور جب وہ رکوع کرے تو رکوع کرو اور جب سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہو۔

(مسلم ۱/۱۷۷ باب ائتمام الماموم بالامام)

---

(۱) بخاری باب انما جعل الامام الخ

نظامِ وحدت کی مخالفت

خدانخواستہ کسی نے اگر امام کی کسی حرکت وجنبش میں مخالفت کی یا اس پر کسی رکن وغیرہ کی ادائیگی میں سبقت کی تو پھر وہ اصولاً متبعین اور مقتدیٔین کی جماعت سے کٹ گیا اور اپنی اس بے باکانہ روش سے خطرے میں گھر گیا اور عذابِ الٰہی کو اس نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، کسی اور کا نہیں بلکہ سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

امایخشی الذی یرفع رأسہ	جو امام سے پہلے اپنا سر اٹھاتا ہے
قبل الامام ان یحول رأس	کیوں وہ اس سے نہیں ڈرتا کہ
حمار۔	اس کا سر گدھے کے سر میں تبدیل
(مسلم باب تحریم سبق الامام الخ ۱/۱۸۱)	کر دیا جائے۔

جرم بظاہر اتنا معمولی مگر سزا اتنی بڑی؟ بلاشبہ اس نے احترامِ قانون پسِ پشت ڈال دیا اور یکجہتی اور نظامِ وحدت میں خلل انداز ہو گیا جو اپنی نوعیت میں معمولی ہونے کے باوجود بڑا جرم ہے، کیونکہ اس نے اپنی پیشانی ربّ العزت کے قانون سے نکال کر شیطان کے ہاتھوں میں دے دی۔

الذی یرفع رأسہ اویخفضہ	جو مقتدی اپنا سر امام سے پہلے
قبل الامام فانما ناصیتہ	اٹھاتا یا جھکاتا ہے تو بلاشبہ اس
بید الشیطان رواہ مالك۔	کی پیشانی شیطان کے ہاتھ میں
(مشکوٰۃ)	ہے۔

اس عنوانِ قباحت سے بڑھ کر اور کیا روک تھام کی کوشش ہو سکتی ہے، اس قباحت وشناعت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ نظامِ وحدت کی اہمیّت کا احساس خوب ذہن نشیں ہو جائے اور اس احساس کی تازگی کے ساتھ استحکام نماز کی پوری جد و جہد جاری رکھی جائے تاکہ اس کا فائدہ ظاہراً باطناً ہر طرح نمایاں ہو سکے، کیوں کہ بہت سے فوائد کا دارو مدار محض اس یکجہتی اور امام کی کامل اقتداء میں مضمر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی زندگی میں اس کی پوری نگرانی فرمائی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ نے ایک دن ہم لوگوں کو نماز پڑھائی، نماز جب ختم ہو چکی تو ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، اے لوگو! رکوع، سجدہ، قیام اور انصراف میں سبقت (پہل) نہ کرو، میں تم کو اپنی پشت کی طرف سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جس طرح سامنے سے (۱)

اس تاکید کی انتہا ہے کہ حالتِ نماز میں بھی مقتدیوں کی چوک سے غافل نہیں رہتے اور پھر ان پر اس راز کو منکشف فرماکر حقوقِ نماز اور فرائضِ اقتداء کی تاکید فرماتے ہیں، کیوں بغیر کسی شرعی رمز کے یہ سب کچھ تاکیدیں ہو رہی ہیں، نبی کی نگاہ سے بڑھ کر دوربین انسانوں میں اور کس کی نگاہ ہو سکتی ہے۔ اور بالخصوص خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی، بس یہی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس شرعی اقتداء میں بے انتہاء دینی اور دنیوی فائدے ہیں۔

---

(۱) مسلم ۱/۱۸۰ باب تحریم سبق الامام برکوع او سجود ونحوہما۔

امام پر سبقت اور اس کی ممانعت

صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم نے آپؐ کے ان ارشادات اور ان کی حکمتوں کو خوب سمجھا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اس ہدایت پر پورا پورا عمل کیا۔ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز اس طرح پڑھتے تھے کہ آپؐ جب "سمع اللہ لمن حمدہ" رکوع سے اٹھتے ہوئے فرماتے تو ہم سیدھے کھڑے ہو جاتے اور اس وقت تک اپنی پیٹھ سجدہ کے لئے نہیں جھکاتے جب تک آپؐ اپنی پیشانی زمین پر نہ رکھ لیتے (۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے امام پر پہل کی، یہ دیکھ کر اس سے فرمایا تو نے نہ تنہا نماز پڑھی نہ امام کے ساتھ، پھر آپؓ نے اس کو سزا دی اور فرمایا نماز لوٹا لو (۲)

رحمتِ عالم صلعم کی پیشین گوئی

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ وہ نماز پڑھیں گے مگر ان کی نماز نماز نہ ہو گی"۔ اس حدیث کے بعد فرماتے ہیں:-

---

(۱) مشکوٰۃ عن البخاری و مسلم۔

(۲) کتاب الصلوٰۃ للامام احمد صہ۳۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ زمانہ میرا ہی زمانہ نہ ہو، میں نے سیکڑوں مسجدوں میں نماز پڑھی ہوگی مگر کہیں بھی نہ دیکھا کہ اہل مسجد نماز اس کے پورے حقوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں یا نماز میں وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ سے ثابت ہیں، پس اے نمازیو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی نماز خوب سنبھل کر پڑھو اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کی نماز کا خیال رکھو کہ ان کی نماز مع حقوق ادا ہو سکے، سن لو! اگر کوئی خود خوب اچھی نماز پڑھتا ہے اور اس کے سارے حقوق کا لحاظ بھی رکھتا ہے مگر وہ دیکھتا ہے کہ ایک دوسرا شخص اپنی نماز پورے حقوق کے ساتھ نہیں ادا کرتا، وہ اپنے امام پر حرکت وسکون میں پہل کرتا ہے پھر بھی وہ خاموشی اختیار کرلیتا ہے، اس کو اس کی غلط روی پر نہ ٹوکتا ہے نہ اس کی غلط روی کی قباحت بیان کرتا ہے اور نہ وہ اس کی اصلاح کی سعی کرتا ہے تو وہ بھی بلاشبہ اس کے اس گناہ میں شریک سمجھا جائے گا اور اپنی نماز حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرنے کے باوجود دوسرے کی نماز میں قصوروار ہوگا"(۱)

امام صاحبؒ کے اس بیان کے لب ولہجہ پر بار بار غور کیا جائے اور جس شد ومد سے اس کی اہمیّت ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

---

(۱) کتاب الصلوٰۃ وما یلزم فیہا للامام احمد ص۲۳۔

اصلاحِ امّت

بلاشبہ ہر مسلمان پر اپنی ذمہ داری کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، اس امّتِ مرحومہ کا طغرائے امتیاز ہی یہ بیان کیا ہے کہ ہر بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور ہر ناپسندیدہ کام سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آلِ عمران: ۱۱۰)	تم بہترین امّت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو، کہ تم نیک کاموں کا حکم کرو اور بُرے کاموں سے روکو۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری زندگی اس کا زندہ ثبوت ہے کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب واقف کار کسی غلط روی اور ناجائز امور پر چشم پوشی کرتا ہے تو وہ غلط روی اور ناجائز امور وبا کی طرح پھیل پڑتے ہیں اور اس کا ضرر عام ہو جاتا ہے، جس میں بکثرت لوگ مبتلا ہونے لگتے ہیں۔

پھر یہ مسئلہ اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس کا مؤاخذہ ہر ایک باخبر سے ہوگا، اس نے دیکھ کر بھی اصلاح کی کوشش کیوں نہیں کی، خاموشی کو کیوں راہ دی، یہ ذمہ داری صرف اصطلاحی عالِم پر ہی نہیں عائد ہوتی ہے بلکہ جو مسلمان جتنا بھی جانتا ہے اس پر اسی قدر ذمہ داری آتی ہے ابتدائے اسلام میں دین کی تبلیغ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی جذبہ کے احساس کے ساتھ کی۔ ضرورت ہے کہ یہ سنّت پھر زندہ کی جائے

اور وہ بروئے کار لائی جائے، عوام کی نماز میں جو خامی چلی آرہی ہے اسے ان پر ظاہر کیا جائے اور اس کی شرعی اصلاح کی جائے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ پر قدرے بسط و تفصیل سے (احیاء العلوم میں) بحث کی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی کتاب الصّلوٰۃ میں اس مسئلہ کو کھول کر لکھا ہے۔

جماعت کی ظاہری ہیئت

مختصر یہ کہ امام کی اقتدار بہر نوع کامل ہونی چاہیئے، اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ہونی چاہیئے، ہر مقتدی پر امام کی متابعت اس حد تک ضروری ہے کہ وہ اس سے سرِ مو تجاوز نہیں کر سکتا، اسی وجہ سے یہ حکم ہے کہ مقتدی جب دو یا اس سے زیادہ ہوں تو امام کو آگے بڑھا دیں اور خود پیچھے ایک سیدھ میں کھڑے ہو جائیں اور اس طرح کہ شانہ سے شانہ ملا ہوا ہو، نگاہیں سجدہ گاہ پر جمی ہوئی ہوں، سب کے سب ایک طرح ہاتھ باندھے ہوں، سب کا رخ قبلہ کی طرف ہو، صفیں سیدھی اور ہموار ہوں کہ اگر کوئی صف کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک خطِ مستقیم کھینچنا چاہے تو اس میں ذرا بھی کجی نہ آنے پائے۔

اس ظاہری ہیئت کے ساتھ باطنی ہیئت بھی اچھی سے اچھی ہو، دل پر خشیت و محبّت کا پرتو نمایاں ہو اور یہ محسوس کر رہا ہو کہ گو ہم اپنے آقا کو نہیں دیکھ رہے ہیں لیکن وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

عہدِ نبویؐ میں صفوں کی درستی کا اہتمام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تاکید برابر رکھی اور کبھی بھی صف کی ناہمواری برداشت نہیں فرمائی، بلکہ بذاتِ خود آپؐ نے صفوں کی درستی کا کام انجام دیا ہے، آپؐ کا دستور تھا کہ پہلے صفوں کی ہمواری ملاحظہ فرمالیتے پھر نماز شروع فرماتے، جس کو صف میں ناہمواری کرتے دیکھ لیتے اس پر خفگی کا اظہار فرماتے، چنانچہ ایک دن ایسا ہوا کہ آپؐ نماز کے لئے آئے اور مصلّٰی پر کھڑے بھی ہو گئے تکبیر تحریمہ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ایک شخص پر نظر پڑ گئی جس کا سینہ صف سے نکلا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا:۔

عباد اللہ لتسون صفوفکم اولیخالفن اللہ بین وجوھکم۔	اے بندگانِ خدا! یا تو تم اپنی صفوں کو برابر کرو یا پھر اللہ تعالیٰ تمہارے اندر مخالفت ڈال دیں گے۔

(مسلم ۱/۱۸۲)

جس ظاہری اختلاف سے روکا گیا ہے اگر اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا تو وہی اختلاف اور بعض کا بعض پر تأخر و تقدّم، باطنی اور واقعی تنافرِ قلوب، حدوثِ کینہ اور وحشت و عداوت کا موجب بن جاتا ہے جس کا اثر بڑھ کر شوکتِ اسلام اور نظامِ حیات پر پڑتا ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ جب ایک قانونِ شرعی کی نافرمانی ہوتی ہے تو وہ دلوں کی تاریکی و کدورت کا باعث بن جاتی ہے۔

......

صفوں کی درستی کے فائدے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی صفوں کی درستی کو نظر انداز نہیں فرمایا، آپؐ کا ارشاد تھا کہ تسویۂ صف نماز کے کمال سے ہے صفیں جس قدر سیدھی اور ہموار ہوتی ہیں اور نمازی جتنا مل کر کھڑے ہوتے ہیں، اسی قدر نماز میں کیف و نشاط پیدا ہوتا ہے، اور دلوں میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔

سووا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من تمام الصلوٰۃ (۱)	صفیں درست اور برابر کرو کہ یہ چیز کمالِ نماز سے ہے۔

ایک دفعہ اقامت ہو چکی تھی کہ آپؐ اپنے چہرۂ انور سے صفوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:۔

اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظهری (بخاری)	تم اپنی صفیں ان کے حقوق کے ساتھ کھڑی کرو، کیوں کہ میں تم کو اپنے پیچھے کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں۔

اس قدرتی نظام میں اس کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مقتدی ایک منظم فوج کی طرح اپنے امام کی ماتحتی میں کھڑے ہوں، جو امام کے ایک ایک اشارہ کی پابندی کریں، ساتھ ہی اس دینی فوج میں جو احکم الحاکمین کی اطاعت میں صف بستہ ہے کوئی انتشار، پراگندگی، شور و ہنگامہ اور نظم و ضبط کے خلاف معمولی بات بھی پائی

---

(۱) مسلم ۱/۱۸۲۔

نہ جائے تاکہ شیطان کو خوشی اور حملہ کا کوئی رخنہ نظر نہ آئے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ (الصف:۴)	اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خاص طور پر پسند کرتا ہے جو اس کے راستہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

کہیں سے بھی یہ نظر نہ آئے کہ اس سیسہ پلائی ہوئی دیوار میں کوئی نقص ہے اور ان کا کوئی فرد اپنے امیر اور کمانڈر کے حکم کے ذرّہ برابر خلاف ہے تاکہ اس طرح باطن اور بھی گھٹ جائے اور امیر کو ہرگز ہرگز یہ کہنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

مالی اراکم عزین۔ (مسلم ۱/۱۸۱)	کیا بات ہے کہ تم کو بٹا ہوا دیکھتا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک بات کھول کر بیان کر دی ہے اور عملی تعلیم دے کر امّت کے لئے شاہراہ قائم فرما گئے ہیں۔ ارشاد فرمایا:-

استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم۔ (مسلم ۱/۱۸۱)	برابر کھڑے ہو، اختلاف نہ ہو کہ اس کا اثر تمہارے دلوں پر پڑے گا۔
ایاکم وھیشات الاسواق۔ (ایضاً)	صف بندی میں بازار کے سے شور و ہنگامہ سے بچو۔
رصوا صفوفکم وقاربوا وحاذوا بالاعناق فوالذی نفسی بیدہ انی اری الشیطان یدخل من خلال الصف۔	تم اپنی صفوں کو خوب درست کرو مل مل کر کھڑے ہو اور شانہ سے شانہ ملا رکھو! بخدا میں شیطان کو صفوں کے شگاف میں گھستے دیکھتا ہوں۔

(ابوداؤد باب ماجاء فی تسویۃ الصفوف)

ان سارے مسائل پر غور و فکر کی نظر دوڑا جائیں، اور ان کی دینی اور دنیاوی حکمتوں کو تلاش کر جائیں تو پتہ چلے کہ ان شرعی قوانین میں کتنے بے شمار فوائد مضمر ہیں۔

امام کی قربت

صفوں میں شریعت نے ترتیب کا لحاظ رکھا ہے کہ امام سے جو جس قدر قریب ہوگا وہ اسی اعتبار سے فضائل کا مستحق قرار پائے گا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ نزولِ رحمت کی ابتدار امام سے ہوتی ہے اور وہ بڑھ کر ساری صفوں کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

اذا انزلت الرحمة علی اھلی المسجد	اہلِ مسجد پر نزولِ رحمت کی ابتدار
بدأت بالامام ثم اخذت یمینا	امام سے ہوتی ہے، پھر وہ دائیں
ثم عطفت علی الصفوف (۱)	اور پھر تمام صفوں پر متوجہ ہوتی ہے

معلوم ہوا صف اوّل کو جو امام کے قریب ہوتی ہے دوسری صفوں پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ صفِ اوّل کو کیا مرتبہ حاصل ہے تو پھر وہ جس طرح بھی ہو سکے، صفِ اوّل ہی میں جگہ کے حصول کی کوشش کریں۔

لو یعلم الناس ما فی النّداء	لوگوں کو اذان اور صفِ اول
والصف الاوّل ثم لم	کی حیثیت کا علم و یقین ہو جائے
یجدوا الاّ ان یستھموا	تو وہ اس کے حصول کی جدوجہد

---

(۱) کنز العمال ۴/۱۲۱۔

علیہ لاستھموا (مسلم باب تسویۃ الصفوف ۱/۱۸۲) — کریں، چاہے قرعہ اندازی ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔

امام کے قریب کون لوگ ہوں

امام سے قریب ان لوگوں کو کھڑے ہونے کو کہا گیا ہے جن لوگوں میں نیابت کی پوری صلاحیت پائی جاتی ہے تاکہ ضرورت کے وقت امام کی جگہ اس کے فرائض وہ انجام دے سکیں، حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، ارشادِ نبویؐ ہے:

لیلنی منکم اولوالاحلام والنھی ثم الذین یلونھم ثلاثاً۔ (مسلم ۱/۱۸۱) — میرے قریب تم میں کے ذی ہوش اور صاحبِ علم وفضل کو رہنا چاہیئے اور پھر جو ان کے قریب ہوں۔

شاید یہ بھی مقصد ہو کہ ایسا شخص امام سے (جو سب میں زیادہ ذی علم ہوتا ہے) طریقۂ نماز اور دوسرے مسائل بآسانی اخذ کرسکے گا یا اور اس طرح کے دوسرے فوائد بھی ہوں مگر اتنی بات تو عیاں ہوگئی کہ جب امام کی قربت باعثِ فضائل ہے تو صفِ اوّل کو اور صفوف پر یقیناً فضیلت حاصل ہوگی کہ وہ امام سے قریب تر ہوتی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

ان اللّٰہ وملائکتہ یصلون علی میامن الصفوف۔ (۱) — بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے دائیں سے دعائے رحمت شروع کرتے ہیں۔

---

(۱) ابوداؤد باب ان یلی الامام فی الصف۔

جذبۂ ارتقاء

یہ ترغیب اس لئے بھی ہے کہ نمازی پہلے پہنچ کر صفِ اوّل میں جگہ حاصل کرنے کی سعی کریں اور اس طرح فضائل اور دوسرے ذرائع سے اجر و ثواب کے زیادہ سے زیادہ مستحق قرار پا سکیں، ان ساری حدیثوں کے پیشِ نظر یہ فیصلہ سہل ہو جاتا ہے کہ مسجدوں کے اس نظامِ وحدت میں ارتقاء کا جذبہ اُبھارا گیا ہے، جہاد کے ایک شعبہ کی مشق کرائی گئی ہے اور امام کی عزت افزائی کی گئی ہے جو سرداری کے فرائض انجام دیتا ہے اور اس طرح لوگوں کو اس کے ساتھ محبّت و عقیدت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اجتماعیت اور اخوّت و مساوات

پس یہ بات واضح ہو گئی کہ صفوں کی مشروعیت میں انفرادی زندگی کا خاتمہ ہے اور اجتماعی زندگی کی دعوت، عدل و مساوات کی تعلیم ہے اور اخوت و محبت کا سبق، جن کو اشاعتِ اسلام میں بنیادی حیثیّت حاصل ہے۔

اسلام منفردانہ زندگی کی مذمّت کرتا ہے، قانونی طور پر بھی اور عملی نقطۂ نظر سے بھی، انتشار، تشتت اور اختلاف و مخاصمت کو وہ ایک منٹ کے لئے برداشت نہیں کرتا اور ہر شعبۂ زندگی میں اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ اس کی سرشت میں داخل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو دیکھ لیتے ہیں کہ وہ جماعت میں شریک نہیں، یا صف سے

علیحدہ تن تنہا کھڑا ہے تو حیرت اور ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے ہیں چنانچہ ایک دفعہ آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا کہ صف کے پیچھے یکہ و تنہا نماز پڑھ رہا ہے تو آپؐ نے زجر فرمایا اور نماز کے اعادہ کا حکم دیا (۱)

امام کا انتخاب

اَب غور کرنا ہے کہ مقتدی کو جس امام کی پیروی کی اتنی سخت تاکید ہے اور شریعت نے جس کو یہ مرتبہ عطا کیا ہے، کیا وہ جگہ ہر شخص کو علم و فضل کا لحاظ کئے بغیر مل سکتی ہے؟ ہر ذی عقل یہی کہے گا کہ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے، یقیناً اس منصبِ جلیل کے لئے اس جماعت میں سے اس فرد کو منتخب کیا جائے گا جو ان میں بہترین اخلاق و اطوار کا ہو، زہد و اتقار کا مالک ہو اور علم و فضل میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔

امام کس حیثیّت کا ہونا چاہیئے

بلاشبہ وہ جب ایک ایسی مرکزی دینی عبادت کا پیشوا ہے جو افضل العبادات ہے اور ایک ایسے رکن کا ضامن بن رہا ہے جو ارکانِ خمسہ میں دوسرا درجہ رکھتا ہے تو بلاشبہ ایسے شخص کو رذائلِ اخلاق، سوقیانہ اطوار، مذموم عادات اور ہر ایسی خصلتِ بد سے منزّہ اور پاک ہونا چاہیئے جو شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہے، ساتھ ہی مکارم اخلاق، صفاتِ محمودہ، خصائلِ پسندیدہ اور خداشناسی و خداترسی کے اوصاف سے متّصف بھی ہونا چاہیئے۔

---

(۱) ابوداؤد باب الرجل یصلی وحدہ خلف الصف۔۱۲

جس کو ہم خدا کے سامنے اپنا نمائندہ بنا رہے ہیں، حتی الوسع اس کے انتخاب میں ہمیں عقل و خرد سے کام لینا چاہیئے، کہیں ایسا نہ ہو اس میں بھی ہمارے سامنے وراثت و خاندان اور حسب و نسب کا غلط مسئلہ آجائے، امیر و فقیر کی بات دھوکہ دے جائے، جس کی پروردگارِ عالم نے مذمّت فرمائی ہے (۱) بلکہ ان سب سے بالاتر ہو کر ہماری نگاہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہ پر ہو، یہ وہ عہدۂ جلیلہ ہے جسے خود سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات سے زینت بخشی ہے اور اس وقت تک جب تک ہوش و حواس نے ساتھ دیا خود ہی زینت بخشتے رہے مرض الوفات والی حدیث کے ضمن میں طبری کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:-

انما فعل ذٰلك لئلا يعذر	یہ تو آپؐ نے اس لئے کیا تاکہ آئندہ
احد من الائمة بعده لا نفسه	کوئی امام ادنےٰ عذر کو حیلہ بنا کر
بادنیٰ عذر فيتخلف عن الامامة (۲)	امامت سے کترا نہ جائے۔

آنحضرت صلعم کی امامت کے لئے ایک جامع شخصیت کی نامزدگی

آپؐ جب مرض سے نڈھال ہو گئے اور بار بار سعی کے باوجود غشی پر غشی آتی رہی تو آپؐ نے اس جگہ کے لئے اپنا قائم مقام اور خلیفہ اس فرد کو بنایا جو عالمِ انسانی میں انبیاء و رسل کے بعد افضل

(۱) احکام القرآن للجصاص ۱/ ۵۴۶۔

(۲) فتح الباری ۲/ ۱۰۸۔

ترین تھا، جن کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں "اعلم" ہونے کا درجہ حاصل تھا، یعنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو آپؐ نے اپنی یہ جگہ عطا فرمائی، آپؐ کی بعض ازواجِ مطہرات نے فاروقِ اعظمؓ کے نام کی سفارش کی ——— مگر آپؐ نے اس مشورہ کو رد فرما دیا اور اس سلسلہ میں ایک جملہ فرما کر اس جرأت پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ صدیق اکبرؓ نے امامت فرمائی۔

اسی مرض الوفات کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تین دفعہ آپؐ نے پانی رکھنے کا حکم فرمایا، مگر ہر بار غشی کا دورہ پڑتا رہا، مسجد کی حاضری سے جب مایوسی ہوگئی تو آپؐ نے صدیقِ اکبرؓ کو امامت کے لئے کہلا بھیجا، قاصد جب یہ پیام لے کر پہنچا تو صدیقِ اکبرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا "یا عمر صلِّ بالناس" (لوگوں کو نماز پڑھائیے) یہ سُن کر فاروقِ اعظمؓ نے آپؓ سے فرمایا "انت احقّ بذالک" (آپ ہی اس کام کے زیادہ لائق اور مناسب ہیں) چنانچہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی نے امامت کی (۱)

امام کیلئے کامل الفقہ ہونے کی ضرورت

یہ واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابِ کبار نے واضح طور پر اس مسئلہ کو بیان کر دیا کہ امامت قوم کے بہترین فرد کا حصّہ ہے اور یہ عظیم الشان ذمّہ داری اس شخص پر

(۱) مسلم باب استخلاف الامام اذا عرض لہٗ عذر، ج ۱ ص ۱۷۸۔

ڈالی جائے جو ہر طرح اس عہدۂ جلیلہ کا مستحق ہو، نیز وہ علم وفضل اور جلالتِ شان میں اپنا نمایاں درجہ رکھتا ہو، غالباً یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے مستحقینِ امامت میں اَعلمُ النّاس کو اوّل درجہ دیا ہے اس سلسلہ میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

فقد یعرض فی الصّلوٰۃ امر لا	نماز میں کبھی ایسی بات پیش آجاتی
یقدر علی مراعاۃ الصّلاۃ	ہے جس کی رعایت سوائے کامل الفقہ
فیہ الّا کامل الفقہ ولھذا	کے اور کسی کے بس کی بات نہیں، اور
قدم النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم	یہی وجہ تھی کہ نبی کریم صلعم نے ابوبکرؓ
ابابکر فی الصّلاۃ علی الباقین	کو بقیہ لوگوں پر نماز کے باب میں
مع ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم	ترجیح دی باوجود اس بات کے کہ
نص علی ان غیرہ اقرأ کانہ	آپؐ نے ان کے غیر کے متعلق اقرأ
عنی حدیث اقرأکم ابیّ۔	ہونے کی تصریح فرمائی ہے، یعنی
(فتح الباری ۲/ ۱۱۷)	ابیؓ کو تلاوتِ قرآن کا ماہر فرمایا ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ امام کو مسائل نماز سے پوری واقفیت ہونی چاہیئے تاکہ وہ نماز کو اس کے پورے حقوق کے ساتھ ادا کر سکے، موجودہ اصطلاحی حفاظ و قراء جو صرف قرآن پاک زبانی یاد کئے ہوتے ہیں اور عموماً ضروری مسائل سے واقفیت جیسی چاہیئے نہیں رکھتے، ان کو عالم پر کسی طرح امامت میں فضیلت نہیں دی جاسکتی جیساکہ عوام کبھی کبھی "یؤم القوم اقرأھم بکتاب اللّٰہ" والی حدیث سے دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

. . . .

عہدِ صحابہؓ میں شعبۂ امامت کی اہمیّت

جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اتنی بات تو خوب دل نشیں ہو گئی ہو گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دورِ حیات میں اس شعبہ کو کیا حیثیت دی، اس کے بعد عہدِ صحابہ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ ان عاشقانِ رسولؐ نے اس مسئلہ میں بھی آپؐ کی ہدایت و راہ نمائی پر پورا پورا عمل کیا، فاروقِ اعظمؓ خلافت کے فرائض کے ساتھ امامت کے منصب پر بھی زندگی بھر فائز رہے اور جو والی اور امام منتخب کیا وہ ہر اعتبار سے لائق، اور اپنا حال تو یہ ہوا کہ آخر کار امامت کرتے ہوئے ہی جامِ شہادت نوش فرمایا، آپؓ کے بعد حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کا بھی اس باب میں یہی طرزِ عمل رہا، یہی نہیں بلکہ خلافتِ راشدہ کے دَور میں جتنے بھی والی اور گورنر منتخب کر کے دوسرے مقامات میں بھیجے گئے سبھوں نے اس منصب کو بھی سنبھالا، گویا ان کے فرائض میں نماز کی امامت بھی داخل تھی جس سے وہ کنارہ کشی نہیں کر سکتے تھے تاریخ بتاتی ہے کہ اس دَور کے بعد بھی امامت گورنروں کے فرائض میں داخل رہی، ایک انگریز مسٹر ٹامس آرنلڈ خلافت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

" خلیفہ کے سیاسی فرمانروا ہونے کا مفہوم یہ تھا کہ وہ مذہبی اور سیاسی دو قسم کے اختیارات کا حامل ہے، مذہبی حیثیت سے اس کی حکومت کا حقیقی مقصد صرف دین کا تحفظ تھا، حامی دین کی

حیثیت سے وہ جنگ کرتا تھا، مذہب کو صدمہ پہنچانے والے افراد کو سزائیں دیتا تھا، نماز میں امامت، جمعہ کا خطبہ دینا بھی اس کا ایک منصبی فرض تھا"(۱)

غور کیجئے یہی وہ شعبہ ہے جس کے متعلق رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:-

الامام ضامن والمؤذن مؤتمن	امام ضامن اور مؤذن امین ہے۔
اللّٰھم ارشدِ الائمۃ واغفر للمؤذّنین۔	اے اللہ! اماموں کو ہدایت فرما اور موذنوں کی مغفرت فرما۔

امام احمد اور انتخابِ امام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام جس شعبہ کا کفیل اور ضامن قرار دیا گیا ہے، وہ آپ کی نظر میں بہت اہم ہے اور اسی اہمیّت کے پیشِ نظر آپؐ نے اس کے لئے رشد و ہدایت کی دعا فرمائی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بابِ امامت کی احادیث کے مدنظر فیصلہ فرماتے ہیں۔

ومن الحق الواجب علی المسلمین ان یقدموا اخیارھم واھل الدّین والافضل منھم اھل العلم باللہ تعالیٰ الذین یخافون اللہ۔ (کتاب الصلوٰۃ و مایلزمہا)	مسلمانوں پر واجب ہے کہ امام ان کو بنائیں جو ان کے سب سے بہتر اور دیندار ہوں اور افضل ترین وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کا علم و یقین رکھتے ہیں اور اس کی خشیت سے ان کا سینہ معمور رہتا ہے۔

(۱) مسلمانوں کا نظمِ مملکت ص۲۰۰۔

جلیل القدر محدّث اور ایک امام کے الفاظ بار بار پڑھیے، ان سے کتنی اہمیت ٹپکتی ہے۔ امامِ نماز کی اہمیت اور اس کی حیثیت کا کتنے بلند پیرایہ میں تذکرہ فرماتے ہیں اور قوم پر کس قدر اس کی ذمہ داری عائد کرتے ہیں، کوئی بات تو ہے جو اس شدّت پر اُتار رہی ہے۔

پھر اس کے بعد فوراً فرماتے ہیں:۔

جاء الحدیث اذا امّ بالقوم رجل وخلفه من هو افضل منه لم یزالوا فی سفال۔ (کتاب الصّلوٰۃ ومایلزمها)	حدیث میں ہے کہ جب قوم کی امامت ایک ادنیٰ شخص کرتا ہے اور اس کے پیچھے اس سے افضل موجود ہوتا ہے تو ایسی قوم ہمیشہ پستی میں رہتی ہے۔

خود امام پر ذمہ داری

یہی نہیں کہ ایسی قوم جو اپنے افضل کو چھوڑ کر ادنیٰ کو اپنا امام اور پیشوا بناتی ہے ہمیشہ پستی میں رہتی ہے بلکہ پھر ذلّت وخواری بھی اس کے لئے لازمی ہے، خود امام پر یہ ذمّہ داری ہے کہ قوم اسے کسی شرعی امرِ مذموم کی وجہ سے امامت کے لئے قبول نہیں کرتی تو اسے امامت سے اجتناب کرنا چاہیئے کیوں کہ ایسے شخص کی نماز کی قبولیت میں شبہ ہے بلکہ حدیث کا فیصلہ ہے:

ثلٰثة لا تقبل منهم صلوٰتهم من تقدم قوما وهم له کارهون ومن اتی الصلوٰۃ دباراً والدبار ان یاتیها بعد ان تفوته ورجل	تین شخص کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا، ایک وہ امام جس کو لوگ ناپسند کرتے ہیں، دوسرا جو اخیر میں نماز کے لئے آتا ہے کہ اس کی نماز چھوٹ

اعتبد محررۃ ۔ (ابوداؤد) | جاتی ہے اور تیسرا وہ شخص جو آزاد کو غلام بناتا ہے ۔

ان ساری حدیثوں پر بامعانِ نظر غور کیجئے اور امام کی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کیجئے، آج کل ہمارے اس زمانہ میں جو سلوک اس شعبہ کے ساتھ ہوتا رہتا ہے اس کو بھی سامنے رکھئے ۔

موجودہ دَور اور شعبۂ امامت

ضرورت ہے اس دَور میں بھی اس سنّت کو زندہ کیا جائے اور ہر مسجد کا امام اس حیثیت کا مقرر کیا جائے جو اس اصول پر پورا اُترے، ساتھ ہی وہ تبلیغِ دین اور اشاعتِ علوم کے فرائض انجام دے سکے، اس میں ہر حیثیت سے اتنی صلاحیت ہو کہ قوم اس کو اپنا پیشوا بنا سکے اور وہ حدیث کے معیار پر بھی پورا اترے ۔

ایک عرصہ پہلے اس کا احساس حضرت مولانا سیّد احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا تھا اور آپ نے اس سنت طریقے کو زندہ فرمانے کی سعی فرمائی تھی، چنانچہ آپ کا یہ دستور تھا کہ اپنے زمانہ میں امام معیاری مقرر فرماتے تھے اور ان کو اس حلقہ کا ذمہ دار بنا دیا جاتا تھا جس حلقہ کی وہ امامت کرتا تھا، اور کئی مسجدوں کو ملا کر ایک مناسب مسجد کو جامع مسجد کی حیثیت دے کر اس کے امام کو ستن جج قرار دے دیا جاتا تھا۔ "تذکرۂ صادقہ" میں مذکور ہے :۔

"لوگوں کے اصلاحِ حال اور فیصلۂ طاغوتی سے بچنے کے لئے ضرورت تھی کہ جہاں لوگوں کو فساد و فتن سے روکا جائے وہاں ان میں عدل

تصفیہ کی روح بھی پھونکی جائے اور ان کے ناگزیر تنازع اور پیچیدہ مسائل کے محاکمہ اور فیصل کے لئے کوئی صورت قائم کر دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ "شاورھم فی الامر" کی سنت بھی ادا ہو سکے۔

چنانچہ جناب ہر ایک بستی میں جہاں مسجد موجود ہوتی، وہاں امام مقرر کرتے اور جہاں مسجد نہ ہوتی وہاں بھی تعمیر کرا دیتے اور فصل خصومات کا بار اسی کے شانہ پر رکھتے، چار پانچ کوس کے حلقے میں کسی مسجد کو جامع مسجد قرار دے کر ایک تعلیم یافتہ، متدیّن امام کے سپرد کر دیتے اور امام بمنزلہ سشن جج متصور ہوتا۔ اگر اس پر لوگوں کی تسکین خاطر نہ ہوتی تو متخاصمین کی اپیل پر بذاتِ خود ان مقامات پر پہنچ کر فصل تنازعہ فرماتے اور ملفوظات کیمیا اثر سے تالیفِ قلوب فرماتے"۔ (۱)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے مسجدوں کے قدرتی نظام کو خوب سمجھا تھا اور اس نظام کی روح کو جو عرصہ سے مُردہ ہو گئی تھی دوبارہ زندگی بخشنا چاہتے تھے۔ اے کاش مسلمانوں کی سوئی ہوئی بستی جاگے اور اس قدرتی نظام کو سمجھنے کی کوشش کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس کو بروئے کار لانے کی عملی جدوجہد شروع کر دے۔

منصبِ امامت کی اہمیّت

یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ مسجد میں نماز کی امامت کا منصب بڑی اہمیّت کا حامل ہے اور شریعت میں اس منصب کی عظمت مسلّم ہے، لہذا اچھے سے اچھا فرد اس عظیم منصب کے لئے منتخب

(۱) ہندوستان میں پہلی اسلامی تحریک ص: ۵۹، ۶۰۔

کیا جائے جو علم وعمل دونوں میں ممتاز ہو اور قرآنِ پاک صحیح پڑھتا ہو، اور فواحش و منکرات سے بچتا ہو اور نمازی اسے پسند کرتے ہوں۔

امام تمام مقتدیوں کا نمائندہ ہوتا ہے اور نماز میں وہی قرارت کرتا ہے اور اس کی قرارت مقتدیوں کی قرارت قرار دی گئی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

من کان له امام فقراءة الامام له قراءة۔ (مسلم)	جب مقتدیوں کا کوئی امام ہو تو اس امام کی قرارت مقتدیوں کی قرارت ہے۔

دوسری حدیث میں ہے :

اذا قمتم الی الصلوٰة فلیؤمکم احدکم واذا قرأ الامام فانصتوا۔ (مسلم)	تم جب نماز کے لئے تیار ہو جاؤ تو چاہئے کہ تم میں سے ایک شخص امامت کرے اور جب وہ امام نماز میں قرارت کرے تو تم خاموش رہ کر سنو۔

رحمتِ عالمؐ اور خلفاءِ راشدین منصبِ امامت پر

گذر چکا کہ اس منصب پر خود رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی بھر فائز رہے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے جلیل القدر خلفاءِ راشدین اور دوسرے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم بھی عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہ میں کبھی علم وعمل کے اعتبار سے معمولی آدمی کو امام نہیں بنایا گیا۔

یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ

عنہ نے امامت کی اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔

فصلّی ابو بکر تلکٌ الایام۔ (مشکوٰۃ) آپؐ کی بیماری کے دنوں میں حضرت ابو بکرؓ نے امامت کی اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔

آج کے امام کا حال

آج ہر شخص اس منصب پر آنے کو بڑی آسانی سے آمادہ ہو جاتا ہے اور متولّی مسجد جس معمولی آدمی کا چاہتا ہے تقرر کر دیتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس عظیم الشان منصب کو مسلمانوں نے پست سے پست تر بنا رکھا ہے اور سب سے سستا آدمی اس کے لئے تلاش کیا جاتا ہے جو نہ تو نماز کے مسائل سے واقف ہوتا ہے، نہ قرارت کے مسائل سے اس کو کوئی تعلق ہوتا ہے، نہ اس میں دینی وجاہت ہوتی ہے اور نہ دنیاوی رعب و دبدبہ، نہ وہ قرآن پاک صحیح پڑھ سکتا ہے اور نہ اس میں دین کا کوئی وقار ہوتا ہے۔

اپنے محلہ، شہر اور آبادی کے مسلمانوں کو نہ وہ امر بالمعروف کر سکتا ہے اور نہ برائیوں سے روکنے اور ٹوکنے کی جرأت اس میں ہوتی ہے۔ وہ ساری بدعات و خرافات کو دیکھتا ہے اور خاموش رہتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے، نہ تقویٰ اس میں ہوتا ہے اور نہ اخلاص و للّٰہیت، حیرت ہوتی ہے کہ مسلمان کہاں سے چلا تھا اور کہاں پہونچا، وہ عبادت کرتا ہے مگر اپنی عبادت کے نوک و پلک پر نظر نہیں رکھتا اور نہ وہ اللہ کے رسولؐ کی ہدایتوں پر

عمل کرتا ہے۔

امامت کے لئے ہدایتِ نبویؐ

حدیث میں صراحت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

فلیؤمکم علماءکم خیارکم فانه وفدکم فیما بینکم وبین ربکم رواه الطبرانی۔	تمہاری امامت تمہارے علماء کریں جو تم میں بہتر ہوں، اس لئے کہ امام تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان نمائندہ کی حیثیت رکھتا ہے۔
(فتح الرحمٰن ۲/۲۶۴)	

لہٰذا امام بہتر سے بہتر ہونا چاہیئے جو صحیح طور پر نمائندگی کے فرائض انجام دے سکے اور مقتدیوں کی نمازیں مقبولِ بارگاہ ہوں۔ خوب یاد رکھیں کہ مقتدیوں کی نماز کی صحت کا دارو مدار امام کی نماز کی صحت پر ہے۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا فسدت صلوٰة الامام فسدت صلوٰة من خلفه۔	رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام کی نماز فاسد ہوتی ہے تو پھر اس کے پیچھے جتنے نمازی ہیں ان کی نمازیں بھی فاسد ہو جاتی ہیں۔
(فتح الرحمٰن ۲/۲۶۴)	

امام اور اس کے فرائض

ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ایسے فرد کو بنایا جائے جو عالم باعمل اور خدا ترس ہو اور اس کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہو

کیوں کہ اس کے فرائض بڑے اہم اور نہایت نازک ہیں، ذرا سی غلطی سے پونجی کے لٹ جانے کا خطرہ ہے، یقینی طور پر وہ اس دینی عبادت میں تمام اہلِ مسجد کا امیر ہوتا ہے اور سب کی طرف سے نمائندہ بن کر وہی رب العزت سے مناجات کرتا ہے، اس نے اگر اپنی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ فرائض کی ادائیگی میں سعیِ پیہم کی اور اخلاص و لِلّٰہیت کے ساتھ اسے بجالایا تو وہ عنداللہ اجر جزیل کا مستحق ہوگا اور انجام کار کامیاب و بامراد۔ اور اگر خدانخواستہ اس نے کوتاہی کو راہ دی، اخلاص کی روح کو زخمی کیا اور حق پیشوائی کی بجا آوری میں جدّو جہد سے کام نہ لیا تو پھر اس کے لئے خسران و ناکامی کی ذلّت ہے۔

امام کی ذمہ داری

امامِ مسجد کی بہت ساری ذمہ داریوں میں ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں مسلمانوں کو باہم مل کر رہنے کی تاکید کرتا رہے، اگر کبھی کسی وجہ سے ان میں اختلاف کی صورت پیدا ہوجائے تو امامِ مسجد کا فرض ہے کہ وہ فوراً ان لوگوں میں پہنچے، ان کی آپس کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی سعی کرے، اس کا انتظار نہ کرے کہ جب کوئی اسے بلائے گا تو جائے گا بلکہ از خود اقدام کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہی تھا۔ ایک مرتبہ انصار میں کسی بات پر اختلاف پیدا ہوگیا، جونہی آپؐ کے علم میں آیا، آپؐ تشریف لے گئے، ان کو بٹھا کر باتیں معلوم کیں پھر آپؐ نے ان کو سمجھایا اور آپس میں صلح و صفائی کرادی، اس کام میں دیر لگی تو اسے بھی

برداشت کیا۔ حتیٰ کہ جب واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ مسجدِ نبوی میں لوگ جماعت کے ساتھ نماز ادا کر چکے ہیں۔ علامہ شامیؒ نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے:

لما روی عبد الرحمٰن بن ابی بکر عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج من بیتہ لیصلح بین الانصار فرجع وقد صُلّی فی المسجد بجماعۃ فدخل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی منزل بعض اھلہ فجمع اھلہ فصلّٰی بھم جماعۃ۔ (ردالمحتار)	عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ اپنے والد سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے نکل کر انصار کے محلہ میں تشریف لے گئے تاکہ ان میں صلح کرادیں اور صلح وصفائی کرا کے جب واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ مسجد میں جماعت ہو چکی ہے چنانچہ اپنے لوگوں میں سے ایک کے گھر لوگوں کو جمع کر کے نماز باجماعت ادا کی۔

قرآن کا حکم

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امامِ مسجد کی ذمہ داری یہ بھی ہے، اور ایسا اس لئے آپؐ نے کیا کہ قرآنِ پاک میں حکم ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ۔ (الحجرات:۱۰)	مسلمان جو ہیں سو بھائی ہیں، سو ملاپ کرادو اپنے دو بھائیوں میں۔

ارشادِ نبویؐ

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی بھی ہے کہ ایک مسلمان

مخالفت کی وجہ سے اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے تین دنوں سے زیادہ دور نہ رہے اور بول چال بند نہ رکھے۔

نھیٰ رسُول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلٰث۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی اپنے مسلمان بھائی کو تین دن سے زیادہ تک چھوڑ رکھے۔

(مشکوٰۃ)

بلکہ کشید گی کو ختم کر دے، جو اختلاف ہوگیا ہے اس کو دور کرلے جب تک آپس میں ملنا جلنا نہ ہوگا، دل صاف نہ ہو گا اور نہ ایک کی خامی دوسرے پر ظاہر ہو گی اور نہ اس سے دور ہو گی تاہم دوری سے اور دوری بڑھتی ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ مسلمانوں میں پھوٹ اور دوری باقی رہے اور غلط فہمیاں بڑھتی رہیں۔

مگر یہ کام امام اس وقت پورے طور پر انجام دے سکے گا جب وہ خود متقی اور اہلِ علم ہو اور مسلمانوں کا بھی خواہ اور ہمدرد ہو، اپنے اعمال و اخلاق میں بلند ہو اور اس کا دل اخلاص کی دولت سے لبریز ہو۔

نمازیوں کی تربیّت

آج کل عام مسلمان جو نمازی بھی ہیں وہ بھی دینی علوم سے نا آشنا ہیں، اس لئے امامِ مسجد کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنا کچھ وقت فارغ کر کے ایسے لوگوں کی تربیّت کریں اور نماز و وضو کے مسائل سکھائیں، ان کو نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا جائے کہ کس وقت میں کتنی رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، ان میں سے کتنی فرض ہیں، کتنی

سنّت ہیں اور کتنی نفل، کس ترتیب سے پڑھی جائے گی، پڑھنا جانتے ہوں تو ان کو ہلکی پھلکی ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جن سے انہیں دین کا علم ہو اور نماز کا طریقہ معلوم ہو۔

پھر امام، امام بن کر رہے، پارٹی بازی اور گروپ بندی کا شکار نہ ہونے پائے، سبھوں کا معتمد بن کر رہے اور سبھوں کے حق میں مخلص ہو، کسی کی دل آزاری نہ کرے اور نہ دل آزاری کرنیوالوں کا ساتھ دے۔ انشاء اللہ ایسا امام مؤثر ہوگا اور اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے گا۔

صفوں کی نگرانی

مصلّے پر پہنچتے ہی اس کو دیکھنا ہوگا، صفیں درست اور مرتّب ہیں یا نہیں، وہ شریعت کے قوانین پر پوری اُترتی ہیں یا نہیں، یوں تو مقتدی کا فریضہ ہے ہی کہ وہ شرعی ہیئت کے ساتھ کھڑا ہو مگر امام اس کی مزید نگرانی کرے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود صفوں کو درست اور برابر فرماتے اور ادھر سے مطمئن ہوکر تکبیر تحریمہ کہتے چنانچہ نعمان بن بشیرؓ کا بیان ہے:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يسوي صفوفنا اذا قمنا الى الصلوٰة فاذا استوينا كبر۔ (ابوداؤد)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو برابر فرماتے تھے، جب ہم لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے اور جب ہم برابر ہو لیتے تو آپؐ تکبیر کہتے تھے۔

دائیں اور بائیں صفوں کو دیکھ کر فرماتے "سیدھے کھڑے ہو اور اپنی صفوں کو شرعی حیثیت کے مطابق درست کر لو"۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول عن یمینہ اعتدلوا وسووا صفوفکم وعن یسارہ اعتدلوا وسووا صفوفکم۔ (ابوداؤد)	رسول اللہ صلعم دائیں طرف متوجہ ہو کر فرماتے ٹھیک طور پر کھڑے ہو جاؤ اور اپنی صفوں کو درست کر لو، اور بائیں جانب متوجہ ہو کر فرماتے درست ہو جاؤ اور اپنی صفوں کو ٹھیک کر لو۔

اس قدر تو خود کرتے۔ مزید برآں حضرت بلالؓ جو مؤذن تھے ان کی ڈیوٹی مقرر فرمادی تھی کہ وہ صفوں کو درست کرائیں اور وہ بھی یہ فریضہ انجام دیتے تھے۔

ان بلالا کان یسوی الصفوف ویضرب عواقیبھم بالدرۃ حتی یستووا۔ (۱)	حضرت بلالؓ صفوں کو درست فرماتے اور درہ مار کر ان کی ایڑیوں کو سیدھی کرتے تھے تاآنکہ وہ برابر ہو جاتے۔

فاروقِ اعظمؓ کا اہتمام

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے زمانہ میں اس اہتمام کو باقی رکھا، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کا دستور تھا کہ نماز شروع کرنے سے پہلے صفوں کی دیکھ بھال کر لیتے اور صفوں کی درستی کے بعد نماز شروع کرتے بلکہ آپؓ نے بھی ایک مستقل آدمی اس کام کے لئے مقرر کر دیا تھا جو صف میں گھوم کر دیکھتا اور آکر درستی کی خبر دیتا، حضرت احمد بن حنبلؒ جیسے جلیل القدر محدث کا بیان ہے:-

(۱) کتاب الصلوٰۃ وما یلزمہا للامام احمد ص۱۱۔

جاء عن عمرؓ انه كان يقوم مقام الامام لايكبر حتى ياتيه رجل قد وكله باقامة الصفوف فيخبره انهم قد استووا فكبر وجاء عن عمر بن عبد العزيز هٰكذا۔

(کتاب الصلوٰۃ ومایلزمها)

حضرت عمرؓ کے متعلق آیا ہے کہ وہ مصلّٰے پر آکر کھڑے ہو جاتے اور اس وقت تک تکبیر نہیں کہتے تھے جب تک ایک آدمی جو اس کام پر مقرر تھا آکر خبر نہ کرتا کہ صف درست اور لوگ برابر ہو گئے، جب یہ اطلاع مل جاتی تو تکبیر کہتے، عمر بن عبد العزیزؒ کا بھی یہی دستور بیان کیا گیا ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ صفوں کی درستی کے باب میں بہت سخت تھے، صف میں جو بھی ناہمواری پیدا کرتا اس کو سزا فرماتے، اس باب میں کسی کی رورعایت ملحوظ خاطر نہ تھی۔ حضرت میمونؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کو جس دن نماز میں نیزہ مارا گیا میں موجود تھا مگر صفِ اوّل میں اس لئے نہیں کھڑا ہوا تھا کہ آپؓ سے ڈرتا تھا، کیوں کہ آپؓ کا دستور تھا کہ اگلی صف کو جب تک خود نہیں دیکھ لیتے تکبیر تحریمہ نہیں کہتے تھے اور جب کسی کو صف میں بے قاعدہ آگے پیچھے کھڑا دیکھتے تو اس کے درّہ لگاتے (۱)

ان واقعات سے یہ بات محقّق طور پر معلوم ہوئی کہ امام مسجد پر

(۱) الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ ۱۲۱/۱۔ اس کتاب کے متعلق اپنے شکوک میں نے مخدوم ومحترم علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ کو لکھے تو جواب میں تحریر فرمایا "الامامۃ والسیاسۃ" ابن قتیبہ کی تصنیف ہرگز نہیں، یہ یا تو کسی شیعی کی تصنیف ہے یا اس میں کسی شیعی نے تحریف کر دی ہے، یہ ہرگز اعتماد کے قابل نہیں۔" (مکتوب ۵۲)

صفوں کی درستی کی بڑی ذمہ داری ہے اور اس کے فرائض میں ان کی دیکھ بھال بھی داخل ہے۔

مقتدیوں کا لحاظ

بہر حال جب صفیں خوب درست ہو جائیں تو اب امام نماز شروع کرے گا اور اپنی ذمہ داری کے ساتھ پڑھائے گا، جس میں مقتدیوں کا خیال رکھنا ازبس ضروری ہو گا، اس لئے کہ جماعت میں ہر طرح کے نمازی ہوتے ہیں، کتنے ضعیف اور بوڑھے ہوتے ہیں اور کتنے بیمار اور کمزور، ان میں سے ہر ایک کے حال کا لحاظ رکھنا امام کے فریضہ میں داخل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ لحاظ اسی حد تک جائز ہے جو طریقۂ سنّت کے حدود میں ہو۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:-

اذا صلی احدکم للناس فلیخفف فان فیھم السقیم والضعیف والکبیر واذا صلی احدکم لنفسہ فلیطول ما شاء متفق علیہ۔
(مشکوٰۃ باب ما علی الامام)

تم میں سے کوئی جب لوگوں کی امامت کرے تو اسے چاہیئے کہ ہلکی نماز پڑھائے، کیونکہ ان میں بیمار کمزور اور بوڑھے سبھی ہوتے ہیں، البتہ جب اکیلا پڑھے تو پھر جتنی لمبی نماز چاہے پڑھے۔

سرکارِ دو عالمؐ کی تخفیف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ان کا لحاظ فرماتے تھے، کسی بچّہ

کے رونے کی آواز جب پہنچتی تو نماز مختصر فرما دیتے (۱) مگر یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب عورتوں کو مسجد آنے کی اجازت تھی، یوں بھی آپؐ ایسی ہی نماز پڑھاتے جس سے مقتدی اُکتا نہ جائیں اور اس طرح ان کے خشوع و خضوع میں فرق نہ پڑنے پائے، حضرت انسؓ جن کو آپؐ کی خدمت کرنے کا شرف حاصل تھا، فرماتے ہیں:-

ما صلیت وراء امام قط اخف	میں نے نبی کریم صلعم کے پیچھے جتنی ہلکی
صلوٰۃ ولا اتم صلوٰۃ من النبی	اور کامل نماز پڑھی کسی اور کے پیچھے
صلی اللہ علیہ وسلم (۲)	کبھی بھی نہیں پڑھی۔

امام کو ہدایت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہیں سے یہ شکایت پہنچتی کہ کوئی امام قرأت زیادہ لمبی کرتا ہے جس سے مقتدی اُکتا جاتے ہیں اور جماعت سے نماز پڑھنے میں تأمّل کرتے ہیں تو آپؐ بہت خفا ہوتے ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آپؐ کی خدمت میں یہ شکایت پہنچائی کہ میں فلاں امام کی طویل قراءۃ کی وجہ سے صبح کی جماعت میں شرکت کرنے سے معذور رہتا ہوں۔ صحابۂ کرامؓ کا بیان ہے کہ آپؐ یہ سن کر اس قدر خفا ہوئے کہ اس سے پہلے نصیحت کے باب میں ہم لوگوں نے اس طرح کی خفگی کا اظہار دیکھا ہی نہیں تھا۔ اسی موقعہ سے آپؐ نے فرمایا:-

---

(۱) مشکوٰۃ عن البخاری و مسلم باب علی الامام۔

(۲) حوالہ سابق۔

ان منکم منفرین فایکم ماصلی	تم میں سے کچھ لوگ نفرت پیدا کرنیوالے
بالناس فلیتجوز فان فیہم	ہیں، تم میں جو بھی امامت کرے وہ مختصر
الضعیف والکبیر وذا الحاجۃ	اور ہلکی نماز پڑھائے، کیونکہ ان میں
متفق علیہ (۱)	کمزور، بوڑھے اور ضرورتمند بھی ہیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت معاذؓ کے متعلق حدیث میں صراحۃً مذکور ہے کہ وہ نماز بہت لمبی پڑھاتے تھے جو جائز ہی نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے ذوق کے بھی مناسب تھی مگر کسی ایک فرد پر یہ نماز گراں گذری جو محنت اور مزدوری کے کام کرتے تھے، یہ خبر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہونچی تو آپؐ نے فرمایا "أفتّان انت یامعاذ (۲) (کیوں جی معاذ تم فتنہ انگیزی کرتے ہو؟)

حضرت عثمان بن ابی العاصؓ فرماتے ہیں کہ آخری عہد جو مجھ سے لیا گیا وہ یہ تھا کہ جب امامت کروں تو حدودِ سنت کے اندر رہکر ہلکی نماز پڑھاؤں (۳)

تخفیف کا مطلب

جو کچھ عرض کیا گیا اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قرا‌ٔت اور تسبیحاتِ مسنونہ چھوڑ دی جائیں، سنن وآدابِ نماز کی رعایت ترک کردی جائے اور واجبات وفرائض میں کسی طرح کی کوتاہی برتی جائے بلکہ ماحصل یہ تھا کہ ادائیگی نماز کا جو سنت طریقہ ہے اس کے اندر رہ کر

---

(۱) مشکوٰۃ باب ماعلی الامام۔

(۲) مشکوٰۃ عن البخاری و مسلم باب ماعلی الامام۔ (۳) مشکوٰۃ ایضاً۔

سب کچھ کیا جائے تاکہ نماز پڑھنے والا "یُسر" کو "عُسر" محسوس کرنے نہ پائے۔

اس مسئلہ کو خوب سمجھ لیجئے کہ تخفیفِ صلوٰۃ (ہلکی نماز) کا مطلب شرعاً کیا ہے۔ آج کل دین سے جو بے رغبتی ہے اور عبادات میں جیسی سستی پیدا ہوتی جارہی ہے اس کی وجہ سے عموماً لوگ دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور تخفیف کے جو معنی ہیں اسے صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔

یہ مسئلہ ایسا ہرگز نہیں ہے جو شریعت میں مصرَّح نہیں کہ جس کی مجبوری کی وجہ سے قیاس سے کام لینا پڑے یا کسی شخص یا شہر یا جماعت کی عادت پر محمول کیا جائے، یا محض امام اور مقتدی کی رائے پر چھوڑ دیا جائے۔ کتبِ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پوری ہیئت کے ساتھ مذکور ہے۔ اور ایک ایک بات کی تفصیل موجود ہے۔ ابھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث گذر چکی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ آپؐ کے پیچھے جو نماز میں نے پڑھی وہ ایک طرف اگر ہلکی تھی تو دوسری طرف کامل و تام بھی تھی جس سے واضح ہے کہ تخفیف کے ساتھ اتمام و کمالِ نماز بھی مطلوب ہے اور کھلی بات ہے کہ کمال میں تعدیلِ ارکان سنن و آداب کی رعایت اور نماز کے دوسرے حقوق بھی داخل ہیں پنج وقتہ نماز کی قرأت حدیثوں میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

قرأت: آنحضرت صلعم کا معمول

صبح کی نماز میں مقدارِ قرأت کیا تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کا معمول کیا تھا؟ اس سلسلہ میں چند حدیثیں ملاحظہ فرمائیں، حضرت جابر ابن سمرہؓ کا بیان ہے :-

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الفجر بقٓ والقرآن المجید ونحوھا وکانت صلوٰتہ بعد تخفیفا (۱)	رسول اللہ صلعم فجر کی نماز میں سورہ قٓ والقرآن المجید اور اسی طرح کی سورتیں پڑھتے تھے، پھر بھی آپؐ کی نماز ہلکی ہوتی۔

حضرت عمرو بن حریثؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فجر کی نماز میں "واللیل اذا عسعس" پڑھتے ہوئے سنا گیا۔ (۲)

حضرت عبداللہ بن السائبؓ کا بیان ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں ہم لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی جس میں سورۂ "مؤمنون" کی تلاوت شروع کی، جب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام یا عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ تک پہنچے تو آپؐ کو کھانسی شروع ہوگئی چنانچہ وہیں رکوع میں جھک گئے۔ (۳)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں :-

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الفجر یوم الجمعۃ بالٓمٓ تنزیل فی الرکعۃ الاولیٰ وفی الثانیۃ ھل اتیٰ علی الانسان متفق علیہ۔ (۴)	جمعہ کے دن فجر میں نبی صلعم "الٓمٓ تنزیل" پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں ھل اتیٰ علی الانسان۔

⁂ ⁂ ⁂

---

(۱) مسلم باب القرآۃ فی الصبح ۱/۱۸۷۔

(۲) حوالہ مذکور صفحہ ۱۸۶۔

(۳) ایضاً۔ (۴) مشکوٰۃ باب القرآۃ فی الصبح۔

یہ سب صحیحین کی حدیثیں ہیں جن سے فجر کی مقدارِ قراءۃ خوب اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے اور جو کچھ عرض کیا گیا وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول ہے۔

ظہر و عصر کی قرأت

ظہر اور عصر کی نمازوں میں آپؐ کی قراءت کی جو مقدار تھی وہ بھی حدیث میں مذکور ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ اپنا اندازہ بیان کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر قائم کیا تھا۔

کنا نحرز قیام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الظہر والعصر فحرزنا قیامه فی الرکعتین الأولیین من الظہر قدر الٓمٓ تنزیل السجدة وفی روایة فی کل رکعة قدر ثلثین اٰیة۔	ظہر اور عصر کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا اندازہ ہم لوگ لگاتے تھے، ہمارا اندازہ ہے کہ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں آپؐ "الٓمٓ تنزیل سجدہ" کی قراءۃ کے مقدار قیام فرماتے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ ہر رکعت میں تیس آیت کی مقدار پڑھتے۔

(مسلم باب القراءۃ فی الظہر والعصر ۱/۱۸۵)

حضرت جابر بن سمرۃؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم ظہر میں "واللیل اذا یغشیٰ" پڑھتے تھے اور دوسری روایت میں ہے کہ "سبح اسم ربك الاعلیٰ" تلاوت فرماتے اور عصر میں اسی کے لگ بھگ اور فجر میں اس سے بہت زیادہ لمبی سورۃ پڑھتے تھے (۱)

(۱) مسلم باب القراءۃ فی الصبح ۱/۱۸۷۔

مغرب

نماز مغرب میں سورۂ طور پڑھنا ثابت ہے، سورۂ مرسلات بھی آپؐ نے پڑھی ہے۔ حضرت جبیر بن مطعمؓ فرماتے ہیں :-

سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقرأ فی المغرب بالطور متفق علیہ (۱)	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب میں سورۂ طور پڑھتے ہوئے سنا ہے۔

حضرت ام الفضل بنت الحارثؓ کہتی ہیں :-

سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقرأ فی المغرب بالمرسلات عرفا متفق علیہ (۲)	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے کہ آپؐ مغرب میں سورۂ مرسلات پڑھتے تھے۔

عشار میں حضرتؐ کا معمول

عشار کے متعلق حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا واقعہ گذر چکا ہے کہ ایک دفعہ ان کی لمبی قرآۃ کی شکایت دربارِ رسالتؐ میں پہنچی تھی تو آپؐ بہت خفا ہوئے تھے اور فرمایا تھا کہ " أفتّان انت " (کیا تم فتنہ انگیز ہو؟) اسی حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد بھی مذکور ہے :-

اقرأوالشمس وضحٰھا، والضحیٰ، واللّیل اذا یغشیٰ وسبح اسم ربّک الاعلیٰ۔ (مشکوٰۃ عن البخاری و مسلم باب القرآۃ)	تم (عشار میں) والشمس وضحٰھا، والضحیٰ، واللّیل اذا یغشیٰ اور سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا کرو۔

---

(۱) مشکوٰۃ باب القرآۃ فی الصلوٰۃ۔ (۲) ایضاً۔

حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء میں سورۃ "والتین والزیتون" پڑھتے ہوئے سنا ہے، میں نے آپؐ سے بڑھ کر اور کسی کو خوش آواز نہیں دیکھا (۱)

یہ ساری تفصیل آپ کے سامنے ہے، اس کاوش کا مقصد یہ ہے کہ تخفیفِ صلوٰۃ کا جو مطلب آج کل بعض لوگ سمجھتے ہیں وہ کس قدر غلط ہے، ان مذکورہ بالا حدیثوں سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ہلکی نماز کا کیا مطلب ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ آپؐ ہم کو ہلکی نماز کا حکم فرماتے تھے اور جب انہوں نے عملی مثال بیان کی تو یہ کہ آپؐ سورۃ صافات کے ساتھ امامت فرماتے تھے(۲)

قرأت ترتیل

یہ تو ہر نماز میں آیتوں کی تعداد کے اندازہ لگانے کے لئے نقل کیا گیا ہے، علاوہ ازیں پڑھنے کا طریقہ بھی جاننا ضروری ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک پڑھنے کا کیا طریقہ اختیار فرما رکھا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآن کا یہ فرمان سامنے رکھنا چاہیئے۔ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا۔ (المزمل : ۴)

جس کا منشاء یہ ہے کہ آپؐ کو ترتیل اور ٹھہر ٹھہر کر صاف صاف پڑھنے کا حکم تھا، جس کی آپؐ پوری پیروی فرماتے تھے، تیز پڑھنے کا کبھی بھی آپؐ کا معمول معلوم نہیں ہوتا ہے جس سے قرآن پاک کے کلمات

---

(۱) مشکوٰۃ عن البخاری و مسلم باب القراۃ۔

(۲) مشکوٰۃ عن النسائی باب ما علی الامام۔

پورے طور پر ادا نہ ہو سکیں یا سننے والا اچھی طرح کلمات سمجھ نہ سکے، حضرت امِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے :-

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرأ یقطع قرأتہ اٰیۃ اٰیۃ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ہ الحمد للہ ربّ العالمین ہ الرّحمٰن الرّحیم۔ (۱)	(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تلاوت فرماتے تھے تو ایک ایک آیت علیحدہ علیحدہ کرکے پڑھتے تھے، بسم اللہ الرحمن الرحیم، پھر الحمد للہ رب العالمین، پھر الرحمن الرحیم (ایک آیت کو دوسری میں نہیں ملاتے تھے)

حضرت حذیفہؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو دیکھا کہ آپؐ کی قرأت اعتدال کے ساتھ تھی، نہ پست تھی نہ بلند، رُک رُک کر پڑھتے اور ترتیل کا پورا لحاظ فرماتے تھے (۲)

امّ المؤمنین حضرت حفصہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأۃ کے متعلق فرماتی ہیں کہ کوئی سورۃ جب آپؐ پڑھتے تو ترتیل کے ساتھ پڑھتے، جس سے سورۃ لمبی سے لمبی معلوم ہوتی۔ حضرت ام سلمہؓ سے ایک روایت میں ہے کہ ایک ایک حرف الگ الگ کرکے پڑھتے (۳)

صحابۂ کرامؓ کا معمول

ان حدیثوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ آپؐ کے پڑھنے کا کیا دستور تھا، صحابۂ کرامؓ کا

---

(۱) قیام اللیل محمد بن نصر المروزی باب الترتیل فی القرأۃ صـ۵۲۔
(۲) ایضاً۔
(۳) ہر دو روایت قیام اللیل ایضاً باب الترتیل فی القرأۃ صـ۵۲۔

طرزِ عمل بھی مقدارِ قرأۃ اور ترتیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی جیسا رہا، اس لئے کہ یہ حضرات سراپا سوز و عشق تھے، چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ ایک دفعہ صبح کی نماز میں سورۂ بقرہ پڑھ گئے، آپؓ سے جب کہا گیا کہ آفتاب تو اب نکلنا ہی چاہتا تھا (مطلب تاخیر اور لمبی سورۃ کا ذکر تھا) تو آپؓ نے فرمایا، آفتاب سے غافل نہ تھا۔ آپؓ کی مراد یہ تھی کہ اس کا خیال و اندازہ بھی تھا (۱)

حضرت عمر فاروقؓ کا بھی کچھ یہی معمول تھا، کیوں کہ آپؓ کے متعلق آیا ہے کہ آپؓ فجر کی نماز میں سورۂ نحل، یوسف، ہود، یونس، بنی اسرائیل اور اسی طرح کی سورتیں پڑھا کرتے تھے (۲)

حضرت علقمہؓ کہتے ہیں، میں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ نماز پڑھی ہے، آپ قرأۃ میں ترتیل فرماتے اور صاف صاف تلاوت کرتے، اسی طرح عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق ہے کہ وہ آخری رات کی نماز میں جب قرأۃ کرتے تو ایک ایک حرف علیحدہ کر کے پڑھتے، حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں، قرآن تیز تیز نہ پڑھو جیسا شعر پڑھا جاتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ آیت "وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيلًا" کی تفسیر فرماتے ہیں "بيّنه تبييناً" خوب صاف صاف پڑھو (۳)

موقع کا لحاظ

اس تفصیل کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمیشہ لمبی قرأۃ کی جائے، ضرورت

---

(۱) کتاب الصلوٰۃ لابن القیم ص۱۴۱۔ (۲) ایضاً۔

(۳) ان سب روایتوں کے لئے دیکھئے قیام اللیل باب الترتیل فی القراءۃ ص۵۲۔

اور مجبوری ہو تو اسے پسِ پشت ڈال دیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اطمینان کے وقت بھی سنّت طریقہ معمول ہونا چاہیئے۔ یوں ضرورت و مجبوری یا کسی اور ضرورت کی وجہ سے قرأۃ میں کمی کی جا سکتی ہے، خود ذاتِ بابرکت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فجر کی نماز میں معوذتین تک پڑھنا ثابت ہے، حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں میں آپؐ کی اونٹنی کی نکیل تھامے ہوئے تھا کہ آپؐ نے معوذتین کی رغبت دلائی اور اہمیّت بتائی اور پھر انہیں تعلیم فرمایا، پھر مجھے خوش کرنے کے لئے ان ہی سورتوں کے ساتھ فجر کی نماز پڑھائی اور فارغ ہونے کے بعد متوجہ ہو کر فرمایا:۔

یاعقبہ کیف رأیت (مشکوٰۃ باب القرأۃ)   اے عقبہ تونے کیسا پایا۔

تعدیل ارکان

ان چیزوں کے ساتھ تعدیل ارکان بھی ضروری ہے، یعنی رکوع، سجود اور قیام وقعود باطمینان ادا کئے جائیں، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "سَمِعَ اللہُ لِمَنْ حَمِدَہ" کہتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو جاتے اور اس قدر اطمینان سے کھڑے رہتے کہ ہم کو خیال ہوتا کہ آپؐ بھول گئے اور پھر آپؐ سجدہ کرتے اور دونوں سجدوں کے درمیان اس طرح بیٹھتے کہ ہم کہتے تھے کہ شاید آپؐ کو وہم تو نہیں ہو گیا (۱)

حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ آپؐ کا رکوع، سجدہ دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور رکوع سے اٹھنا یہ سب تقریباً برابر ہوتا، سوائے قیام کے (۲)۔

---

(۱) مشکوٰۃ باب الرکوع۔   (۲) ایضاً۔

حضرت انسؓ کو کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے زیادہ مشابہ حضرت عمر بن العزیزؒ کی نماز دیکھی گئی اور ان کی تسبیحات رکوع وسجود کا اندازہ دس دس ہیں (۱)

ایک دفعہ حضرت انسؓ نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز پڑھکر لوگوں کو بتائی جس کو حضرت ثابتؓ بیان کرتے ہیں کہ ویسی نماز تم کو پڑھتے نہیں دیکھتا ہوں۔ وہ (انسؓ) رکوع سے سر اٹھاتے تو اس طرح سیدھے کھڑے ہو جاتے کہ کہنے والا کہہ اٹھتا کہ وہ بھول گئے اور پہلے سجدہ سے سر اٹھاتے اور بیٹھتے تو کہنے والا کہہ اٹھتا کہ یقیناً وہ آگے بھول گئے ہیں (۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

اسوأ الناس سرقۃ الذی یسرق من	لوگوں میں بدترین چور وہ شخص ہے جو
صلوٰتہ قالوا یا رسول اللہ و	اپنی نماز میں چوری کرتا ہے، صحابہؓ نے
کیف یسرق من صلوٰتہ قال	پوچھا نماز کی چوری کیسی؟ آپؐ نے فرمایا
لا یتم رکوعھا ولا سجودھا رواہ	نماز کی چوری اس کا رکوع اور اس کے
احمد۔ (مشکوٰۃ باب الرکوع)	سجدے پورے طور پر ادا نہ کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض امام تعدیلِ ارکان کو فرض تک کہتے ہیں، اور وجوب کا درجہ دینا تو لازمی معلوم ہوتا ہے، لہٰذا یہ تمام حدیثیں سامنے رکھی جائیں اور تخفیفِ صلوٰۃ (ہلکی نماز) کا مطلب سمجھیں، مقتدی کے ساتھ ارکانِ نماز اور حقوقِ نماز کا لحاظ بھی ضروری ہے، اسی لئے کہا گیا کہ امام کی ذمہ داری بہت اہم اور نازک ہے اور امام کو جو ضامن کہا گیا ہے اس سے اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیئے، تاکہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں پورا اُتر سکے۔

---

(۱) مشکوٰۃ عن ابی داؤد باب الرکوع۔ (۲) کتاب الصلوٰۃ لابن القیم۔

باطنی اصلاح

جس عظیم الشان عبادت کے ظاہری احکام کی بجا آوری کی تاکید کا یہ عالم ہے، بلاشبہ اس کے باطنی احکام کی اہمیّت تو اور بھی زیادہ ہوگی کیونکہ اگر ظاہر کو اعضاء و جوارح کی حیثیّت حاصل ہے تو باطن کو قلب کی، پھر اگر قلب ہی میں فساد پیدا ہو جائے تو اعضاء و جوارح کب تک کار آمد رہ سکتے ہیں. ارشادِ نبوی ہے ؛

ألا ان فی الجسد مضغة اذا	سنو! جسم میں ایک لوتھڑا ہے جس کی
صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت	اصلاح سارے جسم کو صالح رکھتی ہے،
فسد الجسد کله ألا وهی القلب.	اور اس کا فساد کل جسم کو بگاڑ دیتا ہے،
(بخاری)	اور سنو وہ "دل" ہے .

اس دل پر احسان کی پوری کیفیّت طاری ہونی چاہیئے جو جسم کا سلطان ہے، نماز کی حالت میں مسجد کی جماعت یہ محسوس کرے کہ ہم ربّ العزت کے دربار میں اس کے روبرو کھڑے ہیں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے، اعمال و افعال کو بھی اور دل کی ہر ایک کھٹک کو بھی .

ان تعبد الله كأنك تراه فان	اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو تو اس احساس
لم تكن تراه فانه يراك .	کے ساتھ کہ اس کو دیکھ رہے ہو ورنہ وہ
(بخاری)	بہرحال دیکھ رہا ہے .

نمازی کے دل میں جب یہ یقین جاگزیں ہو جائے گا تو وہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتے ہی اپنے کو قہّار و جبّار اور غفور و رحیم مالک کے روبرو پائے گا.

اور اس کی عظمت و جلال اور اس کی رحیمی و کریمی کا پرتو اپنی طرف بڑھتے دیکھے گا، جس سے نمازی کا ظاہر و باطن اطاعت کا مجسّمہ بن جائے گا اور دل نورانی کرنوں سے چمک اُٹھے گا۔

خشوع و خضوع

اسی کیفیّت کا نام اصطلاح میں "خشوع و خضوع" ہے جو عبادت کی جان اور بندگی کی روح ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (مومنون: ۱-۲)	ان مسلمانوں نے یقیناً فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ خشوع گو صحتِ نماز کی شرط نہیں مگر قبولیت کی شرط تو بہرحال ہے۔ چنانچہ بعض مفسّرین نے اس کو لکھا ہے (۱)

خشوع کی حقیقت کیا ہے؟ ابن رجب حنبلیؒ لکھتے ہیں:

اصل الخشوع هو لين القلب و رقته وسكونه وخضوعه وحرقته فاذا خشع القلب تبعه جميع الجوارح والاعضاء لانها تابعة له۔ (الخشوع فی الصلوٰۃ ص۲)	خشوع کی اصلیّت دل کا نرم ہونا اور اس کا پسیجنا ہے، نیز اس کے اطمینان اور جھکاؤ اور سوزش کا نام ہے، قلب جب جُھک پڑتا ہے تو سارے اعضاء و جوارح اس کی پیروی میں جُھک پڑتے ہیں، کیوں کہ یہ سب اس کے تابع ہیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ اعضاء و جوارح قلب کے تابع ہوتے ہیں، گویا اس جسم کی دنیا میں دل کو سردار کی حیثیت حاصل ہے جس کے صلاح و

---

(۱) بیان القرآن ۷/۸۵۔

فساد کا اثر بقیہ حصوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے اور جس کی ہر حرکت و سکون کا ساتھ ایک ایک عضو پر پڑنا از بس ضروری، جیسا کہ ابھی اوپر حدیثِ نبویؐ گذری یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ خشوع کا پہلا پر تو قلب پر پڑتا ہے، جس کی طرف حضرت علیؓ نے اشارہ فرمایا:۔

الخشوع خشوع القلب (۱) خشوع دل کا جھک پڑنا ہے۔

پھر یہ اثر دل سے اعضاء و جوارح پر پھیل پڑتا ہے، چنانچہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ خشوع دل میں پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے آنکھیں پست ہو جاتی ہیں اور دل جھکاؤ کو قبول کرتا ہے (۲) اسی علّت کے پیشِ نظر بعض سلفِ صالحین فرماتے ہیں جس نمازی کو دیکھو کہ وہ اپنے جسم اور کپڑوں سے کھیل رہا ہے سمجھ لو اس کا دل خشوع کے اثر سے بیگانہ ہے (۳)

خشوع کا حصول

نماز میں خشوع کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ یہ سوال گو اس زمانہ میں اہم ہے مگر جن لوگوں کو ایمان کی حلاوت نصیب تھی ان کے لئے یہ سوال کوئی خاص سوال نہ تھا، ایمان کے ضعف و اضمحلال اور اخلاص و للّٰہیت کے فقدان نے ہمارے لئے دشواری پیدا کر دی ہے ورنہ ہم جس ظاہری اہتمام کے ساتھ مسجد تک پہنچتے ہیں اتنا بھی اہتمام باطن کا ہوتا، تو بھی بسا غنیمت تھا۔ ایمان کی تازگی اور اس احساس کے ساتھ حاضری ہو کہ دربارِ الٰہی میں جہاں رب العٰلمین جلوہ افروز ہے کھڑے ہیں، یہ دست بستگی اسی کے سامنے ہے، ہم اس کے جاہ و جلال کا مشاہدہ کر رہے ہیں

(۱) ابن کثیر ۳/۲۳۸۔ (۲) ایضاً۔ (۳) الخشوع فی الصلوٰۃ۔

اور وہ ہمارے قیام و قرأۃ کو ملاحظہ کر رہا ہے، ظاہر کو بھی دیکھتا ہے اور باطن کو بھی اور اللہ اکبر کہہ کر ہم نے تھوڑی دیر کے لئے دنیا کے رشتوں کی رگ کاٹ ڈالی ہے اور اپنا رشتہ مالکِ حقیقی کے ہاتھ میں دیدیا ہے' اس کی عظمت اور کبریائی سامنے ہے اور ہم اس میں گم ہیں۔

یہ یقین دل کی بھٹی کو تیز کر دے گا، آلائشوں، زنگوں اور میلوں کو خاکستر بنا کر کندن بنا دے گا، اور "رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کے جملوں کے ساتھ دل اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے گا اور "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" پر پہنچ کر دل اور اس کا پورا حلقہ امید و بیم اور خشیت و محبّت سے مملو ہو جائے گا اور ان کلمات کے ساتھ دل کے ساز کا تار تار جنبش میں آجائے گا اور نماز سے جب فارغ ہو چکے گا تو اس کی زبان پر وہی کلمات ہوں گے جو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "جعلت قرۃ عینی فی الصّلوۃ"۔

اس کے لئے جو مانع نظر آئے اسے دفع کرنے کی کوشش کرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا، اس باب میں کسی چیز کو برداشت نہیں فرمایا۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے سوال پر فرمایا تھا کہ نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا۔

ھو اختلاس یختلسه الشیطان من صلاۃ العبد۔ (بخاری)	وہ اُچک ہے جو شیطان بندہ کی نماز سے اُچک لیتا ہے۔

آپؐ نے ایسی چیزوں سے بھی اجتناب فرمایا ہے جن سے کسی درجہ میں خلل کا اندیشہ ہو سکتا ہے، چنانچہ ایک بار حضرت عائشہؓ نے دروازہ پر ایک خوبصورت باریک پردہ لٹکا رکھا تھا، آپؐ نے نماز شروع کرنا چاہی

تو فرمایا، میرے سامنے سے اپنا یہ منقّش پردہ ہٹا لو (۱) اسی طرح ایک دفعہ بوٹیدار چادر میں آپؐ نے نماز ادا کی مگر نماز بعد اسے فوراً بھجوا دیا اور اس کی جگہ سادہ منگوا لی اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس چادر نے میری توجہ ہٹا دی۔(۲)

یہ تو آپؐ کا اپنا حال تھا، امّت کو بھی اس ہدایت سے نوازا، اور ساتھ ہی ہر ایسی چیز سے اور ہر ایسے فعل سے منع فرمایا جس کو خشوع کے خلاف محسوس فرمایا، مثلاً یہ کہ بھوک میں کھانا سامنے آجائے اور طبیعت کا رجحان کھانے کی طرف ہو تو پہلے کھانا کھا لیا جائے، پھر نماز پڑھی جائے آسمان کی طرف دیکھا نہ جائے، ادھر اُدھر تاکا نہ جائے، جمائی نہ لی جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ پاخانہ، پیشاب کی خلش کے وقت فراغت سے پہلے نماز نہ پڑھی جائے (۳)

استقبالِ قبلہ اور اس کا اثر

نماز میں استقبالِ قبلہ کا حکم اگر ایک طرف نظامِ وحدت کی ایک کڑی ہے تو دوسری طرف اس میں خشوع وخضوع کا شرعی اہتمام ہے تاکہ دل جمعی پیدا ہو سکے اور ساری جماعت میں یکجہتی ہو، مختصر لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ نماز میں دخول ظاہری طور پر افعال بالجوارح اور خلافِ ادب کلام باللّسان کو حرام کر دیتا ہے اور نماز کی نیّت جو باطنی ہے وہ باطن پر اثر انداز ہوتی ہے اور دوسرے افکار کو حرام قرار

---

(۱) بخاری ومسلم کتابُ اللباس۔

(۲) مسلم باب کراہیۃ الصلوٰۃ فی ثوب لہ اعلام ۱/۲۰۸۔

(۳) یہ سب حدیثیں بلوغ المرام باب الخشوع میں دیکھی جائیں۔

دیتی ہے جو غیر اللہ سے متعلق ہوں، یہ وہ امور ہیں جن کا اہتمام علماءِ سلف رحمہم اللہ تعالیٰ اور صحابہؓ کرامؓ نے اپنے اپنے زمانہ میں خوب ہی فرمایا اور پچھلوں کے لیئے نشانِ راہ چھوڑ گئے۔

پہلوں کا خشوع

ابوداؤد شریف "بابُ الوضوءِ بالدّم" میں ایک صحابی کا ذکر آیا ہے کہ حالتِ نماز میں ان کو دشمن کے تیر آ آ کر لگتے رہے، خون بھی نکلا مگر انہوں نے نیت نہ توڑی اور برابر نماز میں اسی طرح مصروف رہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ عمر فاروقؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ امامت کرتے ہوئے آپؓ کو زخم لگایا گیا، آپؓ کی جگہ دوسرے نے امامت کی مگر نماز میں کوئی فرق نہ آیا۔

عبداللہ بن الزبیرؓ کا نماز میں یہ حال ہوتا کہ بے حس و حرکت سے معلوم ہوتے دیکھنے والا کہتا یہ بے جان درخت کی لکڑی ہے جس کو ہوا ہلا رہی ہے۔ ایسی محویّت ان کو نماز میں ہوتی تھی (۱)

ابن سیرینؒ نماز میں جب کھڑے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی خشیت سے ان کے چہرہ کا خون خشک پڑ جاتا تھا (۲)

حضرت مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ جب نماز میں داخل ہوتے تو محویت و خشیتِ الٰہی کا یہ عالم ہوتا کہ کوئی بھی آہٹ آپ کو سننے میں نہیں آتی (۳)

---

(۱) احکام القرآن لابن العربی سورۂ مومنون۔

(۲) کتاب الصلوٰۃ للامام احمدؒ۔ (۳) ایضاً۔

حضرت عامر بن عبد قیس رضؓ کے متعلق بیان ہے کہ آپؓ فرماتے کہ نماز پڑھتے ہوئے مری گردن پر خنجر چل جائے تو یہ برداشت یہ برداشت نہیں ہے کہ نماز میں دنیا کے معاملہ میں فکر کروں (۱)

حضرت سعید بن معاذؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی بھی کوئی ایسی نماز نہیں پڑھی جس میں دنیا کی فکر میرے دل میں پیدا ہوئی ہو (۲)

خوش نصیب ہیں وہ مسلمان جو اس اہتمام سے نماز باجماعت پڑھتے ہیں اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شعبہ میں پیروی کرتے ہیں کہ آپؐ کا نماز میں یہی عالم ہوتا تھا۔ ایک صحابی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہیں اور آپؐ کا سینہ ہانڈی کی طرح جوش مار رہا ہے اور آہ و بکا کا ایک شور سا بپا ہے، اس کی آواز عرشِ معلیٰ تک اپنا اثر قائم کر رہی ہے، یہ اور اس طرح کے بیسیوں واقعات ہیں جن کی تفصیل یہاں مقصود نہیں ہے اور یہ سب کیوں نہ ہو جب کہ ساری عبادت واطاعت کی جان یہی اخلاص ہے "وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" (اعراف : ۲۹)

اس اثر کے رسوخ کے لئے ریاکاری، دکھاوا، شہرت اور عزت کے سارے بُت پاش پاش کر دیئے جائیں جو راستہ کا پہاڑ ہیں اور گمراہی کا سرچشمہ، قرآن نے پکار کر کہا:۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ	ان نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے
هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ	جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں اور
اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ	جو اپنی نمازوں میں ریاکاری کرتے ہیں
الْمَاعُوْنَ۔ (الماعون)	اور برتنے کی چیزوں کو روکتے ہیں۔

(۱) کتاب الصلوٰۃ للامام احمد۔ (۲) ایضاً

دربارِ الٰہی اسلام کی نظر میں

مساجد کے اجتماعی نظام کی مختصر تفصیل گذشتہ صفحات میں آپ نے ملاحظہ فرمائی جس سے ان گھروں کی دینی اور دنیوی اہمیّت کا اندازہ ہوا ہوگا اور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان کا وجود ہمارے لئے کس قدر ضروری ہے اور قدرت نے اس سلسلہ کو قائم و دائم فرماکر ہم پر کتنا احسان کیا ہے۔

اَب بتانا ہے کہ اسلام نے ان مقدس درباروں کو کیسے سراہا ہے اور ان کی قدر و منزلت کس پیرایہ میں بیان کی ہے، یکسران کو مشکوٰۃِ نبوّت کی روشنی میں دیکھئے اور کتابِ الٰہی میں تلاش کیجئے۔

قرآن میں تذکرہ

سب سے پہلے اس سلسلہ میں کتابِ الٰہی کی چند آیتیں درج کی جاتی ہیں جن میں صاف لفظوں میں ان کی شرافت و قبولیت کا اعلان کیا گیا ہے اور ان کی ظاہری و باطنی وقعت کی طرف اشارہ ہے۔

مساجد خدا کی ہیں

دنیا اور دنیا کی ساری مخلوقات اللہ تعالیٰ کے قبضہ و قدرت میں ہیں اور سب کی سب اسی کی قدرت سے خلعتِ وجود سے ممتاز ہیں،

دنیا کا کوئی ذرّہ ایسا نہیں ہے جس کو کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نہیں، لیکن جس کو اللہ تعالیٰ خود کہدے "یہ میرا ہے" اس کی قسمت کا کیا کہنا، اس کی عزّت و قبولیّت اپنا ایک خاص مقام حاصل کرلیتی ہے جو دوسرے کے حصّہ میں نہیں ہے، انھی میں یہ مقدس دربار بھی ہیں جن کو ہم "مسجد" کے مختصر لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی نسبت ربّ العزت نے اپنی جانب فرمائی ہے اور ان کو اپنے ذکر کے لئے مخصوص فرمایا ہے، جس میں کسی اور کی شرکت منظور نہیں۔

وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ (الجن: ۱۸) مسجدیں اللہ ہی کی ہیں پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔

بلاشبہ یہ نسبت ساری دوسری نسبتوں سے بڑھ کر ہے اور اس نسبت سے جو شرافت اور بزرگی حاصل ہوتی ہے وہ اور شرافتوں سے بالاتر، پھر تخصیص کی مزید عزت، اس کی وقعت و اہمیّت کا زبردست مظاہرہ ہے۔

مساجد کی خدمت

کسی کو جب اپنا بنا لیا جاتا ہے تو پھر یہ گوارا نہیں ہوتا کہ اس کو اس کے حوالہ کر دیا جائے، جو اس کا مخالف ہو، کیوں کہ جب اس کو مالک سے عقیدت نہیں، دل میں اس کی خشیت و محبت نہیں اور وہ اس کے احکام پر اطاعت کا سر رکھنے والا نہیں ہے تو یقینی طور پر وہ اپنی مفوّضہ خدمت کو بحسن و خوبی ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لے گا، پس یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مشرکوں اور نافرمانوں کو جب مسجد اور اس کے مالک سے قلبی لگاؤ نہیں

تو اس مسجد کی خدمت ربّ العزت ان کے ہاتھ میں کیوں کر چھوڑے گا، ارشاد فرمایا:۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شَاهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ۔ (التوبۃ: ۱۷)	مشرکوں کی لیاقت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مسجدیں آباد کریں جس حالت میں کہ وہ اپنے اوپر کفر و انکار کا اقرار کر رہے ہیں۔

یہ دربارِ الٰہی کے احترام کا اظہار ہے تاکہ ان گھروں کی قدر و منزلت دلوں پر نقش ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گھر اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں، ان کی وہی خدمت کریں جو خدا کے دوست ہوں جن کے دل میں اس کی خشیّت و محبّت گھر کر چکی ہو تاکہ وہ ان کے بنانے میں عقیدت و محبّت کی پونجی صرف کر سکیں اور یہ سمجھ کر خدمت کے لئے کمر باندھیں کہ یہ دنیا کے پروردگار کا گھر ہے اور اس کے جاہ و جلال اور عرض و نیاز کا دربار۔

حقِ خدمت مومنِ کامل کو

یہی وجہ ہے کہ ربّ ذوالجلال والاکرام نے جن کو حقِ تعمیر بخشا ہے ان کے لئے ظاہری اور معنوی دونوں طرح کی پابندی رکھی ہے، یعنی ان کا دل اور باطن بھی مومن ہو اور ظاہر اور جسم بھی، قلب ایمان کی دولت سے معمور ہو تو جسم عمل کی دولت سے مالا مال۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور قیامت کے

اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَى الزَّكٰوۃَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰۤئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۔ (التوبۃ: ۱۸)	دن پر ایمان لائیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں، پس انہی سے توقع ہے کہ مقصود کو پہنچ جائیں ۔

"ایمان باللہ" لاکر بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے اس کو سچی عقیدت ہو، اور اپنے کو صحیح معنیٰ میں احکامِ الٰہی کے تابع قرار دے لے اور "آخرت پر ایمان" سے یہ ظاہر فرمایا گیا کہ اس کو اپنے سارے کاموں کے حساب و کتاب کی ذمہ داری کا پورا احساس بھی ہو اور پھر اس میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب و عقاب کا یقین بھی، یہ دل اور نیّت کی اصلاح کی شرط ہے، باقی ظاہری طور پر بھی وہ ایسا ہو جس سے خدا پرستی نمایاں ہو، بدنی اعتبار سے بھی اور مالی لحاظ سے بھی، جس کو "اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کاموں میں شہرت و عزّت اور ریا و سُمعہ کا فریب آجاتا ہے اس لئے یہ بھی فرمادیا گیا کہ یہ سب کسی اور کے خوف سے نہ ہو بلکہ جو کچھ ہو ربّ العزت کی خشیّت سے ہی ہو جس کو "وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ" کے مختصر جملہ میں بیان فرمایا ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت چاہے وہ ذہنی ہو چاہے خارجی اللہ تعالیٰ کی خشیت غالب رہے۔

کوئی جب ان ساری خصوصیتوں سے سرفراز ہو کر دربارِ الٰہی کی خدمت انجام دے گا تب کہیں جاکر وہ اس کام میں حق راستہ کو پائے گا اور یہ کھلی حقیقت ہے کہ ان میں سے شاید کوئی خصوصیّت بھی مشرک میں نہیں پائی جاتی، بخلاف مؤمن کے کہ وہ کسی نہ کسی درجہ

میں ضہ ءران کا حامل ہوتا ہے ۔

بار بار غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسجد کی خدمت کے لئے ان قیود کو کیوں بیان فرمایا، کیا ان سے مسجدوں کی عظمت و شوکت کا اظہار نہیں ہوتا ہے ۔

یَعۡمُرُ کے معنیٰ

یَعۡمُرُ کا لفظ بہت سے معنوں کو شامل ہے، کرخیؒ فرماتے ہیں ۔

اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ ای بنحو المبناء والتزین بالفرش و السراج وبالعبادۃ وترك حدیث الدنیا (جمل ۲/۲۷۱)	اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ کے معنیٰ ہیں جیسے بنانا فرش اور روشنی سے زینت دینا، عبادت کرنا اور دنیا کی باتیں مسجد میں نہ کرنا ۔

مسجد کی تعظیم و تکریم اور اس میں عبادت

اوپر کی آیتوں میں مسجدوں کی بنیادی حیثیت ظاہر کی گئی ہے اَب ان کے عملی پہلو پر نظر کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کیا مقصد رکھا ہے اور وہ ان گھروں میں کیا چاہتا ہے، کیوں کہ کسی چیز کی تعمیر خود مقصود بالذات نہیں ہوتی، بلکہ اس کے اغراض و مقاصد اور اس کے مصالح و حِکم مطلوب ہوتے ہیں، ارشادِ ربانی ہے :۔

فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَیُذۡکَرَ فِیۡهَا اسۡمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیۡهَا بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ۔	ان گھروں میں حکم دیا اللہ نے کہ ان کی تعظیم کی جائے اور ان میں اس کا نام لیا جائے اور صبح و شام ان میں اس کی

پاکی بیان کرتے ہیں۔ (النور: ۳۶)

اس آیت میں "بیوت" سے مراد مسجدیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بیان فرمایا ہے کہ ان کی تعمیر کے بعد یہ فریضہ ہے کہ ان کی تعظیم و تکریم کا حق ادا کریں اور اس میں یہ بھی ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی یاد ہوتی رہے اور دن رات اس کی تقدیس بیان کی جائے اور ہمہ دم اسے تسبیح و تہلیل سے آباد رکھا جائے، اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو پھر مسجد کا حق پورا پورا ادا نہ ہوا اور یہ سب اس طرح سے ہو کہ دل ودماغ پر یہ امر مستحضر رہے کہ ہم اللہ کے گھر میں ہیں تاکہ دربارِ الٰہی کے آداب میں فرق نہ آنے پائے بلکہ آداب کا خیال اس کی لذّت کو دوچند کردے اور اگر یہ نہ ہو تو پھر اس کو یقین کرلینا چاہیئے کہ تعظیم و تکریم کے لوازمات اس کو میسّر نہیں ہیں۔

بہرحال یہ بات تو روشن ہوگئی کہ مسجدوں کا وجود اس لئے عمل میں آیا کہ ان میں ذکر اللہ کی گونج ہو اور ان میں پہونچ کر ربّ العزت کا دھیان تازہ ہوجائے، اور جس جگہ اتنا اہم کام ہو بلکہ اسی لئے اس کا وجود عمل میں آیا ہو اس کی اہمیّت کتنی ہوگی، یہ ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

اخلاص و للّٰہیت

پھر اللہ کی یاد ہو تو کس طرح؟ کہ ظاہر سے زیادہ باطن پر اثر انداز ہو، یادِ الٰہی میں یہاں کسی کی ذرّہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے اور دل اخلاص کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہو، یادِ خدا جہاں بھی ہو خالص ہی ہو لیکن خصوصیّت سے اس جگہ اور بھی خلوص و للّٰہیت کا جذبہ کارفرما ہونا

چاہئے کہ یہ دربارِ الٰہی ہے اور محبوبِ حقیقی کا جلوہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ (الاعراف: ۲۹)

اور تم اپنا چہرہ ہر مسجد کے پاس سیدھا رکھا کرو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت مخلص بن کر کیا کرو۔

مسجدوں کی بڑائی کے ذکر کا یہ بھی ایک پیرایہ ہے کہ وہاں پہنچ کر دل میل کچیل سے پاک کر لو اور نیّت کے کل پُرزے اخلاص کے آبِ زمزم سے دھو ڈالو تاکہ کہیں سے شرک کی بو نہ آنے پائے کیوں کہ یہ وہ دربار ہے جہاں خدا سے سرگوشی ہوتی ہے اور یہی وہ گھر ہے جس کو دنیا کی جنت سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہیں۔

طہارت و نفاست

باطن میں جس عقیدہ نے جڑ پکڑ لی، ظاہر میں اس کے برگ و بار پیدا ہونے ضروری ہیں، جس کی عزّت ہم دل میں کریں گے یقینی طور پر عمل سے اس کو ظاہر بھی کرنے کی کوشش کریں گے، یہی وجہ ہے کہ درجۂ کمال میں ایمان و اسلام ایک ہو جاتے ہیں، ایک طرف تصدیق بِالجنان کا حکم ہے تو دوسری طرف عمل بِالجوارح کا بھی مطالبہ موجود ہے تو جب قرآن نے مساجد کے باطنی احترام کا حکم فرمایا لہذا ساتھ ہی ظاہری اہتمام کو بھی نہ چھوڑا، ارشاد فرمایا:

يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔ (الاعراف: ۳۱)

اے آدم کے بیٹو! مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباسِ زینت پہن لیا کرو۔

یعنی جب عرض و نیاز کے لئے مناجات و سرگوشی کے لئے دربارِ الٰہی میں آؤ تو صاف ستھرا لباس زیب تن کر لیا کرو جو پاک و صاف اور شرعی حدود کے مطابق ہو، تم احکم الحاکمین کے سامنے اس کے دربار میں حاضری دے رہے ہو تو ظاہری آداب کا بھی پورا پورا لحاظ رکھو تاکہ ظاہری طور پر بھی کسی کو بے ادبی کا شبہ نہ ہو سکے، یہ درست ہے کہ وہ پہلے دل کی گہرائی کو دیکھتا ہے مگر دل کی صفائی کا اثر جسم پر ہونا بھی ضروری ہے اس میں ذرّہ بھر شک نہیں کہ دل کی ویرانی کے ساتھ جو زیب و زینت ہوتی ہے وہ کسی درجہ میں مطلوب نہیں لیکن موجودہ دَور میں دین کی رسمی محبّت کی وجہ سے لباس میں جو بے پروائی ہوتی ہے وہ بھی کسی درجہ میں پسندیدہ نہیں ہے، اس آیت سے مسجد کے لئے حسن ہیئت کا حکم بھی مستفاد ہوتا ہے جو مسجد کی بزرگی و احترام کا ایک دلنشیں طریقہ ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے، اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نماز کے وقت ہیئت اچھی سے اچھی ہونی چاہیئے (۱)

صاحبِ تفسیراتِ احمدی لکھتے ہیں:۔

ومن السنة ان يأخذ الرجل	سنّت ہے کہ نماز کے لئے اچھی سے
احسن هيئة للصّلوة وفيه	اچھی ہیئت اختیار کرے اور اس
دليل علىٰ وجوب ستر العورة	میں یہ بھی دلیل ہے کہ نماز میں سترِ
فى الصّلوٰة۔ (ص۳۲۱)	عورت واجب ہے۔

بہرحال قرآن پاک نے مسجدوں کی تعظیم و تکریم کے دونوں

---

(۱) ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۰۔

پہلو بیان کئے ہیں اور ان کی قدر و منزلت کو ہر طرح ذہن نشین کرنا چاہا ہے۔

مسجد کا مخالف سب سے بڑا ظالم ہے

مسجدوں کی عظمتِ شان کا یہ بھی طریقہ ہے کہ جو ان کی مخالفت کرے وہ عنداللہ معتوب قرار پائے اور واقعہ ہے کہ جس کو خدا ظالم کہے اس سے بڑھ کر معتوب اور کون ہو سکتا ہے، چنانچہ ایک آیت میں یہی بیان ہے کہ جو دربارِ الٰہی کی مخالفت کسی طرح بھی کرتے ہیں وہ سب سے بڑھ کر ظالم ہیں، کیونکہ ان کی عظمت کا حال تو یہ ہے کہ جب ان میں داخلہ ہو تو خشیتِ الٰہی اس پر چھائی ہوئی ہو۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ط اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (البقرۃ: ۱۱۴)	اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں ذکر اللہ کو بند کرادے اور اس کی ویرانی کی کوشش کرے، ان لوگوں کو تو کبھی بے باک ہو کر ان میں قدم بھی رکھنا نہ چاہیے، ان کی دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور آخرت میں بھی ان کی سزا سخت ترین ہوگی۔

شانِ نزول میں اگرچہ آیت خاص ہے مگر اپنے حکم میں عام ہے اور تمام مسجدوں کا یہی حکم ہے، جو بھی مقاصدِ مساجد کی تکمیل میں مانع بنے گا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی یاد کو قصداً روکے گا، موردِ عذاب

ہوگا اور عنداللہ وہ بڑا ظالم قرار پائے گا، اس میں شبہ نہیں کہ اپنے حال کے اعتبار سے کفر و شرک ہی ظلمِ عظیم ہے مگر اس لحاظ سے کہ تخریبِ مساجد کے خواہاں دوسروں کو ہدایت سے روکتے ہیں اور اسلام کے ایک بڑے شعار کو مٹاتے ہیں، وہ اپنے اس فعل میں کفر و شرک سے بھی بڑھ کر بُرے کام کے مرتکب ہوتے ہیں، کیونکہ یہ دربارِ الٰہی روئے زمین پر اسلام کا ایک بڑا شعار ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں

مساجد کی اہمیّت کا ایک اور طرزِ بیان اختیار فرمایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ربّ العزت ان مقدس گھروں کی حفاظت و نگرانی فرماتا ہے، کوئی قوم جب حد سے تجاوز کرتی ہے اور معابد کے مٹانے کے درپے ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ و برباد کر ڈالتا ہے اور اس طرح اپنے معبدوں کی نگرانی کر کے اسے بچا لیتا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔

(الحج: ۴۰)

اگر ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ لوگوں میں ایک دوسرے کا زور نہ گھٹاتا تو اپنے اپنے زمانہ میں نصاریٰ کے عبادت اور خلوت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں بکثرت اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے، منہدم ہوگئی ہوتیں۔

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں اس وقت کی

شریعت کے مطابق جو گھر بھی بنائے گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی اور ان کو دشمنوں کے دست برد سے بچایا اور ہمارا یہ دَور جو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا دَور ہے اور یہ آخری شریعت ہے اس کے مطابق جو صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے گھر ہیں ان کی منجانب اللہ حفاظت ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی، بعض حفاظت ایسی ہوتی ہے جس کو ہم محسوس نہیں کر پاتے ہیں اور بعض کو ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔

تاریخ میں مسجدِ حرام پر ابرہہ بادشاہ کے حملہ کی داستان تازہ ہے اور اس کا جو حشر ہوا وہ قرآنِ پاک جیسی ان مِٹ کتاب میں مندرج ارشادِ ربّانی ہے:-

وَاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ	اور ان پر غول کے غول پرندے بھیجے جو لوگوں
تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ	پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے سو اللہ تعالیٰ نے
فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ۔	ان کو کھائے ہوئے بھوسہ کی طرح (پامال)
(الفیل: ۳-۵)	کر دیا۔

یہ کس قدر کھلی حفاظت تھی جو تاریخ میں اَب تک تازہ ہے۔ ۵

مسجد سے متعلق قرآن پاک کی یہ چند آیتیں جو مصرّح ہیں پیش کر دی گئیں، ضمناً جو تذکرہ آیا ہے اسے یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے، ان میں بار بار غور کیجئے اور ہر پہلو سے ان میں فکر و نظر سے کام لیجئے۔

احادیث میں فضائل

اَب رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات بھی ملاحظہ کرلیں

تاکہ ان درباروں کی وقعت و حرمت کھُل کر سامنے آجائے اور جو پہلو اجاگر نہ ہوسکا ہے اس پر ایک ہلکی روشنی پڑ جائے، کیا عجب ان سے وہ گرہیں کھُل جائیں جو اَب تک نہ کھُل سکی تھیں۔

مسجد اللہ کو پیاری ہے

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ربّ العزت کے یہاں جگہوں میں محبوب ترین مسجدیں ہیں، اور مبغوض ترین بازار (۱)

مسجد میں آنے والے اللہ کے مہمان ہیں

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلمان صبح و شام مسجد میں حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں مہمانی کا کھانا تیار کرتا ہے جو جنت میں صبح و شام مہمانی پیش کی جائے گی (۲) مسجدیں چوں کہ اللہ تعالیٰ کا گھر کہلاتی ہیں اور یہ مسلّم ہے کہ عموماً میزبان مہمان کی دعوت کرتا ہے تو بات سمجھنے کی ہے کہ نمازی حکماً اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوئے، لہذا اللہ تعالیٰ یہاں کے بدلہ وہاں جنت میں مہمانی پیش کرے گا۔

نورِ کامل کی بشارت

ایک بار آپؐ نے ان لوگوں کو جو تاریکی میں مسجد حاضر ہوتے ہیں نورِ کامل کی بشارت سنائی۔

---

(۱) مسلم باب فضل المساجد ۱/۲۳۶۔
(۲) مشکوٰۃ باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ عن البخاری و مسلم۔

بشر المشائین فی الظلم الی المساجد بالنور التام یوم القیامۃ۔ رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ باب المساجد)	تاریکی میں مسجد جانے والوں کو نورِ کامل کی بشارت دو جو قیامت کے دن حاصل ہوگا۔

مسجد کی حاضری رحمتِ الٰہی کا ذریعہ ہے

ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ سات شخصوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں اس دن پناہ دے گا جس دن اس کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ ہی نہ ہوگا ان سات میں ایک وہ شخص ہوگا کہ وہ جب مسجد سے نکلتا ہے تو واپسی تک اس کا دھیان اسی طرف لگا رہتا ہے (۱) ایک حدیث ہے کہ جو شخص مسجد میں داخل ہوا، وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں ہے، ربّ العزت اسے نقصان، خسران وغیرہ سے محفوظ رکھتا ہے (۲) ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس شخص کو دیکھو کہ مسجد سے محبّت کرتا ہے اور اس کی خدمت کرتا ہے، اس کے مؤمن ہونے کی شہادت دو (۳)

حدیث میں "تعاهد" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی مسجد کی نگہداشت و خبرگیری کرنا، اس کی محافظت و مرمّت کرنا، جھاڑو دینا، نماز پڑھنا، عبادت میں مشغول رہنا، ذکر کرنا، علومِ دینی کا درس دینا ہے۔ (۴)

مجاہد فی سبیل اللہ

ایک دفعہ آپؐ نے مسجد جانے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ رحمتِ

---

(۱) مشکوٰۃ باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ عن البخاری۔ (۲) ایضاً عن ابی داؤد۔
(۳) ایضاً عن ابن ماجہ وغیرہ۔ (۴) مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحی لکھنوی ۲/۴۱

الٰہی میں غوطہ لگانے والے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہیں (۱)

مساجد اللہ کے گھر ہیں

مسجدوں کی عظمت کو مختلف پیرایوں میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ان کو اللہ تعالیٰ کے گھر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

المساجد بیوت اللّٰہ وقد ضمن	مسجدیں خانۂ خدا ہیں اور یہ جس کا
اللّٰہ لمن کانت المساجد بیتہ	گھر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے
بالروح والراحۃ والجواز علی	مہربانی، آرام اور پل صراط سے گذار کر
الصراط الی الجنۃ (۲)	جنت میں پہنچانے کی ضمانت لی ہے۔

یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ گھر اور چہار دیواری میں سکونت کا محتاج ہے، ان تمام چیزوں سے اللہ تعالیٰ پاک ہے، مطلب یہ ہے کہ ان گھروں پر اس کا خاص فیضانِ رحمت ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں مسجدوں کو آخرت کا بازار کہا گیا ہے۔

مساجد جنت کے باغ ہیں

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دلنشیں طریقہ سے فرمایا تم جب جنت کے باغوں سے گذرو تو آسودہ ہو کر کھا پی لو، صحابۂ کرامؓ

(۱) کنز العمال ۳/۱۱۵۔

(۲) کنز العمال ۴/۱۲۴۔

نے دریافت کیا کہ جنت کے باغات کون؟ ارشاد ہوا "مساجد" پھر پوچھا گیا، آسودہ ہو کر وہاں کھانا کیوں کر؟ ارشاد فرمایا: سُبحان اللہ والحمدُ لِلّٰہ ولا الٰہ الّا اللہ واللہ اکبر کا ورد (۱)

مساجد دنیا کی بہترین جگہ

دربارِ رسالتؐ میں ایک یہودی پہنچا اور اس نے پوچھا کہ دنیا میں سب سے بہتر جگہ کون سی ہے؟ رحمتِ عالم صلعم نے یہ سن کر سکوت فرمالیا اور کہا میرا یہ سکوت روح الامینؑ کی آمد تک ہے، آپؐ ابھی اسی حال میں تھے کہ حضرت جبریلِ امینؑ تشریف لے آئے، حضورؐ فرماتے ہیں کہ میں نے وہ سوال ان پر پیش کر دیا، جبریلِ امینؑ فرمانے لگے، میرا علم اس سلسلہ میں آپؐ سے زیادہ نہیں ہے، ہاں پروردگارِ عالم سے معلوم کر کے بتا سکتا ہوں، پھر تھوڑی دیر میں حضرت جبریلؑ آکر کہنے لگے اے اللہ کے پیارے رسولؐ! دربارِ ایزدی میں حاضر ہوا، اور اس قدر قریب ہوا جتنی قربت کبھی نہیں ہوئی تھی، آپؐ نے پوچھا وہ نزدیکی کیسی تھی؟ روح الامین نے جواب دیا میرے اور رب العزت کے درمیان ستر ہزار نوری پردے حائل تھے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے سوال کے جواب میں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دنیا کی بدترین جگہ بازار ہیں، اور اس کی بہترین جگہ "مساجد" (۲)

---

(۱) مشکوٰۃ باب المساجد عن الترمذی۔

(۲) مشکوٰۃ باب المساجد عن ابن حبان۔

مسجد کی برکت

حضرت معاذ بن جبلؓ ایک جلیل القدر صحابی ہیں، ان کا بیان ہے کہ ایک دن خلافِ معمول صبح کی نماز میں تاخیر ہوگئی، معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب نکل آئے گا، اتنے میں آنحضرت صلعم تشریف لائے، اقامت کہی گئی اور آپؐ نے نماز پڑھائی، سلام پھیرتے ہی آواز دی، تم لوگ اپنی اپنی جگہ ٹھہر جاؤ۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر آنحضرت صلعم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، تاخیر کی وجہ بیان کرتا ہوں، بات یہ ہوئی کہ میں رات میں نیند سے بیدار ہوا، جو کچھ نماز میرے لئے مقدر تھی وضو کر کے ادا کی پھر حالتِ نماز ہی میں غنودگی کی کیفیّت طاری ہوگئی اور بوجھل سا ہوگیا کہ معاً اپنے کو پروردگار عالم کے پاس پایا جو اپنی احسن صفت کے ساتھ جلوہ گر تھے، ارشاد باری ہوا "اے محمدؐ!" میں نے کہا "لبیک ربّ" حکم ہوا، بتاؤ ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے کس باب میں جھگڑتے ہیں" اس سوال کو تین بار فرمایا، میں نے ہر بار یہی کہا "لا ادری" (میں نہیں جانتا) آپؐ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ قدرت مجھ پر ڈالا تا آنکہ اس کا نمایاں اثر میں نے محسوس کیا، اس کے بعد ہر چیز مجھ پر منکشف ہوگئی اور میں نے ان کو خوب اچھی طرح جان لیا، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اے محمدؐ!" آپؐ کہتے ہیں کہ میں نے لبیک کہا، حکم ہوا ملاءِ اعلیٰ کس بات میں الجھ رہے ہیں، اب میں نے کہا "کفّارات میں" (یعنی گناہوں کا کفّارہ کون عمل بنتا ہے؟)
ارشادِ باری ہوا، وہ کیا ہیں؟ میں نے جواب میں کہا:۔

(۱) کھانا کھلانا (مسکینوں محتاجوں کو)

(۲) نرمی سے بات چیت کرنا (زیر دستوں اور ٹوٹے ہوئے دل والوں سے)

(۳) اور نماز پڑھنا رات میں، جب لوگ خوابِ استراحت کے مزے لوٹ رہے ہوں۔ پھر آپؐ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا مانگو جو چاہتے ہو، آپؐ فرماتے ہیں کہ میں نے اس وقت یہ دُعا مانگی :-

اَللّٰهُمَّ اَسْئَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ	اے اللہ! تو مجھے نیک کام کرنے کی توفیق عطا
وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ	فرما، برائیوں سے بچا، میرے دل میں مسکینوں
الْمَسَاكِيْنِ وَاَنْ تَغْفِرَلِيْ وَاِذَا	کی محبت دے اور میری مغفرت فرما، اے
اَرَدْتَّ فِتْنَةً فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ	اللہ! جب تو کسی فتنہ کا ارادہ کرے تو مجھے اس
مَفْتُوْنٍ وَاَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَ	حال میں وفات دے کہ میں اس فتنہ میں مبتلا نہ ہوں
حُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ	اور میں تجھ سے تیری محبت، تجھ سے محبت کرنیوالوں کی محبت
يُّقَرِّبُنِيْ اِلٰى حُبِّكَ۔	اور تیری محبت سے قریب کرنیوالے اعمال کی محبت مانگتا ہوں۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا، یہ سب حق ہے پس اسے یاد کر لو اور پڑھو (۱)

مساجد شعارِ اسلام

مسجد شعارِ اسلام سے ہے، حدیث میں ہے کہ تم جب کوئی مسجد دیکھ لو یا اذان سُن لو تو پھر قتال نہ کرو، دوسرے یہ کہ مسجد محلِّ صلوٰۃ اور مرکزِ عبادت ہے جہاں رحمتِ الٰہی کا ہمیشہ ترشح ہوتا رہتا ہے اور یہ مسجد اسی وجہ سے کعبہ کے مشابہ ہو جاتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

---

(۱) مشکوٰۃ باب المساجد عن الترمذی واحمد۔

ہے کہ جو پاک وصاف ہو کر گھر سے فرض نماز کے لئے نکلتا ہے اس کا اجر مُحرِم حاجی کے برابر ہے (۱)

نیّت کی پاکی

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رحمتِ عالم صلعم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو میری اس مسجد میں پاک اور اچھی نیّت سے آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والوں کی مانند ہے اور جو کسی اور نیت سے آتا ہے اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو دوسرے کی متاع للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہو (۲) ایک دفعہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ مسجد میں جس ارادہ سے آتا ہے وہی اس کے حصّہ میں آتا ہے (۳)

صاحب اشعۃ اللمعات نے "انّما الأعمال بالنّیات" والی پہلی حدیث کے ضمن میں مثال دے کر بتایا ہے کہ مسجد میں کتنی مختلف نیتوں سے آدمی آسکتا ہے اور پھر ہر ایک کا اجر بتایا ہے، اور تمام نیتوں کا اجر حدیث ہی سے ثابت کیا ہے، تفصیل دیکھنا ہو تو وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

قرآن اور احادیث میں مسجدوں کے متعلق جو کچھ آیا ہے امید ہے اس کا خلاصہ اس مختصر مضمون میں آگیا ہے، دانا و بینا اور عقل والوں کے لئے اس میں بڑی وسعت ہے۔

یہ جو کچھ لکھا گیا وہ یکسر مساجد کے متعلق ہے، مگر مسجد کی عظمت ایک اور طریقہ سے بھی سمجھنے کی کوشش فرمائیے کہ یہ عظیم الشان دربار، دینی

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ ۱/۱۹۲۔ (۲) مشکوٰۃ باب المساجد۔

(۳) ابوداؤد باب فضل القعود فی المسجد۔

اور دینوی اعتبار سے کتنا بلند ہے۔

مسجد کی قربت

اس گھر کی بڑائی کا یہ حال ہے کہ اس کا فیض وکرم پڑوس کو بھی نہیں محروم کرتا، رحمت کی چھینٹیں اُڑ کر ان پر بھی پڑتی رہتی ہیں، جس سے ان کا درجہ بھی کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:-

فضل الدار القریبة من المسجد على الشاسعة کفضل الغازی على القاعد۔ (کنز العمال ۴/۱۳۸)	مسجد سے جو گھر قریب ہے اس کی فضیلت دور والے گھر پر ایسی ہے جیسی غازی کو گھر بیٹھنے والے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

دیکھا آپ نے کہ پڑوس کا مرتبہ بھی کتنا اونچا ہوگیا، یہ قریب اور آس پاس کے مکانات اپنے دوسرے مکانات سے سبقت لے گئے، اور ایسا کیوں نہ ہو، جہاں رحمتِ الٰہی کی بارش ہوتی ہے جو جلوہ گاہِ خدا ہے اور جس کو دنیا کی جنت کہا گیا ہے، یقیناً اس کا پڑوس بھی اس سے کچھ نہ کچھ نفع اندوز ہوگا ہی۔

تسکینِ خاطر

مگر اس کے ساتھ قدرت کا یہ انصاف بھی ہے کہ جو دور رہتے ہیں ان کو بھی محروم نہیں کیا ہے بلکہ ان کو بھی کسی نہ کسی طرح یہ حصہ عطا کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

ان اعظم الناس اجرا فی الصلوٰة	زیادہ اجر ان کے لئے ہے جو دور دور

ابعد هم الیها ممشی فابعد هم والذی ینتظر الصلوٰۃ حتی یصلیها مع الامام اعظم اجرا من الذی یصلیها ثم ینام (۱)	سے چل کر آتے ہیں اور جو مسجد آکر جماعت سے نماز پڑھتے ہیں وہ تنہا نماز پڑھ کر سونے والے سے بہتر ہیں۔

اس حدیث میں ان کے لئے تسلی و تسکین کا مواد فراہم کیا گیا ہے جو مسجد سے دور بستے ہیں اور پڑوس کی محرومی کا تدارک اس ثوابِ عظیم سے کیا گیا ہے جو دور سے چل کر آنے میں ہوتا ہے اور چلنے کے ثواب کی کثرت کا یہ حال ہے کہ کوئی قدم ثواب سے خالی نہیں ہے۔

مسجد میں آمد کا ثواب

حضرت جابر بن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ ہمارا گھر مسجد سے دوری پر تھا۔ ایک موقع سے میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنا گھر بیچ ڈالوں اور چل کر مسجد نبوی کے پڑوس میں (جس حد تک ممکن ہو) بسوں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس ارادہ سے روک دیا اور فرمایا:-

ان لکم بکل خطوۃ درجۃ۔ (مسلم باب کثرۃ الخطا الی المساجد ۱/۲۳۵)	بے شک تمہارے لئے ہر قدم پر ایک درجہ ہے۔

حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ مسجد نبوی کے پڑوس میں کچھ جگہ خالی ہوئی، قبیلۂ بنو سلمہ جو مسجد سے دوری پر آباد تھا اس کا ارادہ ہوا کہ پڑوس میں آکر آباد ہو اور پہلی جگہ چھوڑ دے، یہ خبر جب آنحضرت صلعم کو ہوئی تو آپ نے ان سے اس کے متعلق سوال کیا، انہوں نے اثبات میں جواب

---

(۱) مسلم باب کثرۃ الخطا الی المساجد وفضل المشی الیها صـ۲۳۵۔

دیا، آپؐ نے جب ان کا یہ ارادہ دیکھا تو ان سے کہا:۔

یا بنی سلمۃ! دیارکم تکتب آثارکم۔ (مسلم باب کثرۃ الخطا الی المساجد وفضل المشی الیہا ۱/۲۳۵)	اے بنی سلمہ! اپنے مکانوں کو لازم پکڑو، تمہارے نشانِ قدم لکھے جائیں گے۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے ان کو ترغیب دی کہ جہاں تھے وہیں رہیں، دُوری سے نہ گھبرائیں، یہ دوری بھی باعثِ ثواب بنتی ہے، یعنی وہاں سے چل کر جب مسجد آنا ہوتا ہے تو چلنا زیادہ پڑتا ہے اور اسی اعتبار سے ثواب میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ یہاں ہر قدم پر نیکی لکھی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ایک پُرلطف بات ہے کہ آدمی جب گھر سے باوضو مسجد کے لئے نکلتا ہے تو گویا وہ نماز ہی میں ہوتا ہے اس طرح اَجر میں کچھ اور اضافہ کی توقع ہے۔

ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا:۔

الابعد فالابعد من المسجد اعظم اجراً۔ (ابوداؤد باب ماجاء فی فضل المشی الی الصلوٰۃ)	مسجد سے جو جس قدر دُور ہوتا ہے اور وہ آتا ہے اس کو اتنا ہی ثواب ملتا ہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ ایک انصاری کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ یہ صاحب میرے علم میں مسجد سے (نمازیوں میں) سب سے دور رہتے تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ ہر وقت بہ پابندی مسجد حاضر ہوتے تھے، کبھی بھی ان کی جماعت نہیں چھوٹتی تھی، ایک مرتبہ ان سے کہا گیا کہ کاش آپ سواری کے لئے ایک گدھا خرید لیتے تاکہ آپ کو رات کی تاریکی اور تپتے دن میں مسجد آنے میں آرام رہتا، انہوں نے یہ سُن کر

فرمایا. مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میں مسجد کے بغل میں ہوتا اور چلنے کی مشقت سے بچتا، بلکہ میری تو خواہش یہ ہے کہ آنے جانے میں جو قدم اٹھیں ان تمام کے نشانِ قدم میرے نامۂ اعمال میں لکھ دیئے جائیں، آنے کے بھی اور واپسی کے بھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا آمدورفت دونوں کے ثواب اللہ تعالیٰ نے تم کو عطا کیے (۱)

ایک دفعہ رسولُ الثقلین صلعم نے ارشاد فرمایا، جب کوئی پاک و صاف ہوکر باوضو کسی مسجد کے لئے چلتا ہے کہ فریضہ ادا کرے تو ایسے شخص کا ایک قدم گناہ کو مٹاتا ہے اور دوسرا درجہ کی بلندی کا ذریعہ ہوتا ہے۔(۲)

سفر کی واپسی میں مسجد کی حاضری

مساجد کی ایک عظمتِ شان یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے جب واپس ہوتے تو سب سے پہلے مسجد ہی میں تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے، وہاں لوگوں سے مل جل کر گھر تشریف لے جاتے۔ آپؐ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا واپسی سفر پر یہی دستور ہوگیا تھا کہ مسجد میں اُترتے، نماز ادا کرتے پھر منزلِ مقصود کی طرف چلتے، اَب بھی مسلمانوں کے لئے یہی طریقہ مسنون ہے (۳)

اعتکاف جو ایک سنّت طریقہ ہے اور بیش قیمت فوائد پر مشتمل ہے، اس کے لئے بھی مسجد شرط ہے۔

---

(۱) مسلم باب فضل الصلوٰۃ المکتوبۃ فی جماعۃ الخ ۲۴۵/۱۔

(۲) حوالہ سابق۔

(۳) مسلم باب استحباب رکعتین فی المسجد لمن قدم من سفرہ ۲۴۸/۱۔

اجتماع کے مرکزی گھر اور ان کی تعمیر

اب تک جو کچھ لکھا گیا، اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ قدرتی اجتماعی نظام کے لئے مرکزی گھروں کا ہونا ضروری ہے جس کی ابتداء حضرت آدمؑ سے ہو چکی تھی، اور وہ سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر پھیل گیا اور ہر پہلو سے مکمل ہو گیا۔

مرکزی گھروں کی تعمیر

اب یہاں اس بات کی تفصیل کرنی ہے کہ اس گھر کی تعمیر میں کن امور کا لحاظ ضروری ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپؐ کے زمانہ میں ان مرکزی مکانوں کا اہتمام ایک مستقل نظام بن گیا، آپؐ نے ان کے بنانے کا عام حکم دیا، اس طرح کہ کوئی آبادی جہاں آپؐ کے ماننے والے ہوں ان گھروں کے وجود سے خالی نہ ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ:۔

امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

ببناء المسجد فی الدور۔ (۱) — تمام محلّوں میں مسجد بنائی جائے۔

چنانچہ آپؐ نے بھی ان گھروں کو ہر مسلم آبادی میں قائم کیا، اور آپؐ کے جان نثار صحابہؓ کرام نے بھی۔ گذر چکا ہے کہ مسجدِ قبا اور مسجدِ نبوی تو خود آپؐ نے اپنے ہاتھوں سے بنائی اور دوسرے لوگوں نے

---

(۱) ابوداؤد باب اتخاذ المسجد فی الدور۔

بھی اپنے اپنے گاؤں میں مسجدیں بنائی ہوں گی اور آپؐ کے بعد جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ حکم ہر جگہ بجا لایا گیا، کوئی ایسی جگہ تاریخ میں ہماری نظر سے نہیں گذری جسے مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں فتح کیا ہو اور اس میں مسجد نہ بنی ہو۔ "فتوحُ البلدان" اٹھا کر دیکھئے ہر آبادی میں آپ کو مسجد نظر آئے گی، حضرت عمر فاروقؓ کا یہ فرمان اَب بھی کتابوں میں موجود ہے۔

عن عطاء لما فتح الله الامصار علی عمرؓ امر المسلمین ان یبنوا المساجد۔ (کشاف ۴۰۸/۱ وتفسیرات احمدی ص۲۸۳)	حضرت عطاءؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شہروں کو فتح کیا تو آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سب مسجدیں بنائیں۔

یہ حکم صرف حکم ہی نہ تھا بلکہ اس پر عمل بھی ہوا اور ہر گوشۂ ملک میں مسجدوں کی تعمیر عمل میں آئی جو اجتماع کے مرکزی گھر کہے جاتے ہیں، انہی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جنہوں نے یہ حکم دیا تھا بہت سی مسجدیں بنائی گئیں، مؤرخین نے ان کی تعداد چھ ہزار کے قریب لکھی ہے، یہ وہ تعداد ہے جو اُن کو فراہم ہوسکی ہے ورنہ اُمید یہی ہے کہ اس سے زیادہ مسجدیں بنی ہوں گی۔ اس تعداد میں یہ بھی تفصیل ہے کہ ان میں سے دو ہزار کے قریب جامع مسجد تھیں (۱)

بہرحال یہ موضوع ہماری بحث سے خارج ہے، ہمیں صرف اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ اجتماع کے یہ مرکزی گھر (مسجد) بکثرت بنائے گئے۔

---

(۱) جامع التواریخ ص۱۳۳۔

تعمیرِ مسجد کی ضرورت

کوئی شبہ نہیں کہ نماز ہر پاک جگہ پڑھنے کی اجازت ہے اور اُمّتِ مرحومہ کے لئے تمام زمین مسجد ہے، شریعت محمدّی میں وہ تنگی نہیں ہے جو پہلی شریعتوں میں پائی جاتی تھی بلکہ یہاں حکم ہے۔

جعلت الارض کلھا مسجداً	تمام زمین مسجد اور پاک بنائی گئی ہے
وطھورا وایما رجل من اُمّتی	میری امّت کے جس فرد کو جہاں نماز
ادرکتہ الصلوٰۃ فلیصلِّ (۱)	کا وقت آجائے نماز پڑھ لے۔

بندوں کے لئے کوئی حیلہ باقی نہیں چھوڑا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت سے غافل رہیں، وقت آئے اور گذر جائے مگر بندہ یہ بہانہ کرکے کہ "مسجد نہ تھی" اپنی پیشانی خدا کے آگے نہ رکھے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ جہاں وقت آجائے وہیں وضو کرکے یا شرعی مجبوری میں تیمّم کرکے نماز ادا کرے، مسجد وہاں ہو یا نہ ہو، اس لئے کہ تمام زمین پاک ہے۔

مگر اسلام کا قانونِ عام مقتضی تھا کہ نظم و ضبط اور مسلمانوں کی قوتِ اجتماعی برقرار رکھنے کے لئے کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے جو بکھری ہوئی بھیڑ اور منتشر افراد کی شیرازہ بندی کردے اور انتشار و تشتّت کی راہ پر آہنی پھاٹک لگادے تاکہ نفرت و عداوت اور پھوٹ کی لعنت ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے جو کسی قوم کی مٹی پلید کرنے کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ شریعتِ مطہّرہ نے مسجدوں کے نام سے اس اجتماعی اور دینی

---

(۱) بخاری باب قول النبی صلعم جعلت الارض الخ۔

نظام کو قائم کیا اور اس کے قائم کرنے کا ہر ایک مسلمان کو حکم دیا، اور دن رات کے پانچ وقتوں میں ان میں حاضری ضروری قرار دی اور ان گھروں کی حیثیت ایسی رکھی کہ کسی کو آنے میں عار نہ ہو اور نہ بندگی کی ادائیگی میں شرم اور نہ کسی کے لئے یہ گنجائش باقی رکھی ہے کہ وہ کسی کو اس گھر کی حاضری سے روک سکے۔

ان گھروں کا زیادہ تعلق عبادات سے رکھا گیا ہے، لغویات کی یہاں مطلق گنجائش نہیں ہے، چنانچہ مسجد کی تعریف ہی یہ کی گئی کہ مسجد اس گھر کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنایا گیا ہو (۱) اور فقہاء نے تو اس کو نماز کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے (۲)

کوئی شبہ نہیں کہ بقول فقہاء مسجد کا بڑا کام نماز کی ادائیگی ہے مگر اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دین کے دوسرے کام اس میں جائز نہیں ہیں، ہم شروع میں اس طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کا بہت سارا کام اسی مسجد سے لیا ہے، لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سلسلہ مسلمانوں کے لئے فوز و فلاح کا ذریعہ بنایا گیا ہے جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

مرد مومن کو حق تعمیر

یہاں عرض کرنا ہے کہ چونکہ اس سلسلہ کا فائدہ مسلمانوں سے وابستہ ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کا گھر کہا جاتا ہے، اس لئے ان

---

(۱) جمل علی الجلالین ۴/۴۲۱۔

(۲) اشعۃ اللمعات قلمی ۱/۱۸۱۔

گھروں کی تعمیر کا حق بھی مخصوص طور پر ان کو ہی دیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ سے عقیدت رکھتے ہیں اور ان کی بھیجی ہوئی شریعت کو یقین کے ساتھ مانتے اور قبول کرتے ہیں، اسی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ جو لوگ کفر و شرک کا برملا اقرار کرتے ہیں ان کو مسجدوں کی تعمیر کا حق نہیں ہے اور اگر یہ کریں بھی تو مقبول نہ ہوں گی، بلکہ ان کی تعمیر اور ان سے متعلق امور کی انجام دہی کا حق ان کو ہے جو دل اور جوارح، ظاہر و باطن ہر طرح سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا امر دین میں کسی اور سے نہیں ڈرتے ہیں پھر یہ کہ وہ احکامِ الٰہی کو کسی کے خوف سے ترک بھی نہیں کرتے، نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور قیامت کے دن پر ان کا ایمان ہے (۱) یوں تو ہر مسلمان کو تعمیرِ مسجد کا حق ہے کہ وہ عقیدہ کے اعتبار سے پکّا مسلمان ہے مگر جو ان میں صالح ہیں ان کو زیادہ حق پہنچتا ہے۔ باقی کافر و مشرک کو مسجد بنانے کی اجازت دی جائے گی یا نہیں؟ فقہاء یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ اپنے مذہب کی رو سے اس کو کارِ خیر اور ثواب کا کام سمجھے تو اجازت دی جائے گی ورنہ نہیں، لیکن جس شکل میں ان کو مسجد بنانے کی اجازت دی گئی ہے اگر مسلمان کسی مصلحتِ اسلامی کے خلاف سمجھیں تو پھر ان کو بھی اجازت نہ ہوگی (۲) ابوبکر حنفی لکھتے ہیں:-

"قرآن کا لفظ تو یہی بتاتا ہے کہ کافروں کو اس کی اجازت نہ دی جائے گی اور نہ ان کو مسجد کا ذمہ دار بنایا جائے گا (۳)

---

(۱) دیکھئے سورۂ توبہ رکوع ۳ انما یعمر مساجد اللہ الخ۔

(۲) بیان القرآن للتھانوی ۴/۱۰۲

(۳) احکام القرآن للجصاص ۳/۱۰۸۔

تعمیرِ مسجد کا اجر

اس تفصیل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعمیر مسجد کی عزت اسلام کی نظر میں کتنی بلند ہے اور بنانے والا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کتنا ممتاز ہے یہی نہیں حدیثوں میں صراحت ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا گھر بناتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس کا بدلہ مرنے کے بعد جنت میں عطا کرتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من بنی مسجداً للہ تعالیٰ بنی اللہ لہ مثلہ بیتاً فی الجنۃ۔ (بخاری)	جو اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد بنائے گا اللہ اس کے لئے جنت میں اسی طرح کا گھر بنائے گا۔

اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول اپنی زبان وحی ترجمان سے جنت کی بشارت سنائیں اور اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں جنت میں گھر عطا کریں جو دلیل ہے اس کی رضا اور خوشنودی کی، مردِ مومن کو اس کی خوشنودی کے علاوہ چاہیئے ہی کیا۔

"مثلہ" (اسی طرح) کا یہ مطلب تو کسی درجہ میں ممکن ہی نہیں ہے کہ جنت کا گھر دنیاوی گھر کی طرح کا ہو گا، جو اینٹ چونا وغیرہ سے بنایا گیا ہو گا۔ اس طرح کا دل میں خطرہ گذرنا بھی بے ادبی اور گستاخی ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی مسجد اور اللہ تعالیٰ کے جنتی گھر میں بحیثیت صنعت اور خوبصورتی وہی فرق عظیم ہو گا جو انسان اور اللہ تعالیٰ کی صنعت میں ہوتا ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک مسجد بنانے کا بدلہ ایک ہی گھر سے ملے گا بلکہ متعدد گھر بھی ایک کے معاوضہ میں مل سکتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک نے ہر نیکی کا بدلہ "بعشر امثالھا" (دس گنا) سے بیان کیا ہے جو محض اس کا

لطف و کرم ہے اور ایک ہی ہو گا تو ایسا کہ اس پر ہزاروں دنیاوی گھر نچھاور کیئے جا سکتے ہیں، پھر یہ بھی نہیں ہے کہ گھر کے علاوہ اور کچھ نہ ملے گا بلکہ اس کی رحمت سے بڑی اُمیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں، واضح رہنا چاہیئے کہ جنت کی بالشت بھر زمین ساری دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

بعض روایتوں میں "مثلہ" کی جگہ "افضل منہ" "اوسع منہ" بھی آیا ہے جو مماثلت کی نفی کرتا ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آدمی جیسی نیکی کرتا ہے ویسا ہی بدلہ ملتا ہے پھر یہ بھی تو ہے کہ مسجد بنانے والوں کو جنت میں جو گھر ملے گا اس گھر کو جنت کے دوسرے گھروں پر وہی بڑائی حاصل ہوگی جو مسجد کو دنیا کے دوسرے گھروں پر حاصل ہوتی ہے (۱)

مختصر لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ بدلہ جنس بناء سے بھی ملے گا، مع دوسرے الطاف واکرام کے، باقی کتنے کمرے ہوں گے، کیسے کمرے ہوں گے اس کی صحیح حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، البتہ ہم اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ اجر کے متعلق یہ سمجھ کر رائے قائم کرنی چاہیئے کہ دینے والا رحمٰن، رحیم اور قدیر ہے۔

تعمیر میں بقدرِ وسعت حصہ

مسجد بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی ایک ہی شخص پوری مسجد بنوائے تب تو مستحق اجر ہے ورنہ نہیں، بلکہ معمولی مدد بھی قابلِ اجر ہے، جس سے جو ہو سکے مدد کرنی چاہیئے، جس طرح روپئے دینے والے کو

(۱) یہ تفصیل فتح الباری ۱/۳۶۷ سے ماخوذ ہے۔

اجر ملتا ہے اسی طرح اس کو بھی ثواب ملتا ہے جو جسم سے مدد کرے، بلکہ جسمانی مدد تو سنّت ہے، نبیوںؑ اور صحابۂ کرامؓ دونوں نے بدستِ خود تعمیرِ مسجد میں حصّہ لیا ہے، حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے واقعہ کو قرآن نے بیان کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کا واقعہ مسجدِ قبا اور مسجدِ نبوی کے ضمن میں آپ ابھی پڑھ چکے۔

مسجدِ نبوی ہی کی تعمیر کا واقعہ ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ اینٹ اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور بڑی تندہی سے کام کر رہے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو اس محنت سے کام کرتے دیکھا تو شفقت و محبت سے ان کے سر کی مٹی جھاڑنے لگے (۱)

آپ پڑھ آئے ہیں کہ مسجدِ نبوی کی چھت عہدِ نبوی میں برگِ کھجور کی تھی، ایک رات بارش ہوئی، مسجدِ نبوی میں اس قدر پانی ٹپکا کہ فرش کیچڑ بن گیا، صحابۂ کرامؓ نے ...... یہ حال دیکھا تو اٹھے اور اپنے کپڑوں میں کنکری لا لا کر بچھانے لگے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ منظر دیکھا تو بہت پسند فرمایا اور ان کے اس کام کی تحسین فرمائی (۲)

مسجد کے لئے جو زمین دے گا وہ بھی اس بشارت کا مستحق ہوگا، اور جو بنا بنایا مکان مسجد بنا دے وہ بھی اس زمرہ میں ہے یعنی وہ بھی مسجد بنانے کا مخصوص اَجر پائے گا (۳)

البتہ جو اپنی پوری اُجرت لے کر کام کرے گا اس کو یہ فضیلت حاصل نہ ہوگی، کیوں کہ بظاہر یہ اخلاص کا فقدان ہے، یوں اگر اس نے واقعی کچھ رعایت کی ہو یا نیّت صالح ہو تو توقع کی جاتی ... ہے کہ فی الجملہ

---

(۱) بخاری شریف ۱/۶۴۔ (۲) ابوداؤد باب فی احصار المسجد۔
(۳) فتح الباری ج ۱۔

کچھ ثواب مل جائے گا (۱)

لوازماتِ مسجد

مسجد کے علاوہ اس کے لوازمات کا عطیہ بھی باعثِ اجر و ثواب ہے، جیسے فرش کے لئے جائے نماز، چراغ بتی، یا مثلاً وضو خانہ بنا دینا، مسجد کے لئے مسجد کے قریب (مگر باہر) کنواں کھدوا دینا، نل لگوا دینا، اور اسی طرح کی کوئی اور چیز جس سے... مسجد اور اہلِ مسجد کو فائدہ ہو، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

بقدرِ مقدور در بنائے مساجد در محلے	جہاں ضرورت ہو حتی المقدور مسجد
کہ احتیاج آں باشد امداد مالی و جانی	کے بنانے میں مالی و جانی مدد کرے،
نمودن ثوابِ عظیم دارد، وہمچنیں در مہیا	اس کا بڑا ثواب ہے، اسی طرح طہارت
داشتنِ اسباب طہارت از بنائے	کے سامان فراہم کرنے کا ثواب ہے
غسل خانہ و ترمیم چاہ و اجرائے	جیسے غسل خانہ بنانا، کنویں کی مرمت
آب ریز و مہیا داشتن فرش و بوریا	کرنا اور نل لگانا، یونہی فرش، مسجد
و روشن کردن چراغ در آنجا تا آں	کا سامان جیسے چٹائی اور چراغ روشن
مدت کہ مردم در آں باشند،	کرنا، جس وقت تک آدمی ہوں، یہ
عبادت است۔	سب کام عبادت کا ثواب رکھتے
(تفسیر عزیزی پارہ ۱ ص۲۴۳)	ہیں۔

مسجد اور لوازماتِ مسجد میں تمام ضروریات کی چیزیں آگئی ہیں ان تمام کا ثواب بھی کرنے والوں کو ملے گا اور یہ تمام مسجد سے متعلق

---

(۱) فتح الباری ج ۱۔

چیزیں صدقہ جاریہ کا حکم رکھتی ہیں جن کا ثواب ان کی بقا تک ملتا رہے گا۔

تعمیر میں چند امور کا لحاظ

اس طرف بھی شاہ صاحبؒ اشارہ فرما گئے کہ مسجد یا لوازماتِ مسجد کے مہیّا کرنے کا ثواب وہاں ہوگا جہاں ضرورت ہو، بلاشبہ یہ چیز بھی اہم ہے، اس لئے مسجد جب بناتے کا کوئی ارادہ کرے تو اس کو دیکھ لینا ہوگا کہ اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ پھر ضرورت ہے تو واقعی یا آرام طلبی کے لئے، بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ اس کو نہیں دیکھتے ہیں، صرف ثواب کی نیّت سے ایسا کر گذرتے ہیں حالاں کہ یہ غلط چیز ہے، مقصد حصول ثواب ہی ہو تو اس کے بہت راستے ہیں، بے ضرورت تعمیر مسجد سے بدرجہا بہتر ہے کہ دین کے دوسرے کام سرانجام دیئے جائیں جو کس مپرسی کے عالم میں ہیں۔

فرض کر لیا جائے کہ کوئی ایسی مسجد بنائے جس سے دوسری مسجد کو نقصان پہنچنے کا غالب اندیشہ ہو تو یہ کام بجائے خیر کے شر بن جائے گا، ایک مسجد میں جو جماعت بآسانی ہو رہی تھی اس میں اس دوسری مسجد کی وجہ سے تفریق پیدا ہو جائے گی اور محلہ کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا، جس کو کوئی دیندار پسند نہیں کرتا، سیّدنا عمرِ فاروق رضؓ کے زمانۂ خلافت میں جب فتوحات کی کثرت ہوئی تو آپ نے ہر آبادی میں تعمیر مسجد کا حکم نافذ فرمایا مگر ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی کہ کسی ایک شہر میں ایسی دو مسجدیں نہ ہوں کہ ایک دوسرے کے لئے ضرر

رساں ہوں، تفسیر کشاف میں ہے:

عن عطاء لما فتح الله الأمصار على عمر رضي الله عنه امر المسلمين ان يبنوا المساجد وان لا يتخذوا في مدينة مسجدين يضار احدهما صاحبه (کشاف ۱/۴۰۸)

حضرت عطاءؒ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب عمرؓ کے ذریعہ شہروں کو فتح کیا تو آپؓ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ مسجدیں بنائیں مگر اس طرح کہ ایک شہر میں دو مسجدیں ایسی نہ ہوں کہ ایک سے دوسری کو نقصان پہنچے۔

ایک محلہ میں دو مسجدیں

ایک محلّہ میں متعدّد مسجدیں بنانا کسی حال میں ضرر سے خالی نہیں یہ دوسری بات ہے کہ محلّہ کی آبادی اتنی دور میں پھیلی ہوئی ہو کہ دوسرے کنارے کے لوگ نہ پہنچ سکیں ورنہ پھر احتیاط اسی میں ہے کہ ایک محلہ میں ایک سے زائد مسجد نہ ہو یا چند بھی ہوں تو اس طرح کہ نزدیک نزدیک نہ ہوں جس سے ایک جماعت میں انتشار پیدا ہو جائے۔

ایک مسجد کے ہوتے ہوئے اس کی بغل میں دوسری مسجد اس وقت تک نہیں بنائی جا سکتی جب تک کوئی شرعی مجبوری درپیش نہ آئے مثلاً یہ کہ پہلی مسجد تنگ ہو جائے اور اس کو وسعت دینے کی گنجائش نہ ہو، یا ایک مسجد میں اجتماع سے کسی فتنہ کا اندیشہ ہو، بغیر کسی ایسی شرعی مجبوری کے دو مسجدیں بنا کر انتشار و تشتّت پیدا کرنا اس اجتماعی نظام کے سراسر خلاف ہے کہ اس سے شیرازۂ دینی بکھر جائیگا

عبادات کا عروۃ الوثقیٰ مضمحل ہو جائے گا اور مسجد کی رونق جاتی رہے گی۔

سلفِ صالحین کی احتیاط

سلف صالحین ایسی مسجدوں میں نماز پڑھنا پسند نہیں کرتے تھے جن میں مسجد ضرار کی ذرّہ برابر بھی بو آجاتی تھی اور اسی وجہ سے وہ نماز پڑھنے میں پرانی اور قدیم مسجد کو ترجیح دیتے تھے، مختلف علماء نے ان امور کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا ہے، عموماً اس طرح کی مسجدیں شہرت و عزّت اور ریاکاری کے لئے بنائی جاتی ہیں اور جو مسجدیں ان اغراضِ فاسدہ کے لئے وجود میں آئی ہوں وہ بلاشبہ مسجدِ ضرار کی شکل میں ظاہری طور پر بھی آجاتی ہیں (۱)، جس سے اجتناب بہرحال ضروری ہے۔

تعمیر سے پہلے نیّت کی اصلاح

یہاں یہ مسئلہ صاف کر لینا چاہیئے کہ اگر کوئی محروم القسمت مسجد بنائے مگر اس کی نیّت نام و نمود، عزّت و شہرت اور ریاکاری ہو تو اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

اس اہم سوال کا جواب پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اصلاحِ نیّت اور اخلاصِ عمل پر مختصر سی روشنی پڑ جائے تاکہ اس مسئلہ کی اہمیت اُجاگر ہو جائے۔

---

(۱) تفسیر مدارک علی الخازن ۲/۲۶۵۔

حضرت عمر بن الخطابؓ سے ایک حدیث مروی ہے جس کو محدثین "امہات الدین" میں شمار کرتے ہیں۔ صاحب "مشکوٰۃ المصابیح" نے بلکہ خود بخاریؒ نے اپنی "جامع صحیح" میں پہلی حدیث اسی کو نقل کیا ہے اور کتاب شروع کرنے سے پہلے اصلاحِ نیّت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الفاظ حدیث یہ ہیں :-

قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وانما لامرء ما نوی فمن کانت هجرته الی الله ورسوله فهجرته الی الله ورسوله ومن کانت هجرته الی دنیا یصیبها اوالی امرأة یتزوجها فهجرته الی ما هاجر الیه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اعمال نیتوں ہی سے ہیں اور آدمی کے لئے وہی ہے جو وہ نیّت کرے، لہذا جس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کیلئے ہوئی اس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے لئے ہے اور جس کی ہجرت دنیا کے حصول کے لئے ہوئی یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لئے ہوئی تو اس کی ہجرت انہی چیزوں کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی۔
(بخاری وغیرہ)	

نیت کو دخل

اس حدیث کے ایک ایک جملہ کو غور سے پڑھنا چاہیئے، یہ بات بالکل صاف ہے کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہے کہ اعمال کی قبولیت

کا دار و مدار نیّت پر ہے اور عمل پر اجر اسی وقت مرتّب ہوتا ہے جب نیّت پاک وصاف ہو، ہجرت جیسی مہتم بالشان چیز میں نیّت کے فساد سے ثواب جاتا رہتا ہے اور ایک اندھا جو اپنی شرعی مجبوری کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہو سکتا، اس کو نیّت کی خوبی کی وجہ سے اجر ملتا ہے۔

نماز کے عمل صالح ہونے میں کس مسلمان کو شبہ ہو سکتا ہے لیکن اگر یہی نماز ریا کے جذبہ کے ساتھ پڑھی جائے تو باعثِ ہلاکت ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:-

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	ان نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے
عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ	جو اپنی نماز کو بھلا دیتے ہیں اور جو
هُمْ يُرَآءُوْنَ۔ (الماعون: ۴-۶)	اپنی نماز میں ریا کاری کرتے ہیں۔

ویل جہنّم کا ایک گہرا طبقہ ہے اور بعض نے ویل کا ترجمہ خرابی اور ہلاکت سے کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ریا کار کی نماز باعثِ محرومی اور ناکامی ہے، حدیث میں اس کو شرکِ اصغر سے تعبیر کیا گیا ہے، دیکھا آپ نے، اس قدر عظیم الشان عبادت اور ذرا سی نیت کی خرابی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

واقعی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر سے زیادہ باطن کو دیکھتا ہے، جسم سے زیادہ اس کی نظر دل پر ہوتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:-

اِنَّ اللّٰہ لایَنظرالیٰ اَجسامِکم	اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں
وَلَاالیٰ صُورکم ولٰکن ینظر الیٰ	دیکھتا ہے اس کی نظر تو یقینی طور پر

الیٰ قلوبکم رواہ مسلم (۱)　　تمہارے دلوں پر ہوتی ہے۔

ریاکاری کا فساد

نیت کی اس مختصر تفصیل کے بعد غور کیجئے کہ نیّت کو اعمال کی قبولیّت اور اس کی اصلاح میں کس قدر دخل ہے تو پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ تعمیر مسجد جیسا اہم کام انجام دیا جائے اور اس میں نیت کے فساد سے بگاڑ پیدا نہ ہو، یقیناً اس نیّتِ بد کا اثر اس کے اعمال پر پڑکر رہے گا، اگر نیت ریاکاری اور نام و نمود کی ہے تو اس کو معاوضہ میں یہی چیزیں ملیں گی، جس ثواب کی تعمیرِ مسجد میں بشارت سنائی گئی اس سے یہ محروم رہے گا۔

کل مسجد بنی مباھاۃ او	جو مسجد ڈینگ، ریاکاری اور نام و
ریاء او سمعۃ اولغرض سوا	نمود یا کسی اور غرض فاسد کے لئے
ابتغاء وجہ اللہ او بمال غیر	بنائی جائے جس میں اللہ تعالیٰ کی
طیب فھو لاحق بمسجد ضرار	خوشنودی مقصود نہ ہو یا مسجد
(تفسیراتِ احمدی ص۳۸۳ و مدارک علی الخازن	ناپاک مال سے بنائی جائے وہ
ج ۲ ص: ۲۶۵)	مسجدِ ضرار کی سی ہے۔

مسجدِ ضرار

مسجدِ ضرار وہ مسجد ہے جو مسجد قبا کے مقابلہ میں بنائی گئی تھی، بانی منافق اور دشمنِ رسولؐ تھے جن کا مقصد مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا

---

(۱) ریاض الصالحین للنووی ص۵۔

اور سازش کا جال بچھانا تھا، مسجد کی شکل میں یہ خفیہ کارروائی کے لئے منافقوں نے ایک گھر بنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسکی اطلاع دی تو آپ نے اسے جلوا کر خاکستر بنادیا۔ قرآن میں ہے:

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّکُفْرًا وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَکٰذِبُوْنَ لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا۔ (سورۃ التوبۃ: ۱۰۷)	اور کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اس غرض سے مسجد بنائی کہ اسلام کو ضرر پہنچائیں اور اس میں بیٹھ کر کفر کی باتیں کریں اور ایمانداروں میں تفریق ڈالیں اور اس کے قیام کا سامان کریں جو پہلے سے اللہ اور اس کے رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھا جائیں گے کہ بجز بھلائی کے ہماری نیّت کچھ اور نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں آپ (اے نبیؐ) اس میں ہرگز نماز نہ پڑھیں۔

جس مسجد کا یہ حال ہو کسی مسلمان کی بنائی ہوئی مسجد کا اسی جیسا ہو جانا معمولی بات نہیں ہے۔ غور کیا جائے کہ جو مسجد اس نیّتِ فاسد سے بنائی جاتی ہے کہ نام و نمود اور عزت حاصل ہو، اللہ کے یہاں نہیں، دُنیا والوں میں، اس کی مسجد اور خود بانی کا کیا حال ہوگا؟ ایسی مسجد جب مسجدِ ضرار کے درجہ میں آنے کے لائق ہو جائے گی تو اس کے بانی کس درجہ میں آجائیں گے؟ بار بار سوچیئے، اللہ ہر مسلمان کو

اس عذاب سے بچائے۔

بطور ریا مسلمان کی تعمیر کردہ مسجد

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس طرح کی مسجد ہر پہلو سے مسجدِ ضرار کے حکم میں ہو جاتی ہے بلکہ یہ صرف انتفاءِ ثواب، نیّتِ فاسدہ اور فقدانِ خلوص میں ہے، کیوں کہ مسجد ضرار اور آج کل کی مسجد جو بطور ریا بنائی جائی دونوں میں فرق ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ مسجدِ ضرار میں مسجد کی نیّت سرے ہی سے نہ تھی بلکہ محض تلبیس اور فریب مقصد تھا جس کا قرآن نے اعلان کیا، اس کو مختصر لفظوں میں "دھوکہ کی ٹٹی" کہہ سکتے ہیں مگر مسلمان جو مسجد بناتا ہے اس کی نیّت ہر حال میں مسجد کی ہی ہوتی ہے، صرف اس کی نیّت میں ریا اور نام و نمود کی آمیزش ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ثواب سے محرومی ہوگی۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مسجد ضرار میں چار چیزیں تھیں جن کی وجہ سے یہ مسجدیّت سے نکل گئی۔ اوّل یہ کہ اسے منافقین نے اپنی اغراضِ فاسدہ کی تکمیل کا ذریعہ اور مسلمانوں کی ضرر رسانی کا حیلہ بنایا تھا جس کو لفظ "ضرار" بتلا رہا ہے۔ دوم یہ کہ اس کی آڑ میں کفر کی تقویّت مقصود تھی اور اسلام کا ضعف و اضمحلال جیسا کہ لفظ "کفر" سے ظاہر ہے، سوم یہ کہ مسلمانوں کی باہمی اخوّت و محبّت اور ان کی یکجائی پامال کر کے تفرقہ، اختلاف اور عداوت پیدا کرنا ان کی خواہش تھی جس پر لفظ "تفریقا بین المؤمنین" شاہد

ہے، چہارم یہ کہ منافقین نے اس مسجد ضرار کو دشمنِ خدا و رسولؐ کی روپوشی اور گھات کے لئے تیار کیا تھا جس کا نام مفسرینؒ نے "ابو عامر خزاعی نصرانی" بتایا ہے، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ "لمن حارب اللّٰہ ورسولہ"۔

یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں آنے کی ہے کہ مسلمان جو بھی مسجد بناتا ہے اس کا مقصد ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا ہے اس لئے وہ ظاہری احکام میں مسجد ہے گو عند اللہ مقبول نہ ہو، مسجدیت اور مقبولیت میں تلازم نہیں، نہ ایک جانب سے، نہ دونوں جانب سے" واللہ اعلم (۱)" باقی اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہر مسلمان کو ایسی بات سے پرہیز لازم ہے جس سے اس کو ثواب سے محرومی ہو اور ہمہ دم اس کو حبطِ عمل سے ڈرتے رہنا چاہیئے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ (۲)۔

بانی کے نام کا کتبہ

بعض لوگ جو بدعات کا شکار ہو کر مسجد پر اپنا نام کندہ کراتے ہیں یا بانی اپنے نام کا کتبہ لگاتے ہیں یہ بھی ریا ہے اور بقول ابن جوزیؒ اخلاص سے محروم ہیں (۳)۔

ھ جمل علی الجلالین ۲/۳۱۸۔

(۱) بیان القرآن ۴/۱۴۳ مع الفاظ۔ (۲) حوالہ سابق۔

(۳) فتح الباری ۱/۳۶۶۔

ہمارے دَور میں تعلّی، ترفّع اور آن وشان کی جو رسم بد جاری ہو گئی ہے اور اخلاص کی جس طرح مٹی پلید ہو رہی ہے وہ قابلِ صد افسوس ہے، ملّا جیون نے سچ فرمایا ہے کہ:

"ہمارے زمانہ کے وہ متعصّب مشائخ اور بھی قابلِ تعجب ہیں جو ہر گلی کوچہ میں مسجد اس لیئے بناتے پھرتے ہیں کہ نام ونمود حاصل ہو اور شان وشوکت نمایاں رہے، یہ محض باپ دادا کی غلط پیروی کا نتیجہ ہے ان کو مسجد ضرار کے واقعہ میں غور وفکر کرنا چاہیئے اور انجام سے ڈرنا چاہیئے (۱)

حلال مالیّت

نیّت کی اصلاح کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ مسجد میں جو مال لگایا جائے وہ پاک اور حلال کمائی کا ہو، اس اجتماعی نظام میں ان تمام مفاسد پر پہرہ بٹھایا گیا جس سے کوئی بُرا اثر پیدا ہو، اور اس نظام کی ہر طرح سے حفاظت کی گئی ہے تاکہ اس کے استحکام میں کہیں سے کوئی رخنہ پیدا نہ ہونے پائے۔

مال حرام اپنا ایک خاص اثر رکھتا ہے جو کبھی نہ کبھی فتنہ و فساد کا مرکز بن جاتا ہے جیسے زہر کہ اگر فوری طور پر کچھ نہ بھی ہو تو بھی مطمئن نہ رہنا چاہیئے، پھر یہ مال جب کہ مسجد جیسی پاک جگہ میں صرف ہو رہا ہو، یہ دربارِ الٰہی ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اس میں ناپاک مال کی ذرّہ برابر گنجائش نہیں ہے۔

---

(۱) تفسیر احمدی ص۳۸۴۔

ان اللہ طیب لا یقبل الا الطیب۔ (مسلم)	بیشک اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ بجز پاک اور حلال کے قبول نہیں کرتا۔

زانیہ کی تعمیر کردہ مسجد

مال حرام سے مسجد ہی نہیں بلکہ اس کا استعمال کہیں بھی جائز نہیں ہے، پھر مسجد میں اگر کوئی لگاتا ہے تو وہ دین پر ظلم کرتا ہے اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ زانیہ یا مغنیہ عورت اگر زنا اور غنا کی کمائی سے مسجد بنائے تو یہ مسجد ہی نہیں ہو گی۔ مولانا عبد الحیؒ فرنگی محلی نے اس مسئلہ کی دلیل میں اسی اوپر والی حدیث کو پیش کیا ہے۔ اس کی وضاحت ایک دوسرے استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں کہ مسلم اور ترمذی میں ایک حدیث رافع بن خدیجؓ سے آئی ہے، اس میں آنحضرتؐ کا یہ فرمان ہے "مھر البغی خبیث" (زانیہ کی کمائی حرام ہے) کسی کو خبیث کے معنی جو حرام کیا گیا ہے اس میں شبہ ہو سکتا تھا، اس لئے انہوں نے اس کو سید جمال الدین محدث شیخ عبد الحقؒ شارحِ مشکوٰۃ اور ملا علی قاریؒ کے حوالہ سے ثابت کیا ہے۔ ملا علی قاریؒ کی دلیل یہ ہے:۔

مھر البغی خبیث ای حرام اجماعاً لانھا تأخذہ عوضا عن الزنا المحرم ووسیلۃ الحرام حرام و سماہ مھرا مجازاً لانہ	زانیہ کی کمائی خبیث یعنی بالاتفاق حرام ہے اس لئے کہ وہ اس کو زنا کے معاوضہ میں لیتی ہے جو حرام ہے اور حرام کا وسیلہ بھی حرام ہے اس کا نام مہر مجازاً رکھا گیا ہے کہ

فی مقابلۃ البضع (۱)۔ وہ شرمگاہ کے مقابلہ میں ہے۔

ماحصل یہ ہوا کہ مالِ حرام سے مسجد نہیں بنائی جاسکتی وہ حرام مال زنا و غنا سے حاصل کیا گیا ہو یا کسی اور ناجائز و حرام طریقہ سے۔ فرض کرلیجئے اگر کوئی اس طرح مالِ حرام کی تیار کردہ مسجد ہے اور اس میں کسی نے نماز پڑھ لی تو گو فرض ذمہ سے ساقط ہو جائے گا مگر ثواب میں نقص ضرور پیدا ہوگا اور مسجد کے بنانے والے کو بھی کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

مال حرام سے تعمیر کردہ مسجد کا حکم

اب یہ بحث بہر حال ہے کہ اس مسجد کا کیا حکم ہے، اسے مسجدیت سے خارج قرار دیا جائے یا نہیں؟ حکیم الامت مولانا تھانوی اپنے رسالہ "دآب المساجد فی آداب المساجد" میں لکھتے ہیں:

"دوسرا حکم اس کا مسجد نہ ہونا ہے، اس میں دلیل کی حاجت ہے، صرف مولانا عبد الحیؒ کا قول حجت نہیں، مسجد کا احکام میں مسجد ہونا مسئلہ فقہیہ ہے، سو کتبِ فقہ میں تحقیقِ مسجدیت کے لئے مال کا حلال ہونا کہیں مذکور نہیں، جیسے کوئی شخص بہ نیتِ ریا وقف کرے تو گو وہ وقف مقبول نہ ہو بلکہ خوفِ معصیت ہے لیکن وقف صحیح ہو جاتا ہے، اسی طرح گو یہ مسجد مقبول نہ ہو بلکہ خود معصیت ہے لیکن احکام میں مسجد ہو جائے گی، مثلاً اس کی بیع جائز نہیں، اس میں حائض و جنب کا داخل ہونا جائز نہیں، اس میں بول و تغوط دپیشاب

---

(۱) فتاویٰ عبد الحیؒ ۳۸/۲۔

پائخانہ) درست نہیں۔ اب صرف یہ بات باقی ہے کہ اس کو کیا کیا جائے۔ سو اس کا حکم کہیں منقول نظر سے نہیں گذرا، لیکن قواعد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بند کر کے محفوظ کر دیا جائے، نہ اس میں نماز پڑھیں، نہ اس کی بے حرمتی کریں۔ البتہ اگر زمین حلال ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے اور صرف ملبہ حرام ہے تو بجائے اس کے دوسرے ملبہ سے اس کی تعمیر کرا دینا جوازِ انتفاع کے لئے کافی ہو جائے گا اور ایسی مسجد مذکور کی جو مال حرام سے بنائی ہوئی ہے، ایسی مثال ہے جیسے نعوذ باللہ کوئی شخص ناپاک سیاہی سے قرآن مجید لکھ لے، اس میں نہ تلاوت جائز ہے اور نہ اس کی بے ادبی جائز ہے بلکہ دفن کر دیا جاتے، باقی مسئلہ نازک ہے، دوسرے علماء سے بھی نظر کرالی جائے۔"

یہ تفصیل مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے زانیہ اور مغنیہ کی مسجد پر لکھی ہے، جس کی کمائی حرام ہوتی ہے، یہی تفصیل دوسرے مال حرام سے بنائی ہوئی مسجد کی بھی ہوگی۔

گندہ مال سے تعمیر میں اجتناب

مسجد میں مال حرام کے سوا ایسے مال سے بھی اجتناب ضروری ہے جس میں کسی طرح کی شرعی کراہیت پیدا ہو جائے تاکہ مسجد اوساخ سے منزہ کہی جاسکے اور مسلمانوں کے اجتماع کے مرکزی گھر ہر طور پر ایک اعلیٰ نمونہ بن سکیں۔

علماء نے اسی وجہ سے لکھا ہے کہ مسجد میں ایسے مسلمان بھنگی کی کمائی لگانا درست نہیں ہے، جس کی کمائی سوائے پائخانہ اُٹھانے

کی اُجرت کے نہیں ہے (۱) کیوں کہ حدیثوں میں اس طرح کی کمائی کو کراہیت آمیز کہا گیا ہے، اسی طرح زکوٰۃ یا زکوٰۃ کے حکم میں جو مال ہے اس کا لگانا بھی مسجد میں جائز نہیں ہے (۲) کیوں کہ اس طرح کے مال میں حکماً ایک طرح کی گندگی ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ تعمیر مسجد کارِ ثواب ہے مگر تعمیر مسجد میں چند امور کا لحاظ از بس ضروری ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، کیوں کہ یہ چیزیں وہ ہیں جو مشکوٰۃِ نبوّت سے مستخرج ہیں۔

مسجدوں کی تزئین

تعمیر مسجد کا اجر بیان ہو چکا، اَب اس پر روشنی ڈالنی ضروری ہے کہ تعمیری خصائص کیا ہیں، یعنی مسجدیں کیسی بنائی جائیں؟ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ رسم عام طور پر پھیلتی جا رہی ہے کہ مسجد کی تعمیر کے ساتھ لوگ یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس میں جھاڑ و فانوس ہوں رنگ و روپ میں ممتاز ہوں اور گُل و بوٹے ضرور ہوں اور زیادہ سے زیادہ ہوں۔

مسلمانوں کی اقتصادی حالت کے پیشِ نظر بھی اس مسئلہ پر بحث ضروری ہے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ جا کر جو سلسلہ چل رہا

---

(۱) مجموعہ فتاویٰ عبدالحی ۲/۳۵۷۔

(۲) عالمگیری ۳/۲۴۲۔

ہے وہ بھی رک جائے اور مسلمان بعض ان چیزوں کو ضروری تصوّر کرلیں جو ہرگز ضروری نہیں ہیں۔

تعمیر مسجد میں سادگی

ہم پہلے مسجدِ نبوی کے سلسلہ میں اشارہ کر آئے ہیں کہ مسجد ایسی سادہ ہونی چاہیئے جسے تمام مسلمان بآسانی بنا سکیں، پھر آپ وہاں مسجدِ نبوی کی ہیئت پڑھ چکے ہیں کہ جو مسجد آپؐ نے بنائی تھی وہ بالکل سادہ تھی، بخاری نے عبد اللہ بن عمرؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"مسجد نبوی عہدِ رسالت میں کچی اینٹ سے بنائی گئی تھی جس کی چھت برگ کھجور کی اور ستون درختِ خرما کے تھے۔ ابوبکر صدیقؓ نے اس میں کوئی زیادتی نہ کی، اپنے حال پر رہنے دیا۔ فاروقِ اعظمؓ نے زیادتی تو کی لیکن سابق بنیاد پر بنائی اور وہی کچی اینٹ کی دیوار، برگ کھجور کی چھت، صرف ستون لکڑی کے دیئے پھر حضرت عثمانؓ نے اس میں کافی زیادتی کی، دیوار منقش پتھر اور سمنٹ سے، ستون بھی منقش پتھروں ہی کے اور چھت ساج کی لکڑیوں سے تیار ہوئی"[1]

تعمیری خصائص کا جہاں تک تعلق ہے یہ بات صاف ہے کہ دورِ فاروقی تک وہی سادگی رہی جو آپؐ کے زمانہ میں تھی حالاں کہ آمدنی کے لحاظ سے فاروقِ اعظمؓ کا زمانہ ممتاز کہا جاسکتا ہے، فتوحات کی کثرت تھی، روم و فارس کے خزانے لدے چلے آرہے تھے، آپؓ

---

(۱) بخاری باب بنیان المسجد۔

نے مختلف شعبوں کو ترقی دی اور بہت سے نئے شعبے پیدا کئے مگر اس طرف آپؓ نے کوئی توجہ نہیں کی، یہی نہیں بلکہ سختی سے اس تزئین کو روکا، آپؓ کا فرمان تھا کہ رنگ سازی کر کے فتنہ کا سامان نہ فراہم کیا جائے۔

امر عمر ببناء المسجد وقال اکن الناس من المطر وایاك ان تحمر او تصفر فتفتن الناس۔ (بخاری ۱/۶۴)	عمرؓ نے مسجد کے بنانے کا حکم دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں لوگوں کو بارش سے بچانا چاہتا ہوں، خبردار مسجد سرخ وزرد نہ بنائی جائے جس سے لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔

دَورِ عثمانی میں ترقی

البتہ دَورِ عثمانی میں تھوڑی سی زیبائش آئی اور وہ بھی مستحکم عمارت کے ضمن میں، بات یہ ہوئی کہ اس دَور میں نفاست بڑھ گئی، لوگوں نے محل بنوانے شروع کر دیئے جس کی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی کہ مسجد کی عمارت میں ترقی دی جائے۔

آپ کی تیار کردہ مسجد میں بیل بوٹے زیادہ نہ تھے، کوئی خاص زرق برق بھی پیدا نہ کیا گیا، ایک اعتدالی شکل اختیار کر کے نفاست بڑھا دی مگر بایں ہمہ کتنے صحابۂ کرامؓ کو یہ اضافہ پسند نہیں آیا، وہ اپنی محبّتِ رسولؐ کی وجہ سے چاہتے تھے کہ وہی ہیئت باقی رہے جو آپؐ کے زمانہ میں تھی، گو یہ بھی درست ہے کہ کسی نے اس پر شدید انکار

بھی نہ کیا۔

تزئین کی ابتدار

مسجد کی زینت جس نے اعتدال سے بڑھائی اور تزخرف کی حد کو پہنچایا وہ حکومتِ بنی امیّہ کا خلیفہ ولید بن عبدالملک بن مروان تھا، یہ صحابۂ کرام کا بالکل اخیر زمانہ تھا، اس وقت مدینہ کے عامل (گورنر) عمر بن عبدالعزیز تھے، انہی کی نگرانی میں ۸۸ھ میں مسجدِ نبوی کی تعمیر جدید شروع ہوئی اور صناع و معمار قیصر روم کے یہاں سے منگوائے گئے، سازو سامان بھی بہت کچھ وہیں سے آیا، صناع (کاریگر) چونکہ قبطی یا رومی تھے اس لئے انہوں نے موقع موقع سے مسجد کی بے حرمتی بھی کی اور نقش ونگار اور جھاڑ و فانوس کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ صرف قبلہ والی دیوار پر سینتالیس ھزار اشرفیاں خرچ کی گئی تھیں (۱) تین چار سال میں جاکر یہ کام ختم ہوا، تکمیلِ عمارت کے بعد ولید دیکھنے آئے تو اتفاق سے ان کی ملاقات حضرت عثمان غنیؓ کے کسی صاحبزادے سے ہو گئی، ولید نے ان سے کہا، دیکھئے آپ کے والد کی تعمیر کردہ مسجد اور اس میں کتنا فرق ہے۔ یہ سن کر صاحبزادے نے جواب دیا، ہاں میرے باپ کی تعمیر مسجد تھی اور آپ کی یہ تعمیر کردہ عمارت یہود و نصاریٰ کے کنیسوں جیسی ہے (۲)

---

(۱) جذب القلوب للشیخ عبدالحق محدث دہلوی باب ہفتم۔

(۲) ایضاً۔

تزئین شریعت کی نظر میں

ذخیرۂ احادیث کو سامنے رکھ کر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی مزخرف عمارت مسجد کے لئے شریعت کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما امرت بتشييد المساجد	مسجدوں کو مشید بنانے کا حکم
قال ابن عباس لتزخرفنها	نہیں ہے، ابن عباسؓ نے معنی بیان
كما زخرفت اليهود و	کئے کہ تم ان مسجدوں کو یہود و نصاریٰ
النصارىٰ۔ (۱)	کی طرح زینت دوگے۔

زخرفہ زینت دینے کو کہتے ہیں۔ اصل میں "تزخرف" نام ہے سونے کے پانی چڑھانے اور سنوارنے کا، کیوں کہ لغت میں "زخرف" کے معنی سونا اور کسی چیز کو کمال حسن دینا ہے (۲)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ مسجد کو ایسی زینت دے جو اعتدال سے بڑھی ہوئی ہو، یہود و نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں کو آراستہ کرتے اور سنوارتے ہیں حالانکہ معبد کے ساتھ یہ برتاؤ پسندیدہ نہیں ہے، کیوں کہ اس میں عقیدت سے زیادہ ڈھینگ کو دخل ہے۔

بات بھی درست ہے کہ ہماری مسجدوں میں یہ تزخرف اور یہ حد سے بڑھی ہوئی گلکاری دوسری ہی قوموں کی عبادت گاہوں

---

(۱) ابوداؤد باب بناء المسجد۔
(۲) قاموس ۳/۱۴۷۔

سے آئیں اور یہاں آکر اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ اب وہ قومیں جن سے یہ چیز لی گئی تھی بہت پیچھے رہ گئیں۔ آج بھی روئے زمین پر مسجدیں مسلمانوں کی رہ گئی ہیں وہ بے نظیر ہیں ۔ تفصیل دیکھنی ہو تو دیکھئے "اخبار الاندلس" مترجمہ منشی خلیل الرحمان باب بست ونہم جلد سوم۔

تفاخر علامتِ قیامت

شریعت میں اس طرح کی زینت کو ناپسند غالباً اس لئے کیا گیا ہے کہ اس مرکز پر پہنچ کر اخلاص وللّٰہیت ختم ہو چکتی ہے اور فخر ومباہات اس کی جگہ لے لیتی ہے جس کو حدیث میں علاماتِ قیامت میں شمار کیا گیا ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے :۔

لاتقوم الساعة حتى يتباهى الناس فى المساجد (۱)	قیامت اس وقت آئے گی جب لوگ مسجدوں میں تفاخر کرنے لگیں گے

تجربہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ مغز کو چھوڑ کر چھلکے پر وہ قوم جان دیتی ہے جس کے برے وقت آجاتے ہیں اور محرومِ القسمتی کے گھنگھور گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر برسنے لگتی ہیں، سچ فرمایا نبی صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے :۔

ماساء عمل قوم قط الا زخرفوا مساجدهم ۔ (۲)	جب کسی قوم کے اعمال بگڑتے ہیں تو وہ اپنی مسجدوں کو مزین کرتی ہیں ۔

---

(۱) ابوداؤد باب بناء المساجد۔

(۲) ابن ماجہ باب تشیید المساجد۔

یہ پیشین گوئی ہے کہ تزئینِ مساجد قوم کی بداعمالی کی علامت ہے جس چیز کو مسلمانوں نے سمجھا تھا کہ بڑائی اسی میں ہے وہ شریعت کی نظر میں بدترین نکلی، سرکارِ دو عالم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

اراکم ستشرفون مساجدکم کما شرفت الیھود کنائسھا و کما شرفت النصاریٰ بیعھا۔	میں دیکھتا ہوں کہ تم قریب ہی زمانہ میں مسجدوں کو بلند و بالا بنانا شروع کردوگے جیسا کہ یہود و نصاریٰ اپنے کنیسے اور گرجے بنواتے ہیں۔
(ابن ماجہ باب تشیید المساجد)	

مسجد کی عمارت کی بلندی اور اس کی گلکاری کو دیکھئے اور اس کے بعد اس کی آبادی کا جائزہ لیجئے تو اندازہ ہو کہ یہ جذبہ کس قدر کھوکھلا ہے، ظاہری زینت کا یہ حال اور منشاءِ اصلی کا ایسا فقدان۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں، اسی حالت کی طرف خادم رسول صلعم حضرت انس رضؓ نے اشارہ فرمایا تھا:-

یتباھون بھا ثم لا یعمرونھا الا قلیلاً۔	مسجدوں میں لوگ تفاخر کریں گے مگر پھر اس کی آبادی کا خیال کم ہی لوگوں کو ہوگا۔
(بخاری ۱/۶۴)	

تزئین خشوع کے خلاف ہے

ایک پہلو سے اور غور کیجئے کہ مسجدوں کی زینت کتنی بے جا ہے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ نماز کی روح خضوع و خشوع ہے اور اس کے بغیر نماز بے جان ہے۔ اس زمانہ میں خشوع کا یوں ہی فقدان ہے مگر جب کہ نقش و نگار ہوں گے تب تو یہ چیزیں اور بھی نمازی کو لہو و لعب

میں مبتلا کردیں گی، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے دروازہ پر خوبصورت پردہ دیکھا تو فرمایا:

امیطی قرامک ھذا فانہ	اپنے اس باریک و خوبصورت پردہ
لایزال تصاویرہ تعرض لی	کو ہٹالو، اس کی تصویریں نماز میں مجھ کو
فی صلوٰتی۔ (بخاری)	چھیڑتی ہیں۔

دیوار تو اپنی جگہ رہی آپؐ نے بوٹے دار چادر بھی اپنے لئے پسند نہیں فرمائی اور وجہ یہ بیان کی کہ یہ چادر مجھ کو نماز میں غافل کر دیتی ہے (۱)

اس حدیث میں جہاں حضورِ قلب پر حثّ اور انقیاد و خشوع کی دعوت ہے وہاں دل میں انتشار پیدا کرنے والی چیزوں کی طرف دیکھنے کی ممانعت بھی ہے۔ امام نوویؒ نے اسی حدیث کے سلسلہ میں لکھا ہے:-

"مسجد کے محراب کی تزئین اور اس کی دیواروں کو منقش بنانا ایسی چیزیں ہیں جو نمازیوں کی توجہ اپنی طرف جذب کر لیتی ہیں، لہٰذا محراب اور در و دیوار کی تزئین، نیز نقش و نگار بنانا مکروہ ہے، کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی منقش چادر کو دور کرتے ہوئے یہی علت بیان فرمائی تھی (۲)

کتنی عجیب بات ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرا ذرا سی باتوں سے اجتناب کیا کہ کہیں دل کا خشوع متاثر نہ ہو جائے

---

(۱) مسلم ۱/۲۰۸۔
(۲) نووی شرح مسلم ۱/۲۰۸۔

معمولی نقش و نگار اور گلکاری کو اپنی نماز میں مخل سمجھا تاکہ نماز کا پورا حق ادا ہو سکے مگر آج ان کے پیروؤں کا یہ عالم ہے کہ ان سے بڑھ کر مخل چیزوں سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔

بقدرِ ضرورت اجازت

بلا شبہ زمانہ کے پیشِ نظر بعض علماء نے خوبصورت و مزیّن مسجد بنوانے کی اجازت دی ہے، مثلاً ابن المنیر کہتے ہیں کہ زمانہ جب ترقی کا ایسا آجائے کہ لوگ اپنے رہنے سہنے کے لئے عالیشان محل اور رنگین کوٹھیاں تعمیر کرنے لگیں تو ایسے زمانہ میں استخفاف اور استہانت سے بچنے کے لئے مسجدوں کی بھی تزئین ہونی چاہیئے، حتیٰ کہ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ سلفِ صالحین کی اتباع میں روکنا تو جائز ہے مگر کسی اور وجہ سے مسجد کی تزئین روکنا مناسب نہ ہوگا۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی اجازت دی ہے مگر اس وقت جب یہ تزئین و نفاست تعظیم و تکریم کی نیّت سے ہو اور روپے اپنے پاس کے ہوں، وقف یا بیت المال کے نہ ہوں۔

فقہاء کی تفصیل

لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ دوسرے بہت سے علماء اس تزئین کے خلاف ہیں اور ان کی دلیل بہت قوی اور حدیث کے نقطۂ نظر کے بہت قریب ہے۔ اس سلسلہ کی حدیثیں ابھی اوپر گذر چکی ہیں[1]۔ امام اعظمؒ جنھوں نے اجازت دی ہے ان کا یہ بھی کہنا

---

[1] فتح الباری ۱/۳۶۳۔

ہے کہ یہ تزئین خلافِ اولیٰ ہے اور ان کے اقوال کی تفصیل کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذاتی رجحان اسی طرف ہے کہ مسجدیں سادہ بنائی جائیں اور جو روپے نقش و نگار اور گلکاری میں خرچ ہوں اچھا یہ ہے کہ انہیں فقراء و مساکین پر خرچ کیا جائے جو واقعی امداد و اعانت کے مستحق ہیں، فقہِ حنفی میں یہ بھی مصرّح ہے کہ محراب، قبلہ کی دیوار اور داہنی اور بائیں جانب کی دیواریں سادہ رکھی جائیں، ان پر پھول پتیاں نہ بنوائی جائیں کیوں کہ ان کی کراہیّت میں کسی کو بولنے کی گنجائش نہیں ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ محراب کی تزئین امام کے خشوع اور یکسوئی کے لئے زہرِ قاتل ہے جو پوری جماعت کا سردار ہے قبلہ کی دیوار کی زینت اور گلکاری اس لئے منع ہے کہ صفِ اوّل کے نمازیوں کے خضوع کے لئے مضر ہے اور دائیں اور بائیں کی دیواریں ان لوگوں کے لئے مخل ہوں گی جو ان کے قریب کھڑے ہوں گے۔ غور کیجئے جو چیزیں نماز کے انہماک اور احسان ہی کو کھو ڈالیں، جو نماز کی روح اور قلب کا درجہ رکھتی ہیں، ان کو شریعت کیوں کر پسند کر سکتی ہے۔ لے دے کے پیچھے والی دیوار اور چھت رہ جاتی ہے جن کے متعلق اجازت سمجھ میں آتی ہے مگر وہ بھی خلافِ اولیٰ ہے، یہ ساری تفصیل مسجد کے اندرونی حصّہ کی ہے۔ باقی رہا مسجد کا بیرونی حصّہ جس کو اندر سے کوئی تعلق نہیں، اس حصّہ کے متعلق فقہ حنفی میں بالکل اجازت ہے کہ اس کا تعلق باہر سے ہے جس سے اہلِ مسجد کو کوئی لگاؤ نہیں[1]۔

---

[1] ردالمحتار ۱/۶۱۶۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ اگر کسی متولّی نے مالِ وقف سے اندرونی حصّہ ہی میں سہی گلکاری کی یا پھول پتیاں بنوائیں تو اس کو تاوان ادا کرنا ہوگا (۱)

یہ جو کچھ تفصیل پیش کی گئی ہے یہ فقہِ حنفی کی مشہور کتاب ردّ المحتار کا خلاصہ ہے، عالمگیری جو فتاویٰ میں بہت مشہور و مقبول ہے اس میں تو دیواروں کے نقش و نگار کو مطلقاً مکروہ لکھا ہے اور یہ تصریح ہے کہ نقش و نگار کم ہوں یا زیادہ دونوں صورتوں میں کراہت سے خالی نہیں۔ ہاں چھت کے معمولی نقش و نگار کو جائز کہا ہے، زیادہ پھول پتیوں کو اس میں بھی مکروہ ہی لکھا ہے (۲)

تزئین سے اجتناب

اس تمام تفصیل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ بے فائدہ پھول پتیوں سے اجتناب ضروری ہے جو فضول خرچی اور اسراف میں داخل ہے اور جس کی قرآن نے قباحت بیان کی ہے۔

اولیٰ یہ ہے کہ مسجد کی دیوار مضبوط، بقدرِ ضرورت خوبصورت اور سادہ ہو، ان پر کچھ لکھا ہوا بھی نہ ہو، صاحبِ بحر الرائق لکھتے ہیں:۔

والاولیٰ ان تکون حیطان	اچھا یہ ہے کہ مسجد کی دیواریں سفید
المسجد ابیض غیر منقوشۃ	اور نقش و نگار سے پاک ہوں، ان

(۱) ردالمحتار ۱/۶۱۶۔

(۲) عالمگیری ۶/۲۱۴۔

ولامکتوب علیھا ویکرہ ان تکون منقوشة بصور وکتابة(۱) پر لکھا ہوا بھی کچھ نہ ہو، صور وکتابت سے منقش کرنا مکروہ ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کو عرب وعجم میں جو مقبولیت حاصل ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے، ان کی رائے بھی سننے کے لائق ہے۔

"تعمیرِ مسجد میں احتیاط سے کام لیں کہ وہ... مطلاّ و مزیّن کی حد کو پہنچنے نہ پاتے، اس کی دیواروں اور چھتوں پر سونے کا پانی نہ چڑھائیں اور نہ پھول پتیوں سے آراستہ بنائیں اور نہ نیلے رنگ وغیرہ سے رنگین ہی کریں، کیوں کہ اس طرح کی چیزیں مسجد کو تماشا گاہ کے درجہ میں کر دیتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین فاروقِ اعظمؓ نے مسجدِ نبوی کی تجدیداتِ عمارت کے وقت تاکید کر دی تھی کہ مسجد ایسی ہو جو لوگوں کی بارش وغیرہ سے حفاظت کرے۔ خبردار سرخ زرد رنگوں سے رنگین مت بنانا کہ لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں (۲)

موجودہ دور میں تزئین

اس زمانہ میں جب کہ مسلمان مالی اعتبار سے تباہی وبربادی کے کنارے پہنچ چکے ہیں، فقر وفاقہ نے ان کے گھروں میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے، فقراء ومساکین کی بہتات ہے، یتیموں اور بیواؤں کا کوئی پرسانِ حال نہیں، غریب بچوں کی مذہبی تعلیم مشکل ہو رہی ہے، دینی اور علمی ادارے نزع کے عالم میں ہیں اور فقر وفاقہ کی

---

(۱) البحر ۵/۲۵۱۔

(۲) تفسیر عزیزی پارہ اوّل ص ۲۴۲

تقریباً ہر جگہ شکایت ہے، مسجدوں میں بے فائدہ پھول پتیوں پر روپے صرف کرنا قرینِ عقل نہیں ہے۔

بلاشبہ پہلے مسلمانوں نے مسجدوں پر بہت خرچ کیا مگر وہ ہمارے لئے کوئی شرعی دلیل نہیں بن سکتی ہے پھر یہ کہ وہ مالی اعتبار سے ہم سے بہت بڑھے ہوئے تھے، زر و جواہر کے ان کے پاس ڈھیر تھے مسلمانوں میں فقر و فاقہ اور افلاس کی یہ عام وبا نہ تھی۔

پھر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ عملی طور پر بھی زینت کے رواج کے ساتھ مسجد ویران ہوتی گئی، مسجد کی گلکاری بڑھی مگر دل کی گلکاری ختم ہو گئی اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بچے کھچے نمازیوں کے سینوں میں بھی خشوع و خضوع کا سرچشمہ خشک ہو رہا ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض حِصص مسجد کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کر دیا جائے۔

مینار برائے اذان

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں تجدید مسجد نبوی کے وقت اذان کے لئے مینار کی ایجاد عمل میں آئی، اس سے پہلے مینار نہ تھا۔ علاّمہ ابن عابدین نے بحر الرائق کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ مینار عہدِ نبوی میں نہ تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں:-

ولم تکن فی زمنہ صلی اللہ علیہ وسلم مئذنۃ (ردالمحتار ۱/۳۶۰)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مئذنہ نہیں تھا۔

یہ مینار جو اذان کے لئے بنتا ہے گو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں نہ تھا مگر یہ ایسی چیز ہے جس کا مطلوب ہونا سمجھ میں آتا ہے، حدیث سے بھی اس ضرورت کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت عروہ بن الزبیرؓ بنی نجّار کی ایک خاتون سے روایت کرتے ہیں:

کان بیتی من اطول حول	میرا گھر مسجد نبوی کے آس پاس گھروں
المسجد فکان بلال یؤذن	میں سب سے اونچا تھا جس پر بلالؓ فجر
علیہ الفجر فیاتی السحر	کی اذان دیتے تھے، صبح سویرے آکر
فیجلس علی البیت ینظر الی	گھر پر بیٹھ جاتے اور فجر دیکھتے رہتے
الفجر فاذا راٰہ تمطی۔	جو نہی اس کو دیکھتے اذان کے لئے
(ابوداؤد باب الاذان فوق المینار)	چلتے۔

ردّ المحتار میں لکھا ہے کہ یہ زید بن ثابتؓ کی ماں ہیں جن کا بیان ہے کہ میرے گھر پر چڑھ کر حضرت بلالؓ اذان دیتے تھے، مسجد کی چھت تیار ہوئی تو اس پر سے اذان دی جاتی تھی، اذان کی جگہ ذرا بلند کر دی گئی تھی (۱)

اس تفصیل سے مقصد یہ بتانا ہے کہ اس کی ضرورت کا احساس پہلے سے تھا، گو باضابطہ اس کی ایجاد بعد میں ہوئی، شامی کے بیان کے مطابق مینار برائے اذان حضرت معاویہؓ کے حکم سے تیار ہوا (۲)

منبر برائے خطبہ

منبر مسجد جس پر سے امام جمعہ کا خطبہ دیتا ہے، اس کی ایجاد عہدِ

---

(۱) ردالمحتار ۱/۳۶۰۔ (۲) ایضاً

بنوی ہی میں ہوئی، اوّل اوّل یہ چیز نہ تھی، غربی جانب سے قریب اور محراب سے متصل ایک لکڑی تھی، پہلے آپؐ اسی کے سہارے خطبہ دیتے تھے، ۷ھ تک یہی طریقہ باقی رہا، ۸ھ میں ایک خاتون نے درخواست کی کہ اجازت ہو تو اپنے غلام سے منبر بنوا کر حاضرِ خدمت کروں، آپؐ نے اجازت دی اور پھر اس کا تقاضا بھی فرمایا، چنانچہ اسی عورت نے منبر بنوا کر پیش کیا اور اس کو منبر کی جگہ نصب کیا گیا۔(۱)

اس وقت یہ عجیب واقعہ پیش آیا تھا کہ وہ لکڑی جس کے سہارے آپؐ پہلے خطبہ دیتے تھے زار و قطار رونے لگی اور داغِ فرقت پر تلملا اٹھی، آپؐ نے اسے اپنے سینۂ مبارک سے لگایا تو اس کو سکون آیا۔ منبر شریف کے تین زینے تھے، ہر زینہ کا عرض ایک بالشت تھا اور پورے منبر کا طول دو ذراع (ہاتھ) اور عرض ایک ذراع (ہاتھ) تھا (۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عصائے مبارک اور کمان کے سہارے بھی خطبہ دیا ہے البتہ تلوار اور نیزے کے سہارے خطبہ دینا آپؐ سے ثابت نہیں ہے، کوئی دے تو شرعی قباحت نہیں معلوم ہوتی (۳)

منڈیر یا کنگرہ

مسجد کی چھت پر جو جالی دار منڈیریں ہمارے زمانہ میں بنتی

---

(۱) شرح سفر السعادت ص ۳۰۹ و فتح الباری ۱/۳۳۰۔

(۲) شرح سفر السعادت ایضاً و زاد المعاد ۱/۴۸۔

(۳) ایضاً۔

ہیں وہ عہدِ نبوی میں نہ تھیں بلکہ عہد خلفائے راشدین میں بھی نہ تھیں یہ ان کے بہت بعد ولید بن عبد الملک بن مروان کے عہد میں پیدا ہوئی ہیں "وفاء الوفاء" میں ہے:۔

فاول من احدث المحراب و الشرفات عمر بن عبد العزیز (۱)	پہلے جس شخص نے محراب و منڈیر کی ایجاد کی وہ عمر بن عبد العزیز ہیں۔

یہ بزرگ اس زمانہ میں مدینہ منورہ کے عامل تھے اور مسجد نبوی انہی کی نگرانی میں عمدہ عمارت میں تبدیل ہوئی تھی۔

مروّجہ محراب

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ محرابِ مروجہ بھی بعد کی ایجاد ہے گو بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ یہ عہدِ نبوی سے ہے جیسا کہ ابن الہمام کہتے ہیں (۲) مگر حدیث سے اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ علماء کی ایک جماعت نے اس کو ناپسند کیا ہے[۳] اور انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کی دلیل میں حدیث پیش کی ہے (۴)

مسجد البیت

قرآن پاک کی بعض آیات سے علماء نے گھر میں مسجد بنانا ثابت کیا ہے اور احادیث تو اس سلسلہ میں بکثرت آئی ہیں، اس کو اصطلاح

---

(۱) ج ۱ ص ۳۷۲۔

(۲) کبیری ص: ۳۴۸۔

(۳) روح المعانی ۱/۱/۵۷۔ (۴) میں نے اس پر تفصیلی بحث کی تھی مگر بعض علماء کے مشورہ سے حذف کردی، تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے مجموعہ فتاویٰ عبدالحی ۱/۲۲۴ منہ ۱۲

میں "مسجد البیت" کہتے ہیں، یہ دراصل گھر کی وہ مخصوص جگہ ہے جسکو نوافل وغیرہ کے لئے متعین کرلیں، مکی زندگی میں انہی جگہوں کو کہیں کہیں حدیث میں مسجد کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، نوافل پڑھنے کا حدیث میں کافی اشارہ موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اذا قضیٰ احدکم الصلوٰۃ فی مسجدہ فلیجعل لبیتہ نصیباً من الصلوٰۃ۔ (بخاری)	تم میں سے کوئی جب اپنی مسجد میں نماز ادا کر چکے تو اس کو اپنے گھر کے لئے بھی کچھ حصہ بنانا چاہیئے۔

محدثین نے اس سلسلہ میں نوافل کو گھر کے لئے لکھا ہے، فرض پر یہ حکم کبھی بھی محمول نہیں ہوسکتا اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں آپؐ نے فرمایا کہ گھر کو قبر نہ بنالو (۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد البیت بنانے کا حکم بھی دیا ہے، اور ساتھ ہی اس کے پاک وصاف رکھنے کا بھی، حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں:۔

امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ببناء المسجد فی الدور وان ینظف ویطیب (۲)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھروں میں مسجد بنانے کا حکم دیا اور اس کے پاکیزہ اور معطر رکھنے کا۔

لفظ "دور" کے معنی

"دُور" جمع ہے "دار" کی جس کے مشہور معنی گھر کے ہیں، مگر لغت میں

---

(۱) فتح الباری ۱/ ۳۵۶۔
(۲) مشکوٰۃ عن الترمذی وغیرہ ۱/ ۶۹۔

محلّہ کو بھی کہتے ہیں، قرآن میں "دار" بمعنی محل (جگہ) آیا ہے۔ اسی وجہ سے اس حدیث کے لفظ "دور" سے محلّہ اور گھر دونوں مُراد ہیں، شرح السنۃ میں "دور" بمعنی محلوں کے لئے گئے ہیں، حضرت سفیانؒ کہتے ہیں: بناء المسجد فی الدور یعنی القبائل (۱)

احکام میں مسجد اور مسجد البیت کے بہت فرق ہے، مسجد البیت کی وہ تعظیم نہیں ہے جو مسجد کی ہے۔

مواضع مسجد

تعمیر مسجد کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مسجد کہاں اور کیسی بنائی جائے؟ قرآن اور حدیثِ نبوی کی روشنی میں فقہاء نے جو کچھ لکھا ہے یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

عہدِ نبوی کی دو مسجدیں بہت ممتاز ہیں، ایک قبا اور دوسری نبوی۔ ان دونوں مسجدوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے بنیاد و تعمیر کا شرف حاصل کیا ہے اور ان دونوں ہی کے متعلق قرآن پاک کا اعلان ہے "اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی" کہ انکی بنیاد تقویٰ پر ہے، مسجد حرام کی داغ بیل خود ربّ العزت کی بتائی ہوئی زمین پر ڈالی گئی، یہ بھی آپ پڑھ آئے ہیں کہ مسجد نبوی کے لئے قیمت دے کر زمین لی گئی تھی، یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ مسجد کے لئے حلال اور پاک چیز ہی قبول کی جا سکتی ہے، ان سب کو ملا کر پڑھئے تو

---

(۱) فتح العلام شرح بلوغ المرام ۱/۱۴۴۔

خود بخود یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ زمین جس پر مسجد بنانا ہو ایسی ہو جو احکامِ شرعی کی روشنی میں جائز طریقہ سے حاصل کی گئی ہو، اور اس میں کوئی نقص باقی نہ رکھا گیا ہو۔

زمین کا عطیہ جائز طریقہ سے

فقہاء کرام نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کوئی مسجد ایسی جگہ بنا دے جس میں دوسرے کا حق ہو اور اس کی رضامندی حاصل نہیں کی گئی ہے تو اس حق والے کو اختیار ہے کہ مسجد کو وہاں سے باطل قرار دیدے اور اپنا حق لے لے۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک زمین ہے جس میں کسی کو حقِ شفعہ حاصل ہے، یہ جوار کی وجہ سے ہے یا رشتہ داری کی وجہ سے۔ تو اب اس پر مسجد بنائی نہیں جا سکتی (۱) اسی طرح فرض کر لیجئے کہ ایک شخص بیمار ہے، اس کی خواہش ہوئی کہ اپنا گھر یا زمین مسجد میں تبدیل کر دے، اس نے مرتے ہوئے اس کی وصیّت بھی کر دی مگر اس کے جن وارثوں کو حقِ شرعی پہنچتا تھا ان کو نہیں دیا، اس کی یہ وصیّت ایسی صورت میں مسجد کے لئے بھی جاری نہ ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ ایک تہائی میں جاری ہوگی، وارثان اپنا حق نکال لیں گے، خود مرنے والا اگر تمام حقوق نکال کر تہائی کی وصیّت کرتا تو کوئی اشکال پیدا نہ ہوتا اور وہ حصّہ مسجد ہو جاتا (۲)

---

(۱) فتح القدیر ۲/۸۷۵۔

(۲) عالمگیری ۳/۲۳۸۔

زمین کا حصول جائز ہو

اسی طرح اگر زمین مسجد کے لئے خریدی جائے تو جائز طریقہ سے، بیع فاسد سے خریدی ہوئی زمین پر مسجد بنانے کی اجازت نہ ہوگی[۱]
اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لَایَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ۔

ناجائز طریقہ سے حاصل کی ہوئی زمین پر مسجد بنانا درست نہیں ہے۔ اس ناجائز حصول کی شکل جو بھی ہو مثلاً کسی کا گھر زبردستی کچھ لوگ مل کر مسجد بنادیں، یا جامع مسجد بنادیں تو ایسی مسجد میں نماز جائز نہ ہوگی، نہ جمعہ کی اور نہ وقتی (۲)

وقف کرنے کے بعد مسجد کی حیثیّت

انہی تفصیلات کے پیش نظر واقف کے لئے لازم ہے کہ مسجد کو اس کے راستہ سمیت علیٰحدہ کردے اور نماز کی عام اجازت دیدے اور یہ اعلان کردے کہ میں نے اس جائز حصہ کو اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کردیا، عملی طور پر اس میں باجماعت نماز پڑھی جانے لگے، اذان پکاری جائے اور واقف اپنے دوسرے قسم کے اختیارات اُٹھالے، اس قدر کر چکنے بعد اس کو یہ اجازت نہیں ہے کہ مسجد کے کسی حصّہ سے کسی طرح کا ذاتی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے، اب اس کے بعد نہ اس مسجد کے نیچے کوئی مکان بنا سکتا ہے اور نہ اس

---

(۱) فتح القدیر ۳/۸۷۵۔
(۲) عالمگیری ۶/۲۱۴۔

کے اوپر، مسجد کا پورا حصہ تحت الثریٰ سے لے کر آسمان تک ہمیشہ کے لئے واقف کے ذاتی قبضہ و تصرّف سے نکل گیا، خدانخواستہ اگر کسی سماوی آفت یا کسی اور وجہ سے مسجد ویران بھی ہو جائے، کوئی نماز پڑھنے والا باقی نہ رہے اور مسجد کی عمارت برباد ہو جائے تو بھی یہ حصہ مسجد ہی کے حکم میں باقی رہے گا، نہ اسے کوئی فروخت کرسکتا ہے نہ کوئی وراثت میں لے سکتا ہے اور نہ واقف رجوع ہی کرسکتا ہے اور نہ کوئی انسان اسے اپنے ذاتی تصرّف یا کسی ایسے کام میں لاسکتا ہے جو مسجدیت کے خلاف ہو، واقف تک کو وقف کے بعد اتنی اجازت نہیں ہے کہ اس کی دیوار کے سہارے کوئی کام لے (۱)

جزوی مسائل

مسجد کی اسی اہمیت کے پیش نظر فقہاء نے صراحت کردی ہے کہ کوئی ایسی مسجد بنائے کہ دو منزلہ عمارت میں ایک منزل مسجد بنادے اور دوسری منزل اپنے تصرّف میں رکھے تو یہ مسجد قرار نہ پائے گی. مسجد اسی وقت ہوگی جب وہ اس کے دونوں حصے نیچے سے اوپر تک مسجد بنائے (۲)

کسی نے اپنی افتادہ زمین ہمیشہ کے لئے نماز باجماعت پڑھنے کے لئے دے دی اور کوئی قید سال مہینے کی نہیں لگائی تو اس دینے والے کے مرنے کے بعد یہ زمین اسی کام کے لئے ہو جائے گی، وارث کو اس

---

(۱) فتح القدیر ۸۷۷/۲ و در مختار ۵۱۳/۳۔

(۲) فتح القدیر ۸۷۷/۲۔

میں حصہ نہ ملے گا، ہاں مقید ہو تو وارث کو مل جائے گی (۱) یہ زمین جبکہ اس نے اپنی صحت کے زمانہ میں دی ہو (یا مرض الموت کے پہلے)

کوئی راستہ اس قدر کشادہ ہو کہ اگر وہاں مسجد بنائی جائے تو اس سے راستہ کا کچھ نقصان نہ ہو ایسی صورت میں اہلِ محلّہ نے جب مسجد راستہ پر بنالی تو یہ جائز ہے، دو ایک کی مخالفت کا کوئی اثر نہ ہوگا، ہاں مسجد بننے سے چلنے والوں کو ضرر ہو تو بلاشبہ مسجد بنانا درست نہیں ہے (۲)

ایسی عام نہر جو کسی خاص جماعت کے تصرف میں ہے، اس جماعت کی رائے سے اس کو پاٹ کر مسجد بنا سکتے ہیں بشرطیکہ کسی کو اعتراض نہ ہو، اسی طرح بوقتِ ضرورت کشادہ راستہ سے ایک حصہ مسجد میں شامل کیا جاسکتا ہے جب کہ راہ گیروں کو اس سے نقصان نہ ہو، لیکن مسجد کا کوئی حصّہ کسی حال میں راستہ میں لینا جائز نہیں ہے (۳)

مسجد جائز جگہ میں ہر مسلم آبادی، بازار، گذرگاہ اور جہاں واقعی ضرورت ہو بنائی جاسکتی ہے (۴) ہاں ایسی جگہ مسجد نہ بنائی جائے، جہاں اس سے کوئی فائدہ نہ ہو جیسے ویران میدان وغیرہ میں جہاں کوئی پہنچ نہیں سکتا ہو (۵)

---

(۱) فتح القدیر ۲/۷۷۔

(۲) عالمگیری ۲/۴۳۹۔

(۳) ایضاً۔

(۴) فتح القدیر ۱/۳۷۷۔

(۵) عالمگیری ۵/۳۲۰، کتاب الکراہیۃ، الباب الخامس۔

تیار مسجد کو وسعت دینا

مسجد جب تنگ ہو جائے تو اسے وسعت دی جا سکتی ہے ؟
بغل میں مسجد ہی کی زمین ہے تب تو کوئی بات نہیں ہے اور کسی دوسرے کی ہے تو قیمت دے کر لیں گے ، اگر وہ قیمتاً بھی نہ دے تو اس کو مجبور کریں گے ورنہ بدرجہ مجبوری اس کی بھی اجازت ہے کہ قیمت دیکر بغیر رضامندی لے لی جائے (۱) مگر یہ آخری شکل ہے ، حتی الوسع راضی کر کے لینا اچھا ہے ۔

ایک مسجد ہے جو اہلِ محلّہ پر تنگ ہو گئی ، اسے وسعت دینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ مسجد کا ایک پڑوسی کہتا ہے کہ یہ ہمیں دے دی جائے کہ گھر بنالیں اور اس کے عوض میں اپنا مکان دیتا ہوں جو اس سے کشادہ ہے اس کو مسجد بنالیا جائے ، امام محمدؒ کہتے ہیں کہ یہ صورت جائز نہیں ہے اور اہلِ محلّہ کو اس کا اختیار بھی نہیں ہے (۲)

تنگ مسجد کی بغل میں جو دکان یا زمین ہے وہ اسی مسجد پر وقف ہے تو اس کو مسجد کی کشادگی میں لے سکتے ہیں ۔ اہلِ مسجد صحنِ مسجد کو مسجد میں لے سکتے ہیں ۔ اہلِ مسجد کے لئے یہ جائز ہے کہ ایک دروازہ چھوڑ کر دوسرا دروازہ بنالیں ۔ قیّم مسجد کو یہ اختیار نہیں ہے کہ مسجد یا فناءِ مسجد میں دکان بنائے ، کیوں کہ فنائے مسجد بھی احترام میں مسجد ہی کے حکم میں ہے اور یہ مسجد کے تابع ہے لہٰذا ایسی بات نہ ہونے دیں گے جس سے

---

(۱) عالمگیری ۲۳۸/۲ ۔

(۲) ردالمحتار ۵۱۲/۳ ۔

تعظیم و تکریم میں کچھ فرق آئے (۱)

مسجد بن کر تیار ہو چکی تو پھر کوئی اس کے اوپر یا نیچے دکان بنوانا چاہے تو جائز نہیں ہے جس غرض سے بھی ہو، البتہ نماز کے لئے کچھ بنانا ہو تو یہ جائز ہے (۲)

تجدیدِ مسجد

ضرورت کے وقت تیار مسجد میں تصرف کرنا جائز ہے جب کہ مسجد اور نماز ہی کے لئے یہ تصرف ہو، جیسے پُرانی عمارت توڑ کر نئی عمارت بنانا مگر اس کے لئے قاضی کی اجازت شرط ہے اور یہ بھی کہ ایسا اپنے اخراجات سے کرے۔ مسجد کے خزانے یا وقف سے ایسا کرنا جائز نہیں ہے اور یہ اجازت ان شرطوں کے ساتھ اہل محلّہ ہی کو ہے، دوسروں کو نہیں، ہاں جب خطرہ ہو تو غیر محلہ والے بھی کر سکتے ہیں (۳)

اہلِ محلہ کو اس کی بھی اجازت ہے کہ مسجد کو سامان دیں، جیسے چٹائی، دری، جانماز، روشنی اور پانی وغیرہ کا نظم، چاہے پینے کا ہو، چاہے وضو کا مگر اپنے پاس سے، اور خود بانیٔ مسجد کرے تو دوسرے کو حق نہ ہوگا (۴)

---

(۱) فتح القدیر ۲/ ۸۷۷۔

(۲) ایضاً۔

(۳) ردالمحتار ۳/ ۵۱۲۔

(۴) حوالۂ سابق۔

ناگہانی آفت یا مصیبت

فقہاء نے اس کی بھی صراحت کردی ہے کہ دفعۃً اگر کسی آفت کا نزول ہو جائے یا کوئی بات ایسی پیدا ہو جائے جس سے مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تو اس وقت تیار شدہ مسجد کو کیا کریں گے؟

جیسے آشوب زمانہ یا انقلاب دور نے ایسی حالت پیدا کردی کہ مسلم آبادی وہاں سے ختم ہو گئی، یا وہ حالات سے مجبور ہو کر چلے گئے یا سب کے سب لقمۂ اجل ہو گئے جس کی وجہ سے مسجد ویران ہو گئی یا مسجد کی دیواریں گر گئیں، کوئی نہیں جو اس کی مرمّت کرے یا اس میں نماز پڑھے، مسجد کس میرسی کے عالم میں ہے، ان جیسے تمام حالات میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ باایں ہمہ مسجد، مسجد ہی رہے گی، اس میں کوئی دوسرا تصرّف کسی کے لئے بھی جائز نہیں ہے۔ نہ یہ مسجد فروخت کی جا سکے گی، نہ نیلام ہو گی، نہ اسے بیچ کر اس کی قیمت سے دوسری مسجد بنائی جائے گی اور نہ اس کا سامان اور مال و اسباب دوسری طرف منتقل کیا جا سکے گا، اگر کوئی یہ سب کرنا چاہے تو یہ جائز نہیں ہے، البتہ جب کسی ایسی مسجد کا سامان اور اسباب ضائع ہو رہا ہے یا کسی ظالم و غاصب کے ظلم و غصب کا غالب خطرہ ہے تو ایسی حالت میں اسباب کا دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز ہے، باقی یہ مسجد اپنی بنیاد پڑنے کے دن سے ابدالآباد تک مسجد ہی رہے گی اور تحت الثریٰ سے لے کر آسمان تک یہ حصّہ مسجد ہی کے حکم میں ہو گا (۱)

---

(۱) ردّالمحتار ۱/۵۱۳۔

سامان جس کی ضرورت باقی نہ ہو

اسی طرح جب مسجد کو فرش وغیرہ کی ضرورت باقی نہ رہی تو یہ دینے والے کو واپس مل جائے گا اگر وہ زندہ ہے ورنہ اس کے ورثہ کو ملے گا اور بعض علماء کا خیال ہے اسے فروخت کر کے اس کی قیمت دوسرے شعبۂ مسجد میں صرف کی جائے گی البتہ جب کسی شعبہ میں ضرورت باقی نہ رہے تو اسے دوسری مسجد کی طرف منتقل کر دیا جائے گا (۱)

اگر معطی (دینے والے) کی خواہش ہو کہ پُرانی چٹائی وغیرہ صدقہ کر دیں اور اس کی جگہ مسجد کو نئی دیں تو اس کو یہ حق ہے، یہی چیز محلّہ والے چاہیں تو اس وقت دیکھا جائے گا کہ چٹائی قابلِ قیمت ہے یا نہیں، اگر اس کی قیمت مل سکتی ہے تو اہلِ مسجد کو صدقہ کا حق نہیں ہے ورنہ ہے (۲)

جو گھاس موسمِ ربیع میں مسجد سے نکالی جائے اگر وہ بکنے کے لائق ہے تو بیچ دی جائے ورنہ نکالنے والا اپنے مصرف میں لا سکتا ہے۔ صاحب ردّ المحتار نے لکھا ہے بعض جگہوں میں گھاس فرش کی جگہ استعمال کی جاتی ہے (۳)

مُردہ اٹھانے والی چارپائی مسجد کی ملکیّت تھی، وہ بوسیدہ ہو کر یا کسی اور وجہ سے ناقابلِ استعمال ہو گئی تو اسے اہلِ محلہ قاضی کی اجازت سے فروخت کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی دیباج مکّہ مکرمہ پُرانا

---

(۱) عالمگیری ۲/۲۳۹۔ (۲) حوالۂ سابق۔

(۳) ایضاً۔

ہو جائے تو ذاتی طور پر اسے کوئی نہیں لے سکتا بلکہ سلطانِ وقت اسے بیچے گا اور اس کی قیمت اسی پر صرف کرے گا (۱)

مسجد جو گر رہی ہے اس کے سامان کے ضائع ہونے یا ظالم و جابر کے تصرّف میں جانے کا خطرہ ہو تو بیچ کر اس کی قیمت جمع کی جاسکتی ہے (۲) یہ واضح رہے کہ منہدم ہونے والی مسجد کی مرمّت میں اس سے زیادہ ثواب ہے کہ نئی مسجد بنائی جائے (۳)

دربارِ الٰہی کے آداب

اب تک خانۂ خدا سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ امر بالکل منقح ہوگیا ہوگا کہ اس دربار کی [illegible] صوصیت ہے اور اس کا امتیازی نشان بہت اونچا ہے تو جس مقدس گھر کی شان و شوکت اور وقعت و عزت [illegible] عنداللہ یہ حال ہو، یقینی طور پر اس کے آداب بھی اسی اعتبار سے بلند ہوں گے اور ان کا بجالانا بھی اسی قدر ضروری ہوگا۔

دنیا کے معمولی درباروں کا حال آپ کو معلوم ہے کہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس کے کچھ خاص آداب ہوتے ہیں جن کی بجاآوری ہر اس شخص پر لازم ہوتی ہے جو وہاں آئے، بادشاہِ وقت اور اس

---

(۱) عالمگیری ۳/۲۴۰۔ (۲) ردالمحتار ۳/۵۱۴۔

(۳) فتاویٰ عبدالحی ۱/۱۱۰۔

کے حکام کے اجلاس کے قوانین منضبط ہوتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کی حالت میں سزائیں متعین ہوتی ہیں، خواہ وہ جرمانہ کی سزا ہو یا قید و بند کی۔

دنیاوی حکام کے اجلاسوں کے آداب جنہیں ہم رات دن اپنی اپنی زندگی میں برتتے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ اس دربار کی عزت و وقعت کا کیا حال ہوگا جو انسانوں کا نہیں بلکہ ان کے خالق و مالک کا گھر کہلاتا ہے جو احکم الحاکمین کے روبرو ہونے کا مقام ہے اور جو اسی کے آگے سجدہ کرنے کے لئے مخصوص ہے۔

قرآن پاک میں اس گھر کا تذکرہ جس عنوان سے کیا گیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے، اس کی رفعت اور علو مرتبہ کی بڑی مدح سرائی کی گئی ہے، اس کی صفائی و پاکی کی بار بار تاکید بیان کی گئی ہے اور اس کے آداب کی طرف نمایاں اشارے کئے گئے ہیں اور رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نہایت تفصیل کے ساتھ ایک ایک چیز کو بتایا ہے اور ساتھ ہی ان احکام کی جو مسجد کے باب میں آئے ہیں خلاف ورزی پر وعیدیں سنائی گئی ہیں۔

آنے کے آداب

وہ آداب جو مسجد سے متعلق ہیں، مختلف شعبوں میں منقسم ہیں اور پھر ہر ہر شعبہ کے لئے متعدد جزئی احکام ہیں مثلاً آداب کی تقسیم میں مسجد آنے کے آداب، مسجد کی صفائی و پاکی کے آداب، مسجد میں بیٹھنے اور ذکر و شغل کے آداب وغیرہ وغیرہ ہیں، ان میں سے ہر ایک پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی، ضرورت ہے مذہب کے دلدادہ مسلمان

ان کو فکر و نظر کے ساتھ پڑھیں، ان کی حکمتوں کو سمجھیں اور پھر ان مسلمانوں کو بتائیں جن کو دنیا نے اپنے دامِ فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

نیّت پاک اور بخیر ہو

ہر چیز کی بنیادی اینٹ نیت ہے "انّما الاعمال بالنیّات" کی حدیث جس پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے جس کو شرح و بسط کے ساتھ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ مسجد کا ارادہ کرتے ہوئے نیت پاک اور دل صاف ہو، قلب دنیاوی گندگیوں سے پاک اور منزّہ ہو، نام و نمود، ریا و سمعہ کا چور دل میں چھپا نہ ہو، بلکہ دل محبّتِ مولیٰ سے سرشار اور خشیتِ الٰہی سے معمور ہو اور ایسا معمور جو لرزہ براندام کر رہا ہو، اس لئے کہ یہاں ذرا سی چوک سے پونجی کے لُٹ جانے کا خوف ہے اور اس سے بڑھ کر اندھے غار میں گر جانے کا اندیشہ۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا اور نیتِ صالحہ کو بتایا۔

وذٰلك انّه اذا توضأ فاحسن	یہ ثواب کی زیادتی اس وقت ہے
الوضوء ثم خرج الی المسجد	جب اچھی طرح وضو کرے پھر مسجد کے
لایخرجه الا الصّلوٰة۔	لئے نکلے اور فقط نماز ہی کی نیت سے
(بخاری ۱/۶۹)	نکل رہا ہو۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص میری اس مسجد میں کسی خیر کی نیت سے آئے اسکی مثال مجاہد فی سبیل اللہ کی ہے ورنہ وہ اس شخص جیسا ہے جو دوسرے کی متاع

للچائی ہوئی نگاہوں سے تاکا کرتا ہے (۱)

اس حدیث سے مسئلہ صاف ہوجاتا ہے کہ ایسے شخص کو کوئی ثواب میسّر نہیں ہوگا بلکہ اُلٹا دکھ ہوگا۔

باوضو آئے

گھر سے جب چلنے لگے تو پہلے وضو کر لیا جائے کیونکہ سنت طریقہ یہی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں جماعت کی نماز میں ثواب کی زیادتی کا ذکر فرمایا ہے وہاں یہ مصرّح ہے کہ ثواب کی زیادتی اس وجہ سے ہے کہ وضو کیا اور اس کے بعد خالص نیت سے مسجد روانہ ہوا اور انہی آداب کے ساتھ چلنے پر درجہ کی بلندی اور گناہ کی معافی کی بشارت ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

صلوٰۃ الرّجل فی الجماعۃ تضعف علیٰ صلاتہ فی بیتہ و فی سوقہ خمساً وعشرین ضعفاً وذٰلك انّہ اذا توضأ فاحسن الوضوء ثم خرج الی المسجد لایخرجہ الاّ الصّلوٰۃ لم یخطو خطوۃ الا رفعت لہ بہا درجۃ و حط عنہ بہا خطیئۃ۔ (بخاری ۱/۶۹)	مرد کی با جماعت نماز اس کی اس نماز سے جو گھر اور بازار میں پڑھی جائے پچیس گنا بڑھی ہوئی ہے اور وہ زیادتی اس وجہ سے ہے کہ اس نے وضو اس کے حقوق کے ساتھ ادا کیا اور محض نماز ہی کی نیت سے نکلا، اس سلسلہ میں جو قدم اُٹھائے گا اس کے بدلہ میں ایک درجہ بلند ہوگا اور اس کا ایک گناہ معاف ہوگا۔

(۱) مشکوٰۃ عن ابن ماجہ والبیہقی ۱/۷۱۔

ضرورت بھی ہے کہ دربارِ خداوندی کے لئے پوری تیاری کے ساتھ چلیں، کپڑے بھی صاف ہوں، بدن اور جسم بھی پاک ہو اور اعضاء وضو جو وہاں جاکر نمایاں طور پر مصروفِ مناجات اور اظہارِ تذلل میں پیش پیش ہوں گے، صاف ستھرے اور پاکیزہ ہوں۔

دعاء پڑھتے آیئے

روانہ ہوتے ہوئے زبان پر یہ دعا ہو جو دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہو:۔

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ بِحَقِّ السَّآئِلِیۡنَ عَلَیۡكَ وَبِحَقِّ مَمۡشَایَ ھٰذَآ اِلَیۡكَ فَاِنِّیۡ لَمۡ اَخۡرُجۡ بَطَرًا وَّلَآ اَشَرًا وَّلَا رِیَاءً وَّلَا سُمۡعَةً وَّاِنَّمَا خَرَجۡتُ اِتِّقَآءَ سَخَطِكَ وَابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِكَ وَاَسۡأَلُكَ اَنۡ تُنۡقِذَنِیۡ مِنَ النَّارِ وَاَنۡ تَغۡفِرَ لِیۡ ذُنُوۡبِیۡ اِنَّهٗ لَا یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّآ اَنۡتَ۔"

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص نماز پڑھنے کے لئے نکلتا ہے اور یہ (اوپر والی دعا) پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کے لئے ستر ہزار فرشتے مقرر فرماتا ہے جو اس کے لئے فراغتِ نماز تک دُعا کرتے ہیں (۱)

ان چند جملوں کی دعا پڑھنے کا کتنا بڑا اجر رکھا گیا ہے، محنت معمولی اور مزدوری اتنی بڑی۔ اس پر بھی ہمارے دل اثر پذیر نہ ہوں تو حیرت کی بات ہے، میں نے اس مسئلہ پر جتنا غور کیا کہ "نظامِ مساجد" سے

---

(۱) شرح سفر السعادت ص ۳۹۴ وزاد المعاد ۲/۱۴۔

متعلق کیا دینی اور دنیوی فائدے ہیں، سچ کہتا ہوں معلوم ہوا یہ اتھاہ سمندر ہے جس کی تہ تک پہنچنا آسان نہیں، کوئی قدم اور کوئی بولی اس سلسلہ کی فائدے سے خالی نہیں۔

اچھی ہیئت میں آئے

روانہ ہوتے ہوئے ایک نظر اپنی ظاہری ہیئت پر بھی ڈال لی جائے اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ ہم ایک عظیم المرتبت دربار کو جارہے ہیں، اتنا عظیم المرتبت کہ اسے دنیا کی جنت سے تعبیر کیا جائے تو مبالغہ نہیں۔ حدیث اوپر گذر چکی ہے جس میں ان درباروں کو جنّت کا باغ کہا گیا ہے، اس لئے جہاں ہر طرح کی نجاستِ حقیقی اور حکمی سے پاک ہوکر جانا ضروری ہے ادب یہ بھی ہے کہ ظاہری ہیئت عمدہ سے عمدہ ہو ایسی عمدہ جو شریعت کی نظر میں خراجِ تحسین حاصل کرسکے۔

حتی المقدور کپڑے پاک وصاف ہونے کے ساتھ صاف ستھرے ہوں، کرتہ کی آستین پوری ہو، اگر قدرت نے وسعت عطا کی ہے تو خوشبو مل لیں تاکہ پسینہ وغیرہ کی بو بالکلیہ جاتی رہے اور فرشتوں کو کوئی اذیّت نہ پہنچنے پائے۔ ارشادِ ربانی ہے "یَابَنِیۡٓ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ (الاعراف ۳۱) اے آدم کی اولاد تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباسِ زینت پہن لیا کرو۔

اس آیت سے مفسّرین نے استدلال کیا ہے کہ مسجد کی حاضری میں ہیئت حتی الوسع اچھّی ہو۔ ابن کثیر وغیرہ کے اقوال اس سلسلہ میں قابلِ ملاحظہ ہیں۔

باوقار واطمینان آئے

مسجد آتے ہوتے یہ خیال رہے کہ ہم ایک بڑی عبادت کے لئے بڑے گھر کی طرف جا رہے ہیں، اس لئے رفتار میں پورا وقار اعتدال اور سکینت نمایاں ہو، ایسی رفتار ہرگز نہ اختیار کی جائے جس سے دیکھنے والا ہلکا پن محسوس کرے اور عام نظروں میں مضحکہ خیزی کی حد تک پہنچ جائے، ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ نماز کا ارادہ کرنا بھی نماز ہی کے حکم میں ہے۔ لہذا راستہ چلتے ہوئے لہو ولعب، ہنسی مذاق اور ناجائز چیزوں پر نظر سے پرہیز کیا جائے اور یہاں بھی حتی الوسع نماز کے خلاف امور سے پورا اجتناب کیا جائے، نگاہ نیچی، دل میں محبت و خشیت اور امید و بیم کی کیفیت طاری ہو، چہرہ پر تواضع اور تذلل کے آثار ہوں مگر یہ سب کسی اور کے لئے ہرگز ہرگز نہ ہو، محض ربّ العالمین کے لئے ہو۔ اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان آیا ہے:۔

اذا سمعتم الاقامۃ فامشوا الی الصلوٰۃ وعلیکم بالسکینۃ والوقار ولاتسرعوا۔ (باب ما ادرکتم فصلوا)	تم جب اقامت سنو تو نماز کے لئے اس طرح چلو کہ تم پر سکینت و وقار طاری ہو اور دوڑو مت۔
واتوھا وعلیکم السکینۃ فما ادرکتم فصلوا وما فاتکم فاتموا فان احدکم اذا کان یعمد الی الصلوٰۃ فھو فی الصلوٰۃ (مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ)	نماز کے لئے اس طرح آؤ کہ تم پر وقار و اطمینان ہو، جو پالو پڑھ لو اور جو چھوٹ جائے اسے پورا کرلو، جب تم میں کا کوئی نماز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ حکماً نماز ہی میں ہوتا ہے۔

پیدل آئے

مسجد پیدل چل کر آنا چاہیئے، بغیر عذر شرعی سواری سے آنا اچھا نہیں تاکہ ہر قدم کا اجر نامۂ اعمال میں لکھا جائے جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور بھی یہی معلوم ہوتا ہے، پھر یہ کہ پیدل مسجد آنا باعث کفارۂ گناہ ہے، جیسا کہ ایک لمبی حدیث میں پورا واقعہ گذر چکا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رویت غنودگی کی حالت میں میسر آئی، ربّ العزت نے مجھ سے ملاء اعلیٰ کے بارے میں سوال کیا، میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی، آخرکار اس نے اپنا دستِ قدرت مجھ پر ڈالا جس کا اثر میں نے محسوس کیا، اس کے بعد ربّ العزت کی طرف سے پھر وہی سوال ہوا، اب میں نے کہا کہ فرشتے کفّاراتِ گناہ میں جھگڑ رہے ہیں، یعنی کون ایسے عمل ہیں جو گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنتے ہیں، میں نے تفصیلی جواب دیا۔ اسی حدیث میں پہلا جملہ یہ ہے :-

والمشی علی الاقدام الی الجماعات — جماعت کے لئے پاؤں پاؤں چلنا (باعث کفارۂ گناہ ہے)

(مشکوٰۃ باب المساجد)

پہلے دایاں پیر داخل کرے

راستہ اس طرح طے کرکے جب مسجد کے دروازہ پر پہنچ جائیں تو ذرا قلب و جگر تھام لیں کہ اب ایک بڑے دربار میں داخلہ ہو رہا ہے علمائے سلف اور صوفیائے کرام کے حالات میں میری نظر سے ایسے واقعات

گذرے ہیں جس کا تصوّر بھی آج کل مشکل ہی سے ہوسکتا ہے۔ بعض بزرگانِ دین کا مسجد کے دروازہ پر پہنچ کر رنگ بدل جاتا تھا اور ان کی عجیب کیفیّت ہوتی تھی۔

بہرحال داخل ہوتے ہوئے مسجد میں پہلے دایاں پَیر رکھیں، پھر بایاں اور فارغ ہوکر جب نکلنے لگیں تو اس کے خلاف کریں، یعنی پہلے بایاں پَیر نکالیں پھر دایاں، مگر جوتا وغیرہ پہلے داہنے ہی پَیر میں پہننے کا طریقہ مسنونہ یہی ہے۔

عن انس رضؓ انه يقول من السنة	حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ سنت ہے کہ
اذا دخلت المسجد تبدأ	جب مسجد میں تو داخل ہو تو پہلے دایاں
برجلك اليمنى واذا خرجت	پاؤں ڈال اور جب نکلے تو پہلے بایاں
ان تبدأ برجلك اليسرى (۱)	پیر نکال۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اسی پر عمل رہا اور ادب کا تقاضا بھی یہی ہے کہ نسبتاً دائیں کو بائیں پر فضیلت ہے۔

دعاء پڑھی جائے

دایاں پاؤں رکھتے ہوئے یہ دعاء پڑھی جائے: "اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِي اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ" (اے اللہ مجھ پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دے) اور جب نکلیں تو بایاں پاؤں پہلے نکالیں اور یہ دعاء پڑھتے ہوئے: "اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ" (اے میرے اللہ! تجھ سے تیرے فضل و بخشش کی درخواست کرتا ہوں)

---

(۱) فتح الباری ۲۵۳/۱۔

مسلم شریف میں حضرت ابو اسیدؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا دخل احدکم المسجد فلیقل اللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ (تم میں سے جو بھی مسجد میں داخل ہو اس کو کہنا چاہیے اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ)۔

واذا خرج فلیقل اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ (مشکوٰۃ ۱/۶۸)	اور جب مسجد سے نکلے تو یہ پڑھنا چاہیے اَللّٰھم انی اسئلك من فضلك۔

سلام کیا جائے

مسجد میں پہنچ کر دیکھے کہ لوگ جمع ہیں تو سلام کرے اور اگر کوئی موجود نہ ہو تو اس طرح سلام کرے "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا مِنْ رَّبِّنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ" قرآن پاک میں ہے:۔

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُبٰرَكَةً طَیِّبَةً (النور: ۶۱)	تم جب گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو جو کہ دعا کے طور پر ہے اور اللہ کی طرف سے مقرر ہے برکت والی پاکیزہ ہے۔

مفسّرین اور احکامِ قرآن بیان کرنے والوں نے اس آیت کے ضمن میں اس کو ثابت کیا ہے جو میں نے اوپر لکھا اور فقہائے کرام نے بھی اس کی صراحت کی ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایا جائے موضح القرآن شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور احکام القرآن للجصّاص جلد ۳ ص: ۴۱۴، اور عالمگیری جلد ۲ ص 215)

نماز تحیۃ المسجد

موقع ہو تو پہلے مسجد آکر دو رکعت نماز تحیۃ المسجد پڑھیں، وقتی نماز کا وقت ہو یا کوئی اور وقت ہو، البتہ اوقاتِ مکروہہ میں سے کوئی وقت نہ ہو جیسے آفتاب کے طلوع وغروب کا وقت یا زوال کا، حضرت کعب ابن مالک رض سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا دخل احدکم المسجد	تم میں کا کوئی مسجد میں جب داخل
فلیرکع رکعتین قبل ان یجلس۔	ہو تو اس کو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت
(بخاری)	نماز پڑھنی چاہیئے۔

مگر یہ تحیۃ المسجد کی نماز وقتی نمازوں میں صرف ظہر، عشاء اور عصر میں پڑھی جائے گی، بقیہ دو نمازوں فجر ومغرب میں تو اس سے پرہیز کیا جائے گا۔ اس لئے کہ ان وقتوں میں کوئی نفل نماز پہلے جائز نہیں ہے، مغرب سے پہلے تو گنجائش ہی نہیں۔ باقی فجر تو اس وقت پہلے صرف دو رکعت سنت ہیں۔

مسجد پہنچ کر کوئی بیٹھ جائے اور اس کے بعد تحیۃ المسجد پڑھنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے مگر اولویت کے خلاف ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی صراحت فرمائی ہے (۱)

فرض وسنت کوئی پہنچتے ہی شروع کردے تو کیا اس کے ذمہ سے تحیۃ المسجد کی نماز ساقط ہو جائے گی؟ جواب یہ ہے کہ ہاں یہ شکل بھی جائز ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

---

(۱) فتح الباری ۱/۳۶۱۔

چوں در مسجد داخل شود اگر ادائے فرض و سنت است فیہا والّا دو رکعت تحیۃ المسجد ادا نماید اگر فرض وسنت و نفل دیگر ادا نمود تحیۃ المسجد از و ساقط گشت ۔ (فتح العزیز پارہ اول ص۲۴۲)	مسجد میں داخل ہوتے اگر فوراً ادائے فرض وسنت ہے تب تو خیر ورنہ پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے اور بجائے تحیۃ المسجد فرض، سنت اور دوسری نماز پڑھ لی تو اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گی ۔

اگر کوئی اوقاتِ مکروہہ میں یا صبح ومغرب میں تحیۃ المسجد کی تلافی کرنا چاہے تو اس کو چاہیئے کہ قبلہ رو بیٹھ کر ایک ساعت ذکر و تسبیح و تہلیل میں گذارے (۱) یوں تو ابن عابدین نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے دن بھر میں ایک مرتبہ بھی تحیۃ المسجد پڑھ لی تو کافی ہے (۲) مگر اوپر جو حدیث نقل کی گئی اس کے لب ولہجہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہر وقت موقع ہو تو تحیۃ المسجد کی نماز پڑھنی چاہیئے ۔

تحیۃ المسجد سلام پر مقدم ہے

شرح سفر السعادت میں حضرت شیخ رح نے لکھا ہے کہ پہلے تحیۃ المسجد کی نماز ادا کرے، پھر حاضرین کو سلام کرے "تحیۃ المسجد" مسجد کو سلام کرنے کے حکم میں ہے جو حق اللہ ہے اور اس موقع پر حق اللہ کو حق العباد پر تقدیم حاصل ہے (۳) حافظ ابن قیم رح نے بھی اسی کو لکھا ہے، فرماتے ہیں :۔

ومن ھدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الداخل فی المسجد یبتدأ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے یہ ہے کہ مسجد میں جو داخل ہو وہ پہلے دو رکعت

---

(۱) فتح العزیز پارہ اول ص۲۴۲ (۲) ردالمحتار ۱/۶۱۴۔

(۳) شرح سفر السعادت ۲۰۵/۶۔

برکعتین تحیۃ المسجد ثم یجیئ فیسلم علی القوم فتکون تحیۃ المسجد قبل تحیۃ اھلہ[1]

تحیۃ المسجد ادا کرے پھر وہ قوم کو آکر سلام کرے، پس معلوم ہوا کہ تحیۃ المسجد سلام سے پہلے ہے۔

انہوں نے ثابت کیا ہے کہ صحابۂ کرام کا دستور آپ کے ساتھ ایسا ہی تھا۔

دربارِ الٰہی میں دنیا کے کام

باطمینان بیٹھے

مسجد میں جہاں باطمینان جگہ مل جائے بیٹھ جائے، نہ نمازیوں کی گردن پھاندی جائے نہ جگہ کے لئے شور و ہنگامہ کیا جائے، نہ صف میں گھس کر جہاں جگہ نہ ہو مصلّی کو تکلیف دینے کی کوشش کی جائے نہ نماز پڑھنے والوں کے آگے سے گذرنے کی جرآت کی جائے، نہ انگلی وغیرہ چٹخائی جائے کہ ان کی ممانعت آئی ہے۔ ہر ایسی حرکت سے جو خلافِ ادب اور شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے اجتناب کیا جائے، موقع ہو تو ذکر و شغل اور نوافل میں وقت گذارے ورنہ خاموش باادب بیٹھا رہے[2]۔

یہ مسجد میں آنے کے وہ آداب ہیں جن کا عمل میں لانا ازبس ضروری ہے پھر یہ کہ میں نے وہی آداب بیان کئے ہیں جو رات دن پیش آتے

---

(۱) زاد المعاد ۲/۲۴۔

(۲) عالمگیری ۲۱۵/۶۔

ہیں اور ان کا برتنا ہر ایک پر لازم ہے، بقیہ وہ آداب جن کو شریعت نے اس سلسلہ میں بیان کیا ہے اور وہ یہاں ضبطِ تحریر میں نہیں آسکے ہیں ان پر بھی عمل کرنا چاہیئے۔

دنیا کی باتوں سے اجتناب

آدابِ مسجد سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ اس میں دنیا کی باتیں کرنے سے احتراز کیا جائے، وہ باتیں جائز ہوں خواہ ناجائز۔ اس زمانہ میں اس گناہ میں عوام وخواص دونوں ہی کم وبیش مبتلا ہیں۔ اس لئے ذرا تفصیل سے بیان کئے جارہے ہیں۔

یہ اس قدر اہم مسئلہ ہے کہ قرآن پاک نے اپنے معجزانہ پیرایہ میں اسے بیان کیا۔ ارشادِ ربّانی ہے:۔

وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (الجن: ۱۸)	بلاشبہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ہیں، پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔

مفسّرین نے اس آیت کے ضمن میں مسجد میں دنیا کی گفتگو کا مسئلہ کھول کر لکھا ہے اور اس کو واضح کیا ہے کہ یہ گھر اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کی تسبیح و تقدیس اور عبادت کے لئے مخصوص ہے۔ صاحبِ جمل لکھتے ہیں:۔

المعنی افردوا المساجد بذکر اللّٰه ولا تجعلوا لغیر اللّٰه فیها نصیباً۔ (ج ۴ ص: ۴۲۲)	معنیٰ یہ ہے کہ مسجدوں کو اللہ تعالیٰ کی یاد کے لئے مخصوص کرلو اور غیر کے لئے اس میں کوئی حصّہ نہ بناؤ۔

اس سے واضح تر عبارت "تفسراتِ احمدی" کی ہے:۔

الا انها علی ظاهرها ممّا	اس آیت کے ظاہر سے استدلال کیا گیا

یستدل بہ علیٰ انہ لایجوز التکلم فی المسجد بکلام الدنیا۔ ص۵۹۵ | ہے کہ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا جائز نہیں ہے۔

قرآنِ پاک میں ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْہَا اسْمُہٗ۔ (النّور: ۳۵) | ان گھروں میں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان کی تعظیم کی جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے۔

اس آیت میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسجدوں میں صرف ذکر اللہ ہی کی قسم کی چیزیں ہونی چاہئیں، کیوں کہ یہاں "بُیوتٍ" سے مساجد مُراد ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ ان کی قدر و منزلت بھی اسی میں ہے کہ دنیاوی باتوں سے پرہیز کیا جائے، وہاں پہنچ کر دھیان سب سے کٹ کر اللہ تعالیٰ پر ہو۔ اس آیت کے ضمن میں ابو بکر جصّاص تحریر فرماتے ہیں :

ھٰذا یدل علیٰ انہ یجب تنزیھھا من المقعود لامور الدنیا مثل البیع والشراء وعمل الصناعات ولغو الحدیث الذی لافائدۃ فیہ والسفہ وماجریٰ مجریٰ ذٰلک۔ (احکام القرآن ۳/۴۰۴) | یہ آیت بتاتی ہے کہ مسجدوں کو دنیاوی کاموں سے پاک وصاف رکھنا واجب ہے جیسے خرید و فروخت، دستکاری اور ایسی باتیں کرنا جو بے فائدہ ہیں اور اسی طرح نادانی وغیرہ کی باتیں کرنا۔

٭ ٭ ٭ ٭

رحمتِ عالم صلعم کی پیشین گوئی اور اُمّت کو ہدایت

میں نے یہ اس لئے نقل کیا تاکہ اصل مسئلہ کھل کر اہلِ علم کے

سامنے آجائے اور ان کو کوئی اشکال پیدا نہ ہوسکے، ورنہ سب کو معلوم ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کا کیا احترام تھا اور آپؐ کے خلفاء واصحاب نے اس احترام کو کیسے نباہا، حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں ایسی باتوں کا عوام مسلمانوں کو وہم وگمان بھی نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پیشین گوئی کے طور پر فرمایا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ دنیا کی باتیں مسجدوں میں ہونے لگیں گی پھر آپؐ نے تاکیداً فرمایا تھا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے ارشاد فرمایا تھا:-

فلا تجالسوهم فليس لله فيهم حاجة۔	ان لوگوں میں (جو مسجدوں میں دنیا کی باتیں کریں) مت بیٹھنا، کیونکہ ان کی
(مشکوٰۃ ۱/۷۱)	اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں۔

گویا دنیا کی باتیں خانۂ خدا میں اس قدر مبغوض ہیں کہ اس بڑے خطرہ کی آپؐ نے اپنی اُمت کو سیکڑوں سال پہلے اطلاع دی اور پھر تاکید فرمادی کہ اس گناہ کے کام سے بچنا اور ہرگز اس کی جرأت نہ کرنا۔

فقیہ ابواللیث نے بھی حضرت علیؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ اسلام کا بجز نام کے اور قرآن کا سوائے نشان کے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔ ان کی مسجدیں بنی تو ہوں گی لیکن ذکر اللہ سے ویران ہونگی (۱)

ان روایتوں کو پڑھ کر ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کیا عجب جس زمانہ کی

---

(۱) تنبیہ الغافلین ص۱۸۱۔

یہ پیشین گوئی کی گئی تھی وہ ہمارا یہی زمانہ ہو۔ اس لئے ارباب علم و دانش خوب غور کرلیں اور عوام مسلمان اپنے اعمال پر گہری نظر ڈالیں۔

کون نہیں جانتا کہ مسجد دربار الٰہی اور جلوہ گاہِ رحمت ہے پھر ایسے مقدس اور پُرجلال دربار میں دنیا کی باتیں جتنی نامناسب و نازیبا، عقل و خرد سے بعید اور مذموم ہوسکتی ہیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

جہاں مساجد کے فضائل بیان کئے گئے ہیں وہاں جو حدیثیں گذر چکی ہیں ان میں اس محترم و مقدس گھر کی وقعت کا ذکر ہے، خاص طور پر یہ جملے قابلِ غور ہیں:

"احب البلاد الی اللہ مساجد ھا وابغض البلاد اسواقھا۔ خیر البقاع مساجد ھا وشر البقاع اسواقھا"

جن کا ماحصل یہ ہے کہ روئے زمین پر وہ جگہ جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب سے پیاری اور سب سے بہتر ہے وہ وہی گھر ہے جس کو ہم "مسجد" کے مختصر لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں بازار کو سب سے بری جگہ قرار دیا گیا ہے۔ آخر بات کیا ہے؟ یہی نہ کہ بازار دنیاوی دھندوں کے اڈے ہوتے ہیں جہاں دنیا اپنی بساط بچھائے رونق افروز رہتی ہے اور شور و غل، ہوہڑپ اور ہنگامہ اس کا لازمہ ہے۔

غور کیجئے جب اسی مبغوض ترین جگہ کے لوازم اس محترم و مقدس دربار میں کئے جائیں گے جو عنداللہ محبوب ترین ہے تو یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مسجد میں سیاسی تقریریں

ہمارے زمانہ میں سیاسی تقریروں کا رواج مسجد میں عام ہوتا جارہا ہے اور وہ بھی آدابِ مسجد کا لحاظ نہ کرتے ہوئے، یہ چیز بھی پسندیدہ نہیں ہے، ایسی غیر ذمہ داری کی باتیں جو کہیں بھی کہنی جائز نہیں ہیں، ان کا مسجد میں کہنا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے؟ حدیث میں ہے کہ مسجدوں کو بچوں، جھگڑوں، بلند آوازی، اجرائے حدود اور تلوار کھینچنے سے بچاؤ (۱) اور آج کل مسجدوں میں جو سیاسی جلسے ہوتے ہیں ان میں تقریباً یہ تمام چیزیں کم و بیش پائی جاتی ہیں اور ان سے بڑھ کر "آزارِ مسلم" جزو تقریر ہے جس سے اجتناب ضروری ہے المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔

دینی باتیں اگر مسجد میں کہی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ بڑی حد تک یہ اغراض و مقاصد مسجد میں داخل ہیں۔ یا ایسی سیاسی باتیں جن کا دین سے لگاؤ ہو مسلمانوں سے کہی جاسکتی ہیں کہ عہدِ نبوی میں مسجد نبوی ان باتوں کا مرکز رہ چکی ہے مگر آداب واحترام واکرام بہر حال ضروری ہے۔

مسجد میں بلند آوازی

ابھی ابن ماجہ والی حدیث میں یہ بات گذری کہ مسجد میں بلند آوازی نہ ہونے پائے، صحابۂ کرام کا عمل اس باب میں جیسا رہا وہ مشعلِ راہ

---

(۱) ابن ماجہ باب مایکرہ فی المساجد۔

بنایا جاسکتا ہے کہ وہ دربارِ نبویؐ کے حلقہ بگوش تھے، حضرت سائب بن یزیدؓ بیان کرتے ہیں، میں ایک دن مسجد میں سویا ہوا تھا، کنکری مار کر کسی نے جگا دیا، دیکھا تو فاروقِ اعظمؓ تھے، آپ نے دو شخصوں کی طرف اشارہ کیا وہ مسجد میں شور وغل کر رہے تھے اور فرمایا ان کو پکڑ لاؤ۔ میں نے حسب الحکم ان دونوں کو ان کی خدمت میں لے جا کر حاضر کر دیا آپ نے ان سے پوچھا، کہاں رہتے ہو؟ ان لوگوں نے طائف کا نام لیا، یہ سن کر آپ نے فرمایا، اگر تم مدینہ منورہ کے ہوتے تو سزا دیتا، تم مسجدِ رسولؐ میں شور وغل کرتے ہو، جاؤ آج صرف اس وجہ سے معاف کیا جاتا ہے کہ باہر کے رہنے والے ہو (۱)

حضرت عمرؓ اس معاملہ میں بہت سخت تھے، مسجد کی معمولی بے حرمتی بھی کبھی برداشت نہیں کرتے تھے، چنانچہ لڑکوں کو بھی مسجد میں کھیلتے دیکھتے تو دُرّہ سے خبر لیتے اور عشاء بعد بھی مسجد کی پوری خبر گیری رکھتے۔ نسائی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے کسی کی بلند آوازی سن لی، اس پر آپ نے تیز ہو کر فرمایا، تم کو معلوم ہے کہ کہاں ہو؟ (۲)

فاروقِ اعظمؓ کا اہتمام

فاروق اعظمؓ نے انہی وجوہ کی بناء پر مسجد کے ایک کنارے ایک چبوترہ بنوا دیا تھا جس کا نام حدیث میں بطیحا آتا ہے اور اس کے بنوانے کے بعد اعلان کر دیا کہ جس کو شعر پڑھنا ہو یا اور کوئی ایسی بات کرنی ہو تو

---

(۱) بخاری ۱/۶۷۔

(۲) تفسیر ابن کثیر ۳/۲۹۳۔

مسجد سے نکل کر وہاں چلا جائے (۱) مسجد میں اس طرح کی کوئی بات نہ ہونے پائے۔

اس باب میں اختلاف ہے کہ بلند آوازی مطلقاً حرام ہے، یا مقیّد طور پر؟ اکثریت کی رائے تفصیلی ہے کہ اگر دینی و دنیوی ضرورت ہو جس میں مسلمانوں کا مفاد ہے تو جائز ہے ورنہ ناجائز۔ جواز کی دلیل میں کعب بن مالکؓ کی حدیث پیش کی جاتی ہے جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے ابن حدادؓ سے اپنے قرض کا مطالبہ کیا اور یہ مطالبہ مسجد میں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بلند آوازی کو سنا اور آپ نے اپنے حجرۂ مبارکہ کا پردہ اُٹھا کر صرف یہ اشارہ فرمایا کہ نصف معاف کردو۔ اور ابن حدادؓ سے فرمایا کہ ادا کردو۔ باقی ان دونوں کی بلند آوازی پر کوئی تنبیہ نہ فرمائی (۲)

گم شدہ کی تلاش

گمشدہ چیز کی تلاش بھی مسجد میں جائز نہیں ہے کہ یہ بھی مسجد کے احترام کے خلاف ہے کیوں کہ اس میں شور و ہنگامہ ناگزیر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من سمع رجلاً ینشد ضالة	جو کسی شخص کو سنے کہ وہ مسجد میں گم شدہ
فی المسجد فلیقل لا ردھا	کی تلاش کرتا ہے تو چاہیئے کہ کہے،
الله علیك فان المساجد	اللہ تعالیٰ اس کو تجھ پر نہ لوٹائے کیونکہ

---

(۱) مشکوٰۃ عن المؤطا، باب المساجد۔

(۲) فتح الباری ۱/ ۳۷۵۔

لم تبن لهذا (۱) — مسجد اس کام کیلئے نہیں بنائی گئی ہے۔

اس حدیث میں صرف گم شدہ چیز کی تلاش سے روکا ہی نہیں گیا ہے بلکہ اس میں اس پر زجر و توبیخ بھی موجود ہے اور ساتھ ہی اس کی علّت بھی بیان کر دی گئی ہے۔ اس زمانہ میں خصوصیّت سے اس حدیث پر عمل کرنا چاہیئے اور اس حدیث کا مفہوم عام مسلمانوں کے ذہن نشین ہونا چاہیئے، ہاں اس وقت کوئی حرج سمجھ میں نہیں آتا کہ جب چیز مسجد ہی میں گم ہو جائے تو آداب مسجد کا لحاظ کرتے ہوئے تلاش کی جائے، باقی جو چیز مسجد سے باہر کہیں اور کھو گئی ہے اس کی جستجو اِن مساجد کے ذریعہ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب کسی کو مسجد میں گم شدہ چیز تلاش کرتے دیکھو تو کہو:۔

لا وجدت انما بنیت المساجد لما بنیت۔ (مسلم ۱/۲۱۰) — وہ تجھ کو نہ ملے، مسجد جس کام کے لئے بنائی گئی ہے اسی کے لئے ہے۔

صنعت و حرفت

اس حدیث کے ضمن میں امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ مسجد میں دستکاری، صنعت و حرفت اور اس طرح کا کوئی دوسرا کام درست نہیں ہے کہ ان کاموں کا تعلق انسان کی ذات سے ہے۔ اس وقت البتہ اجازت ہے کہ یہ چیز عام مسلمانوں کے مفاد کی ہو، جیسے آلاتِ جہاد کی مرمّت وغیرہ (۲)

---

(۱) مسلم، باب النہی عن نشد الضالۃ الخ ۱/۲۱۰۔
(۲) شرح مسلم نووی ۱/۲۱۰۔

غزل خوانی احترامِ مسجد ہی سے یہ بھی ہے کہ اس میں اشعار غزل کی طرح کے نہ پڑھے جائیں، بوقتِ ضرورت حمد و نعت کی اجازت ہے یا ایسے اشعار جن کا تعلق اسلام کی حقانیت وصداقت سے ہو جائز ہے، مگر یہ سب بھی اسی وقت جب اس سے مسجد کے بنیادی کام میں حرج نہ ہو۔ حدیث میں ہے:۔

نہیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تناشد الاشعار فی المسجد وعن البیع والاشتراء (۱)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں اشعار پڑھنے اور خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے۔

معلوم ہوا مسجد میں بیع و شراء کی بھی اجازت نہیں ہے، وجہ کھلی ہوئی ہے کہ یہ ساری چیزیں مسجد کے مقصودِ اصلی سے خارج ہیں بلکہ ان میں بعض اوقات مسجد کی توہین اور بے ادبی کا اندیشہ ہے۔

بچوں اور پاگل وغیرہ سے اجتناب

مسجد میں ناسمجھ اور بے عقل کے آنے کی بھی اجازت نہیں، چاہے وہ بچّہ ہو جس کو کوئی شعور نہ ہو، یا کوئی پاگل مخبوط الحواس ہو کہ دونوں ہی احترامِ مسجد کو نہیں سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسی بات کر بیٹھیں جو آدابِ مسجد کے خلاف ہو، فقہاء نے لکھا ہے کہ ان کے داخل ہونے میں تلویثِ مسجد کا گمان غالب ہو تو حرام ہے ورنہ مکروہ تنزیہی۔ پھر چوں کہ ان کو عقل نہیں ہے اس لئے ان کو روکنے کا حکم ان کو دیا گیا ہے جو عقل والے ہیں، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:۔

جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وشرائکم وبیعکم	اپنی مسجدوں کی حفاظت کرو، اپنے بچّوں سے، پاگلوں سے، خرید و فروخت

---

(۱) مشکوٰۃ عن ابی داؤد وغیرہ، باب المساجد۔

وخصوماتکم ورفع اصواتکم	سے، جھگڑوں سے، شوروغل سے، اقامتِ
واقامة حدودکم وسلّ سیوفکم[1]	حدود سے اور تلوار کے کھینچنے سے۔

حدود کا اجراء

مذکورہ حدیث سے حدود کا اجراء بھی مسجد میں ناجائز ثابت ہوا، اس کی ممانعت بھی ظاہر ہے کہ تلویثِ مسجد کا خطرہ ہے اور شوروہنگامہ کا یقین، اور یہ دونوں آدابِ مسجد کے خلاف ہیں۔ ابن ماجہ شریف میں مستقل باب ہے "باب النھی عن اقامۃ الحدود فی المسجد" اور اس باب میں دو حدیثیں اس مفہوم کی آنحضرتؐ سے نقل کی گئی ہیں، الفاظ یہ ہیں:

لاتقام الحدود فی المساجد[2]	مسجدوں میں حدود قائم نہ کئے جائیں،
نھٰی عن جلد الحد فی المساجد	آنحضرت صلعم نے مسجد میں حد کے کوڑے
(ج ۱ صـ۱۹)	لگانے سے منع فرمایا ہے۔

خصومت اور جنگ

مسجد میں خصومت اور جھگڑا وغیرہ بھی ممنوع ہے۔ یہ دونوں چیزیں یوں ہی ناجائز ہیں مگر مسجد میں ان کی قباحت بڑھ جاتی ہے۔

مسجد میں کھلا ہتھیار تک لے کر چلنے کی اجازت نہیں، کیوں کہ لوگوں کو گزند پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اسی طرح ہتھیار وغیرہ مسجد میں تیز کرنا بھی ادب کے خلاف ہے، مسجد کو راستہ بھی نہ بنانا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

---

(۱) ابن ماجہ باب مایکرہ فی المساجد۔ (۲) ج ۱ صـ۱۹۔

خصال لاتبغی فی المسجد لا یتخذ طریقا ولا یشہر فیہ سلاح ولا یقبض فیہ بقوس ولا ینشر فیہ نبل ولا یمر فیہ بلحمٍ نیّ ولا یضرب فیہ حد ولا یقتص فیہ من احد ولا یتخذ سوقاً (ابن ماجہ باب مایکرہ فی المساجد)

چند چیزیں مسجدوں میں کرنے کی نہیں ہیں، اس کو نہ راستہ بنایا جائے نہ اس میں ہتھیار تیز کئے جائیں، نہ کمان پکڑی جائے، نہ تیر پھیلائے جائیں، نہ کچا گوشت لے کر گزرا جائے، نہ حد ماری جائے، نہ قصاص لیا جائے اور نہ اسے بازار بنایا جائے۔

نمازِ جنازہ

مسجد کا احترام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اس میں جنازہ کی نماز پڑھی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ جو شخص مسجد میں جنازہ کی نماز پڑھے گا اس کو کچھ نہ ملے گا، آپؐ خود بھی جنازہ کی نماز مسجد میں نہیں پڑھتے تھے۔

وان سنتہ وھدیہ الصلاۃ علی الجنازۃ خارج المسجد الا لعذر وکلا الامرین جائز والافضل الصلاۃ علیہا خارج المسجد۔ (زاد المعاد ۱/۱۴۴)

آپؐ کی سنت اور آپؐ کا دستور مسجد سے باہر نماز جنازہ پڑھنے کا تھا مگر کسی عذر کے وقت اور جائز دونوں ہی ہیں مگر افضل جنازہ کی نماز مسجد سے باہر ہی ہے۔

اسی وجہ سے اہلِ علم نے مسجد کے اندر جنازہ کی نماز کو مکروہ تنزیہی لکھا ہے (۱)

---

(۱) شرح سفر السعادۃ ص۲۵۶۔

نمازی کے آگے سے گذرنا

اس کی بھی سخت ممانعت ہے کہ کوئی (مصلّی) نمازی کے آگے سے گذرے، آپؐ نے فرمایا کہ اگر نمازی کے آگے سے گذرنے کا گناہ معلوم ہو جائے تو چالیس برس تک کھڑا رہنا پسند ہو مگر گذرنے کی جرأت کبھی نہ ہو، آپؐ نے نمازی کو مدافعت کی وسعت بھر اجازت دی ہے اور حدیث میں نمازی کے آگے سے گذرنے والے کو شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے اس کی شناعت کا معمولی سا اندازہ ہو سکتا ہے۔ علماء نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی نمازی نے اپنے آگے سے گذرنے والے کی غیر مہلک چیز سے مدافعت کی اور وہ ہلاک ہو گیا تو بالاتفاق اس پر قصاص نہیں آئے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ نمازی کو بھی احتیاط کرنا ضروری ہے (۱)۔

عورتوں کا مسجد آنا

بلاشبہ ابتدائے اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مسجد آنے جانے کی اجازت دی تھی اور یہ عہدِ نبوی میں با جماعت مسجد میں نماز بھی پڑھتی تھیں، عیدین کے موقع پر ان کو عیدگاہ کی طرف نکلنے کا حکم بھی ہوا تھا، اور وہ بھی اس عمومیت سے کہ پاک و ناپاک کسی کو رکاوٹ نہ تھی، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے اظہارِ شوکت شاید مقصود تھا تاکہ مسلمانوں کی تعداد کا مظاہرہ ہو، مگر وہ علّت اب باقی نہیں ہے پھر آپ ساری حدیثوں کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ عورتوں کو مسجد میں آنے کی

---

(۱) یہ تفصیل نووی شرح مسلم ۱/۱۹۶، ۱۹۷ سے ماخوذ ہے۔

اجازت کس عنوان سے تھی، جگہ جگہ محسوس ہوگا کہ آپ نے ترغیب اس کی بھی دی ہے کہ ان کا نہ نکلنا ہی بہتر ہے۔ پھر یہ بھی آپ حدیثوں میں پائیں گے کہ عورتوں کو اجازت عشاء اور فجر میں تھی جو تاریکی کے وقت ہیں، اجازت کے ساتھ یہ بھی اعلان تھا:۔

صلوٰۃ المرأۃ فی بیتھا افضل	عورت کی نماز اندر گھر میں اسکی دالان
من صلوٰتھا فی حجرتھا وصلوٰتھا	کی نماز سے بہتر ہے اور اس کے مخدع
فی مخدعھا افضل من صلوٰتھا	(گھر در گھر) کی نماز افضل ہے اندر گھر کی
فی بیتھا۔ (۱)	نماز سے۔

اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی وہی نماز بہتر ہے جو زیادہ سے زیادہ پردہ میں ہو، یہ دوسری بات ہے کہ عورتیں افضل کو ترک کردیں اور غیر افضل پر عمل کریں جو گو بہتر نہیں ہے مگر چوں کہ مسجد خانۂ خدا ہے اور وہ اس دربارِ الٰہی میں عبادت کی نیت سے آرہی ہیں اس لئے ان کو روکا کیوں کر جائے۔ اسی وجہ سے فرمایا گیا:۔

لاتمنعوا نساءکم المساجد و	اپنی عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو،
بیوتھن خیر لھن۔	البتہ ان کا اندرونِ گھر میں ہی نماز
(ابوداؤد باب خروج النساء)	پڑھنا ان کے لئے بہتر ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا کہا جاتا، مسئلہ تو بالکل کھل گیا کہ گو ان کو روکا نہیں جا سکتا، مگر ان کے حق میں خیر یہی ہے کہ گھر میں نماز پڑھیں۔ عقلی طور پر بھی یہ بات سمجھی جا سکتی ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ مہینے میں چند دن عورتوں پر ایسے گذرتے ہیں جن میں ان کو نماز کی اجازت نہیں۔

---

(۱) ابوداؤد باب خروج النساء الی المسجد۔

لہذا ان دنوں میں یہ مسجد کی حاضری سے معذور ہیں اور یہ دن ان کے لئے راز کے دن ہوتے ہیں۔ کوئی شریف عورت اس راز کے افشاء کو پسند نہیں کرتی اور مسجد کی حاضری میں اس راز کا کھل جانا ضروری ہے مزید یہ بھی تو ہے کہ ان کو گو مسجد کی اجازت دی ہے لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگادی گئی ہے کہ بے زینت ہو کر نکلیں۔

فاذا شھدت احدٰکن المسجد	تم عورتوں میں جب کوئی مسجد میں
فلاتمس طیباً۔ (مسلم ۱/۱۸۳)	حاضری دے تو خوشبو نہ چھوئے۔
فلاتطیب تلك اللیلة۔ (۱)	اس رات میں خوشبو نہ لگائے۔
ولکن لیخرجن وھن تفلات۔	اور لیکن وہ عورتیں نکلیں تو بے زینت
(ابوداؤد باب خروج النسا الی المسجد)	ہو کر نکلیں۔

ان قیود و شرائط کے ساتھ اجازت ہونا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نکلنے میں فتنہ کا اندیشہ ہے اور یہی چیز تھی کہ آپؐ کے فوراً بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس فتنہ کو محسوس فرمایا اور ان کو کہنا پڑا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر عورتوں کی اس جدّت کو دیکھتے تو ان کو مسجد آنے سے روک دیتے۔

لوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ	جو چیز عورتوں میں پیدا ہو گئی ہے اسے
وسلم رأیٰ ما احدث النساء	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے تو
لمنعھن المسجد کما منعت نساء	یقیناً بنی اسرائیل کی عورتوں کی طرح
بنی اسرائیل۔ (مسلم ۱/۱۸۳)	آپؐ ان کو مسجد سے روک دیتے۔

یہ حضرت صدّیقہؓ آپؐ کی ازواجِ مطہرات میں سے ہیں، ان کا یہ

---

(۱) مسلم ۱/۱۸۳۔

کہنا دلیل ہے کہ عہد نبویؐ کے فوراً بعد انقلابِ عظیم عورتوں میں پیدا ہونے لگا اور عہدِ صحابہ میں ان کی روک تھام ضروری سمجھی گئی، فقہاء اسی طرح کی حدیثوں کے پیشِ نظر کہتے ہیں کہ عورتوں اور خصوصاً جوان عورتوں کو مسجد نہ جانا چاہیئے۔ باقی اجازت والی حدیث تو اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ یہ اجازت تو ہے ضرور مگر حکیمانہ انداز میں۔

اذا استأذنت احدکم امرأته الی المسجد فلا یمنعها۔ (مسلم ۱/۱۸۳)

تم میں سے کسی کی عورت مسجد جانے کی اجازت طلب کرے تو اس کو منع نہ کرو۔

حدیث میں جہاں بھی ان کو مسجد کی اجازت ملی ہے اسی انداز میں، یہ کہیں نہیں ہے کہ ان کو بھی مسجد کی حاضری کے لئے مجبور کرو، بلکہ عموماً اجازت دی ہے تو اسی طرح کہ جب وہ تقاضا کریں تو ان کو نہ روکا جائے۔ چوں کہ یہ حق ایک شرعی حق بن جاتا ہے اس لئے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبردستی ان کو روکنا نہیں چاہا، مگر اپنے حکیمانہ انداز میں ان کو مشورہ یہی دیا ہے کہ نہ نکلیں تو اچھا ہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے۔ اجازت کی حدیث کو سامنے رکھ کر جن علماء نے ان کو اجازت دی ہے انہوں نے بھی متعدد قیدیں لگادی ہیں اور جن کا لگانا ضروری بھی ہے۔ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:۔

"عورتوں کو مسجد سے روکا نہ جائے گا بشرطیکہ وہ ان قیود و شرائط کی پوری پوری پابندی کریں جو احادیث ہی سے ماخوذ ہیں، مثلاً کپڑوں میں خوشبو نہ لگائیں، بن سنور کر نہ نکلیں، ایسی پازیب جس سے آواز پیدا ہو نہ پہنیں۔ مردوں سے اختلاط نہ ہونے پائے، جوان یا ایسی نہ ہوں جس

سے کسی طرح کے فتنہ کا اندیشہ ہو اور ہر طرح کے مفسدہ سے بے خوف ہوں[1]"

اس سلسلہ میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کی رائے بھی قابلِ ذکر ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"جماعت کے لئے عورتوں کا مسجد آنا اس زمانہ میں مکروہ ہے، کیونکہ فساد و فتنہ کا خطرہ ہے، عہدِ نبویؐ میں نکلنے کی اجازت شریعت کی تعلیم کے حصول کی غرض سے تھی جو غرض اَب باقی نہیں ہے۔ اس لئے کہ احکامِ شریعت آج کل عام طور پر شائع ہیں اور عورتوں کا پردہ بہر حال اولیٰ ہی ہے"(۲)

فصل مقدمات

اس سلسلہ میں ان چیزوں کا بھی تذکرہ کرنا ہے جن کا مسجد میں کرنا جائز ہے، ان میں سے ایک تنازع بین المسلمین کا فیصلہ ہے، شریعت نے مسجد میں مسلمانوں کے باہمی نزاع کے فیصلہ کرنے کی اجازت دی ہے اسی طرح اس کی بھی اجازت ہے کہ کوئی مسئلہ پوچھے تو اس کا جواب دیا جائے، صرف شرط یہ ہے کہ اس سے نمازیوں کا نقصان نہ ہو، اور احترام مسجد کا پورا پورا لحاظ رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں مسجد میں فیصلہ فرمایا ہے۔ استفتاء کا آپؐ نے جواب بھی دیا ہے حتی کہ دینی یا وہ دنیوی امور جن کا تعلق مفادِ عامہ سے ہے، ان کے لئے مسجد میں مجلسِ شوریٰ بلائی ہے اور اپنی مجلس میں برابر احکام بیان کئے ہیں، اُنہی امور کو سامنے رکھ کر فقہاء نے لکھا ہے :۔

---

[1] شرح مسلم نووی ۱/۱۸۳۔

(۲) اشعۃ اللمعات قلمی ۱/۴۸۲۔

القضاء عبادة فيجوز اقامتها	قضاء عبادت ہے لہٰذا یہ مسجد میں
فی المسجد کالصّلوٰۃ (ہدایہ)	جائز ہے۔ جیسے نماز۔

مسلم شریف کی یہ حدیث گذر چکی ہے کہ مسجد ذکر اللہ، نماز اور تلاوتِ قرآن پاک کے لئے ہے۔

طبرانی نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن جمعہ کا خطبہ فرما رہے تھے کہ ایک شخص لوگوں کی گردن پھاندتا آیا اور کہنے لگا یا حضرت! مجھ پر حد جاری فرمائیے، آپؐ نے اطمینان سے بیٹھنے کا حکم فرمایا، وہ بیٹھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا، تیری کیا حد ہے؟ اس نے کہا، پرائی عورت سے روسیاہی کی ہے۔ آپؐ نے یہ سن کر صحابۂ کرامؓ کو حکم دیا، لے چلو اور کوڑے لگاؤ، آپؐ کے بعد اس سلسلہ میں خلفاءِ راشدین کا بھی یہی عمل رہا، بخاری میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے منبر رسولؐ کے پاس لعان کرایا، اور بقول ابو بکر رازیؒ حضرت عثمان غنیؓ نے بھی مسجد میں مقدمات فیصل کئے ہیں۔ ان بزرگوں کے علاوہ ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزمؒ نے اپنے زمانہ میں مسجد میں نزاع کا تصفیہ کیا ہے، سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن ابن عوفؓ سے بھی ثابت ہے کہ انہوں نے مسجد میں مقدمہ فیصل کیا ہے۔ حضرت شُریحؒ بھی مسجد میں فیصلہ کرتے تھے۔ امام شعبیؒ کا عمل بھی یہی تھا۔ یہ تمام واقعات مشہور ہیں مگر کہیں انکار مذکور نہیں ہے، نہ کسی صحابی سے اور نہ کسی تابعی سے (۱)۔

اس میں شک نہیں کہ مقدمات میں یمینِ غموس اور کذب بیانی کی بھی نوبت آتی ہے مگر اس کی وجہ سے کوئی شرعی قباحت پیدا نہیں ہوتی۔

---

(۱) فتح القدیر ۴/۲۵۵۔

عہدِ نبوی میں "لِعان" مسجد میں ثابت ہے۔ اور اس میں فریقین میں سے ایک کا کاذب و حانث ہونا ضروری ہے۔ ہاں فریقین میں کوئی ایسا شخص ہو جس کے لئے مسجد میں داخل ہونا جائز نہ ہو، مثلاً حائضہ عورت تو اس کا مقدمہ مسجد سے باہر سنا جائے گا (۱)

مجاہدینِ اسلام کی مشق

مسجد میں یہ جائز ہے کہ مجاہدینِ اسلام شمشیر زنی اور نیزہ کی مشق کریں کہ یہ چیزیں اسلام کی خدمت میں داخل ہیں۔ حضرت عائشہ رضی سے روایت ہے کہ مسجد میں حبشی مسلمان نیزہ کی مشق کر رہے تھے۔ میں نے یہ مشق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شانوں کے سہارے دیکھی ہے، طحاوی نے بھی اس کی تائید کی ہے اور اس لہو (کھیل) کو محمود کہا ہے (۲)

دعوت دینا اور قبول کرنا

اُمورِ مباحہ میں سے مسجد میں دعوت دینا اور اس کا قبول کرنا بھی ہے۔ حضرت انس رضی کا واقعہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانے آئے، آپؐ اپنے صحابۂ کرام رضی کے ساتھ مسجد میں جلوہ افروز تھے۔ حضرت انس رضی کہتے ہیں کہ میں قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ آپؐ نے دیکھ کر فرمایا کیا ابو طلحہ رضی نے تم کو بھیجا ہے؟ میں نے کہا، جی ہاں۔ پھر آپؐ نے خود ہی پوچھا، کھانے کے لئے؟ میں نے جواب دیا، ہاں حضرت۔ اس کے بعد آپؐ نے صحابہ رضی

---

(۱) فتح القدیر ۳/۲۵۶۔

(۲) فیض الباری ۲/۵۵۔

سے کہا اور روانہ ہوئے، میں بھی ساتھ ہو گیا (۱)، یہ دلیل ہے کہ مسجد میں یہ کام جائز ہے۔

کھانا تناول کرنا

بوقتِ ضرورت مسجد میں کھانا بھی جائز ہے، مسافر و معتکف کو تو کھلی ہوئی اجازت ہے باقی دوسروں کے لئے بعض ائمہ مکروہ تنزیہی کے قائل ہیں، مگر ابن ماجہ" باب الاکل فی المسجد" میں یہ حدیث موجود ہے:۔

کنا ناکل علیٰ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد الخبز واللحم۔ (ج ۱ ص ۲۴۵)	ہم لوگ عہدِ نبوی میں مسجد میں گوشت روٹی کھاتے تھے۔

جو جواز کے حق میں ہے۔ ایک اور روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے، آپؐ کی خدمت میں گوشت روٹی حاضر کی گئی۔ آپؐ نے تناول فرمائی۔ راوی کہتے ہیں کھانے میں آپؐ کے ساتھ میں بھی تھا، کھانے کے بعد آپؐ نے اور دوسرے لوگوں نے کنکریوں سے ہاتھ صاف کئے اور پھر نماز پڑھی (۲)۔

البتہ مسجد میں کھانے کے لئے یہ شرط ہے کہ مسجد آلودہ نہ ہونے پائے ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ یہ چیز اولیٰ ہے۔

لیٹنا اور سونا

اسی طرح معتکف اور مسافر مسجد میں سو بھی سکتا ہے، بقیہ لوگوں کے

---

(۱) ابن ماجہ۔ (۲) مشکوٰۃ شریف کتاب الاطعمہ۔

لئے ائمہ کی مختلف رائیں ہیں، بعضوں نے مکروہ کہا ہے اور بعض لوگوں نے بوقتِ ضرورت بلاکراہت جائز کہا ہے، ہاں پرہیز وسعت بھر اولیٰ ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ غیر معتکف اور مسافر کو جب ایسی مجبوری پیش آئے تو اعتکاف کی نیّت کرے اور تھوڑی دیر نوافل و ذکر اللہ میں بھی مشغول رہے (۱) حدیث سے مسجد میں سونے کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا جوانی میں مسجد میں سونا ثابت ہے (۲) گویہ درست ہے کہ یہ مہاجرین میں تھے اور مہاجرین کچھ دنوں تنگ حال رہے۔ ممکن ہے عمر فاروقؓ نے اپنے ایثار و خدمت اسلام کی وجہ سے کوئی کشادہ مکان نہ بنایا ہو، حدیث میں یہ صراحت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ اس وقت غیر شادی شدہ تھے۔

بخاری نے ایک باب "باب نوم المرأۃ فی المسجد" بھی قائم کیا ہے، جس سے ان کا مقصد عورت کا مسجد میں سونا ثابت کرنا ہے اور اس باب کے تحت میں ایک قدرے لمبی حدیث نقل کی ہے جس میں ایک عورت کا قصّہ ہے۔ اس کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے:

فکانت لہا خباء فی المسجد او حفش۔ (ج ا ص۶۳) اس عورت کے لئے مسجد میں ایک خیمہ یا خیمہ نما گھر تھا۔

حضرت علیؓ کا واقعہ بھی حدیث میں مذکور ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے یہاں تشریف لائے، حضرت علیؓ غائب تھے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ خفا ہو کر چلے گئے ہیں، آپؐ نے تلاش کروایا تو معلوم ہوا کہ مسجد میں سوئے ہوئے ہیں۔ آپؐ خود مسجد میں تشریف

---

(۱) رد المحتار ۱/۶۱۹ و عالمگیری ۶/۲۱۵۔

(۲) بخاری باب نوم الرجال فی المسجد۔

لائے، دیکھا چادر پہلو سے ہٹی ہوئی ہے اور پہلو گرد آلود ہو رہا ہے، یہ دیکھ کر آپؐ نے شفقت سے گرد جھاڑ دی اور فرمایا "قم ابا تراب، قم ابا تراب[۱] (اے ابو تراب اٹھو، اٹھو) "تراب" عربی میں مٹی کو کہتے ہیں اور "اب" باپ کو۔

مفادِ عامہ سے متعلق چیز

ایسی چیز جو کسی خاص کی ملکیت نہ ہو، بلکہ اس کا تعلق عام مسلمانوں سے ہو، مسجد میں رکھی جاسکتی ہے، اور وہاں بیٹھ کر مسلمانوں میں تقسیم بھی کی جاسکتی ہے۔ مالِ غنیمت، زکوٰۃ، فطرہ اور اسی طرح کی چیزوں کا مسجد میں جمع کرنا جائز ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ مقاصدِ نماز میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں بحرین سے جب مالِ غنیمت آیا تو اس کے متعلق آپؐ نے فرمایا "انثروا فی المسجد" (مسجد میں ڈال دو) پھر آپؐ نے نماز پڑھ کر اسے تقسیم کر ڈالا (۲)۔

ایک دن آپؐ عصائے مبارک لئے ہوئے باہر تشریف لائے، مسجد کے اندر ایک انگور کا خراب خوشہ لٹکتا ہوا نظر آیا جسے غریبوں کیلئے لٹکایا گیا تھا، آپؐ نے عصائے مبارک سے خوشہ کو مارتے ہوئے فرمایا کہ صدقہ دینا ہو تو عمدہ انگور صدقہ دیا کرو (۳) اسی حدیث کے ضمن میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ مسجد میں پینے کا پانی موسمِ گرما وغیرہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

---

(۱) بخاری، باب نوم الرجال فی المسجد۔

(۲) بخاری ۱/۶۰۔ (۳) ایضاً۔

قید کرنا

عہدِ نبویؐ میں مسجد سے جیل خانہ کا بھی کام لیا گیا ہے، بعد میں جاکر اس کے لئے علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا اور بڑھتی ہوئی ضرورت اسکی متقاضی بھی تھی، آپؐ کے زمانہ کا یہ واقعہ حدیث میں مذکور ہے کہ ثمامہ بن اثالؓ گرفتار ہوکر آئے تو ان کو مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا، آپؐ مسجد میں تشریف لائے تو فرمایا ثمامہ کو چھوڑ دو۔ چنانچہ وہ چھوڑ دیئے گئے۔ وہ مسجد سے نکل کر قریب ہی ایک باغ میں گئے، وہاں غسل کیا اور مشرف باسلام ہوئے (۱)

اسلام میں جیل خانہ

مسجد سے یہ کام صدیق اکبرؓ کے عہد تک لیا گیا، فاروقِ اعظمؓ کے دورِ خلافت میں جیل کے لئے چار ہزار دراہم میں ایک مکان خرید ا گیا اور بعض کہتے ہیں باضابطہ اس کی بنیاد حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں پڑی (۲)۔

مشرکین کا دخولِ مسجد

ثمامہ بن اثالؓ کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ مسجد میں کافر کا داخل ہونا جائز ہے اگر مشرک وکافر کا داخلہ مسجد میں ناجائز ہوتا تو یہ واقعہ آپؐ کے سامنے کیونکر ہوتا۔ بلکہ یہ بھی ایک تاریخی بات ہے کہ آپؐ کے عہدِ مبارک

(۱) فتح الباری ۱/۳۴۹۔ (۲) فتح القدیر ۳/۲۶۰۔

میں یہود ونصاریٰ عام طور سے مسجد ہی میں اُترتے اور آپ سے ملاقات کرتے، حافظ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ آپؐ نے وفد ثقیف کو مسجد ہی میں اتارا اور ان کے لیئے خیمہ نصب کیا تاکہ وہ قرآن پاک سُن سکیں، اور مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ سکیں۔ اس واقعہ کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

ومنها جواز انزال المشرك في المسجد (زاد المعاد ۲/۲۵)

اس واقعہ سے مسجد میں کافر ومشرک کا اتارنا جائز ثابت ہوا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اس سے بھی واضح لکھا ہے، فرماتے ہیں:-

"امام اعظمؒ کا قول ہے کہ ہر ایک مسجد میں کافر ومشرک کا دخول جائز ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانۂ سعادت نشان میں مہمانوں کو گو وہ کافر ہوتے، مسجد ہی میں اتارتے جیسا کہ وفدِ ثقیف اور دوسرے وفود کو آپؐ نے مسجد میں ٹھہرایا، تواتر سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ کی ملاقات کو یہود ونصاریٰ اور مشرکین مسجد میں آتے اور بے پروا حاصل کئے بغیر بیٹھتے، اور ثمامہ بن اثال کو حالتِ کفر میں مسجد کے ستون سے بندھوایا گیا تھا، جس کا کوئی نسخ وارد نہیں ہے" (۱)۔

دروازہ بند کرنا

مسجد کے سامان اور اسباب کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو مسجد کا دروازہ بند کرنا جائز ہے۔ فقہاء اور محدثین دونوں اس کے قائل ہیں، مگر نماز کے وقتوں

(۱) تفسیر عزیزی فارسی پارہ اول ص۲۴۳۔

میں دروازہ کھلا رکھا جائے گا تا کہ جماعت کے لئے لوگ بہ آسانی آسکیں۔ جماعت کے علاوہ وقتوں میں بھی دروازہ اس طرح بند کیا جائے کہ خادم ہمیشہ وہاں موجود رہے تا کہ کوئی بعد میں نماز کے لئے آئے تو وہ کھول دے، اور اس طرح نمازی کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو، جہاں اور شعبہ پر صرف کیا جاتا ہے، دروازہ کے کھولنے پر بھی ایک خادم رکھنا چاہیئے۔

چوری کے خوف سے دروازہ بند کرنا بُرا نہیں ہے اور نہ یہ آیت وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ الخ کے تحت میں داخل ہے، کیوں کہ وہاں نماز سے روکنا ہے اور یہ نماز سے روکنے کے لئے نہیں ہے۔

شانِ نزول میں اہلِ روم جو بیت المقدس کے مُخرِب ہیں ان کا نام لیا گیا ہے یا مشرکینِ مکہ کا جنہوں نے آپ کو صلحِ حدیبیہ کے سال بیت اللہ کی زیارت سے روکا تھا، اگرچہ باب احکام میں عام ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اگر مسجد کو بالکلیہ نماز و ذکر اللہ سے نہ روکے تو وہ اس آیت کے تحت میں داخل نہ ہوگا، آیت کی ترکیب بھی اسی کو چاہتی ہے، کیوں کہ "مَنَعَ" فعل متعدی ہے جس کے دو مفعول ہیں "مَسَاجِدَ اللّٰہِ" اور "اَنْ یُّذْکَرَ" جس کے معنی یہ ہوں گے کہ ذکر اللہ مسجد میں روک دیا جائے اور یہ اس وقت ہوگا جب دروازہ بند کر دیا جائے اور لوگوں کو ذکر اللہ کے لئے دخول کی اجازت نہ دی جائے۔ اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ کوئی مسلمان مسجد کا دروازہ اس نیت سے بند نہیں کرتا۔ اپنا ذاتی خیال ہے کہ اگر ایک مسلک کے لوگ دوسرے مسلک والے کو فتنہ و فساد کی وجہ سے مسجد میں نہ آنے دیں اور خود ایک مسلک کے لوگ جماعت سے نماز پڑھیں تو یہ فعل بھی اس آیت کے تحت میں نہ آئے گا، اس لئے کہ ابھی آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ مسجد کو جھگڑے اور فتنہ و فساد سے بچانا چاہیئے۔

دینی تعلیم

جہاں مسجد سے بہت سے کام لینا جائز ہیں وہاں مسجد میں دینی تعلیم بھی جائز ہے، بلکہ یہ وہ سلسلہ ہے جو عہدِ رسالت سے مسجدوں میں قائم ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس مسجد میں علمی مجلس قائم کی ہے صُفّہ جہاں عہدِ نبوی میں دین کی تعلیم ہوتی تھی، یہ مسجدِ نبوی میں تھا۔

مدارسِ اسلامیہ کا سلسلہ اوّل اوّل مسجدوں سے شروع ہوا، اور یہ چوتھی صدی ہجری تک باقی رہا، کتبِ احادیث و تراجم میں متعدد مدرسوں کے نشان ملتے ہیں جو مسجدوں میں قائم تھے، جہاں مدرسین بلامعاوضہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری کئے ہوئے تھے۔ مولانا حکیم عبدالحی صاحبؒ تاریخِ گجرات "یادِ ایام" میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارے پیرومرشد روحی فداہ نے خاک پاک مدینہ میں جو پہلی عمارت بنائی تھی اور جس کو مسجد نبوی کہتے ہیں وہ ہمارا پہلا مدرسہ تھا، اس کے بعد جتنی مسجدیں دنیا میں تیار ہوئیں، انہی کو آپ مدارس سے تعبیر کرسکتے ہیں، تعلیم کا پرانا طریقہ یہ تھا کہ استاذ مسجد میں آکر بیٹھ جاتا اور اس کے گرد و پیش شاگردوں کا حلقہ بن جاتا، اساتذہ خالصاً لوجہ اللہ تعلیم دیتے اور ان کے شاگرد چٹائیوں پر سوکر اور دودِ چراغ کھا کر تحصیلِ علم کرتے تھے۔ بڑے بڑے شاہزادوں کو بھی اگر علم کا ذوق ہوتا تھا تو وہ بھی مسجدوں میں جاکر اور اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرکے بیٹھتے تھے۔ یہی طریقہ چوتھی صدی ہجری تک علی العموم جاری رہا، اس کے بعد

سب سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ کے لئے شاندار عمارت بنائی گئی اور اساتذہ کی تنخواہیں اور طلبہ کے لئے وظائف مقرر ہوئے"(۱)

اس کے بعد مولانا مرحوم نے ہندوستان کی چند مسجدوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے مدرسہ کا کام لیا جاتا تھا، ان میں جونپور میں اٹالہ کی مسجد، لاہور میں وزیر خاں کی مسجد، نئی دلی میں ماہم بیگم کی مسجد، پرانی دہلی میں مسجد فتحپوری اور سورت میں مرجان شامی کی مسجد کا خصوصیت سے نام لیا ہے(۲)۔

مئو (یوپی) میں کٹرہ کی مسجد سے بھی برابر مدرسہ کا کام لیا جاتا رہا ہے اور اب تک وہاں یہ سلسلہ قائم ہے، جو مدرسہ اب مفتاح العلوم کے نام سے مشہور ہے اور الحمد للہ کہ اس خاکسار کو بھی اسی سے شرفِ تلمذ کی نسبت حاصل ہے۔ سیدی علامہ ندوی رحمہ اللہ نے "حیاتِ شبلی" میں اس مسجد اور مدرسہ کا تذکرہ کیا ہے۔

دربارِ الٰہی کی صفائی

انسان طبعاً نفاست پسند واقع ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی وسعت بھر چاہتا ہے کہ وہ خود بھی پاکیزہ رہے، اس کا گھر بھی صاف ستھرا رہے اور اس کی ہر چیز سے نفاست ٹپکے، پھر جو جس مرتبہ کا ہے اس کی صفائی بھی اسی انداز کی ہوتی ہے۔

ان چیزوں کو سامنے رکھ کر یہ مسئلہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ

---

(۱) یادِ ایام ص: ۳۴۔
(۲) ایضاً، ص: ۳۵، ۳۶، ۳۸۔

مسجد جو دربارِ الٰہی اور خانۂ خدا ہے، اس کی صفائی کس قدر ضروری ہے کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جو عنداللہ محترم ہے اور جہاں مسلمان اپنے مولیٰ کی عبادت کے لئے اچھی سے اچھی ہیئت میں جمع ہوتے ہیں اور حاضری کے وقت ان اعضاء کو عموماً دھوکر آتے ہیں جن پر گرد و غبار کے اڑ کر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

صفائی کا ثبوت قرآن سے

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ یہ صفائی بھی ہر چیز کی طرح اعتدال پر ہو اور افراط و تفریط سے پاک ہو، نہ اس قدر اسے بڑھایا جائے کہ حدِ تزخرف کو پہنچ جائے اور نہ ایسی بے توجہی برتی جائے کہ گرد و غبار سے اَٹ جائے، اس اعتدال پر رہ کر اس کی پاکیزگی اور نفاست کا خیال ازبس ضروری ہے۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔	ہم نے ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے عہد لیا کہ وہ دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنیوالوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک و صاف رکھیں۔
(البقرۃ: ۱۲۵)	

یہ آیت شانِ نزول میں گو خاص ہے مگر بابِ احکام میں عام ہے اور مفسّرین نے اسی وجہ سے اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ مسجدوں کو ہر طرح پاک و صاف رکھنا ضروری ہے، ظاہری، باطنی، اعتقادی، معنوی ہر اعتبار سے پاکی کامل ہو، نہ انجاس و اصنام ہوں اور نہ عصیان و

طغیان، پھر غور کیجئے خانۂ خدا کی طہارت اور صفائی کا حکم کن جلیل القدر نبیوں کو ہو رہا ہے جو بیت اللہ اور مسجدوں کی عظمتِ شان کا بہت بڑا مظاہرہ ہے۔ حضرت مریمؑ کی والدۂ ماجدہ نے نذر مانی تھی کہ اگر میرے لڑکا پیدا ہوا تو اسے ایک مسجد (بیت المقدس) کی خدمت کے لئے آزاد کر دوں گی۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے:۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَةُ عِمْرٰنَ رَبِّ	جبکہ عمران کی بیوی نے عرض کیا کہ اے
اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ	میرے پروردگار میں نے نذر مانی ہے آپ
مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّكَ اَنْتَ	کے لئے اس بچّہ کی جو میرے شکم میں ہے
السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ	کہ وہ آزاد کیا جائے گا، سو آپ مجھ سے
(آلِ عمران: ۳۵)	قبول کر لیجئے، بیشک آپ خوب سننے
	والے خوب جاننے والے ہیں۔

امام بخاریؒ نے اس واقعہ اور آیت کو نقل کر کے مسجد کی صفائی کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور واقعی یہ بات مسجد کی صفائی اور خدمت کے لئے بڑی اہم ہے۔ قرآن کی ان دو آیتوں میں مسجد کی صفائی کا بیان باوجود اختصار کے بہت کافی ہے۔

حدیث میں فضائل

مسجد کی صفائی کے فضائل حدیثوں میں بے شمار ہیں، یہاں اس سلسلہ کی صرف چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جو اس مسئلہ کے ثبوت کے لئے کافی و وافی ہیں۔ ایک دفعہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

عرضت علیّ اجور امّتی حتی	مجھ پر میری امّت کے اجر پیش کئے

القذاة یخرجها الرجل من المسجد۔ (۱)	گئے یہاں تک کہ وہ کوڑا بھی جو کسی نے مسجد سے باہر کیا تھا۔

عربی داں جانتا ہے کہ قذاۃ کے لفظ میں کس قدر فصاحت و بلاغت ہے، قذاۃ اس تنکے کو کہتے ہیں جو آنکھ میں پڑ جائے۔ تنکے کے پڑنے سے جو تکلیف ہوتی ہے وہ سب جانتے ہیں اور اسے نکالنے کی جس قدر جلد سعی پیہم کی جاتی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں تو گویا اس لفظ کو لاکر اس طرف اشارہ کیا گیا کہ کوڑا کرکٹ مسجد کے لئے ایسی ہی اذیت کا باعث ہے جیسے تنکا آنکھوں کے لئے اس لئے اس کو جلد سے جلد صاف کیا جائے، دوسرے یہ کہ معمولی گندگی بھی مسجد میں نہ ہونی چاہیئے۔

سرکارِ دوعالم کی خدمتِ مسجد

حضرت انس رض خادم رسول صلعم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپ کی نظر بلغم پر پڑ گئی جو قبلۂ مسجد میں کسی نے ڈال دیا تھا، یہ دیکھ کر آپ کو بڑی اذیت ہوئی اور اس اذیت و ناگواری کا اثر چہرۂ مبارک پر آ گیا، پھر خود اٹھے اور اپنے دستِ مبارک سے اسے صاف فرمایا۔ اس کے بعد صحابۂ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا: "لوگو! تم میں کا کوئی جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو گویا وہ اپنے پروردگار سے سرگوشی کرتا ہے اور اس کے اور قبلہ کے درمیان ربّ العزت اپنی رحمت و رضا کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی اپنے سامنے نہ تھوکے، نماز میں تھوکنے کی ایسی ہی مجبوری لاحق ہو تو بائیں جانب یا پاؤں کے نیچے ڈال سکتا ہے۔ پھر آپ نے مل کر کے اسے بتایا، اپنی چادرِ مبارک کے ایک کنارے

---

(۱) مشکوٰۃ عن الترمذی و ابی داؤد ۱/۶۹۔

کو لیا، اس پر تھوکا اور مَل دیا۔ پھر فرمایا ایسا ہی کرے (۱)

مسجد میں تھوکنا گناہ ہے

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں :۔

البزاق خطیئۃ وکفارتہا دفنہا۔ (بخاری ۱/۵۹)

تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اس کا دفن کرنا ہے۔

یعنی مسجد میں تھوکنا گناہ ہے، کسی سے نادانستہ ایسی غلطی ہو ہی جائے تو اس کو چاہیئے کہ اس کو دفن کر دے، نوویؒ نے لکھا ہے کہ مسجد میں کہیں بھی تھوکا نہیں جا سکتا بلکہ تھوکنا گناہ ہے اور قبلہ کی دیوار کا احترام نسبتاً بڑھا ہوا ہے اس لئے اُدھر تھوکنا اور بھی بُرا ہے۔ یہ قبلہ مسجد میں ہو یا کسی اور جگہ، دونوں قابلِ احترام ہیں، جس جگہ آدمی نماز پڑھتا ہے وہاں نماز میں قبلہ کی طرف تھوکنے کی ممانعت ہے۔ ان اللہ جمیل یحب الجمال۔ نماز پڑھتے ہوئے منہ میں تھوک آ ہی جائے تو کپڑے کے کنارہ پر تھوک کر مَل دے کہ اس صورت میں تلویثِ مسجد نہیں ہے۔ مسجد سے باہر اگر کوئی نماز پڑھتا ہو اور پاؤں کے نیچے یا بائیں جانب مجبوری کی حالت میں تھوک دے تو مضائقہ نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسجد میں تھوکنے کی جرأت نہ کی جائے نگلنا پڑے تو یہ کرے مگر تھوکنا مناسب نہیں (۲)

مسجد سے گندگی دور کرنا

مسجد میں تھوک دیکھا جائے تو اس پر مٹی ڈال دی جائے، اگر فرش

---

(۱) بخاری ۱/۵۸۔ (۲) فتح الباری ۱/۳۴۴، ۳۴۵۔

کچا ہے۔ یا کھرچ کر پھینک دیا جائے۔ اور فرش پختہ ہے تو اس کو صاف کرے، دھو کر یا کپڑے سے اٹھا کر، کیوں کہ فرش پر ملنے سے اور گندگی پھیل جائے گی، صاف کرنے میں اس کا خیال رہے کہ کوئی اثر گندگی کا باقی نہ رہنے پائے اور ہو سکے تو خوشبو لے کر مل دے (۱)

قفال نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ دفن کرنے کا جس کو حکم ہے وہ منھ اور سر سے اترنے والا تھوک ہے، باقی جو بلغم سینہ سے آتا ہے وہ نجس ہے، اسے کسی حال میں مسجد میں دفن نہ کیا جائے گا (۲)

دفن کے معنی عام لئے جائیں، یعنی اس کو صاف کر دینا اس طرح کہ ظاہری طور پر اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے تاکہ اشکال سرے سے ختم ہو جائے کیوں کہ گھن جس سے آتی ہو اسے مسجد میں دفن کرنا کسی طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کے متعلق آیا ہے کہ انہوں نے ایک رات مسجد میں تھوک دیا اور صاف کرنا بھول گئے، گھر واپس پہنچ چکے تو ان کو یاد آیا، فوراً روشنی لے کر مسجد تشریف لائے اور اسے تلاش کر کے صاف کیا (۳)

صاحبِ فتح الباری نے حضرت ابو ذر سے ایک روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

وجدت فی مساوی اعمال	میں نے اپنی امت کے برے اعمال میں
امتی النخاعۃ تکون فی	اس گاڑھے تھوک کو بھی پایا جو مسجد

---

(۱) فتح الباری ص: ۳۴۶۔ (۲) حوالہ سابق۔

(۳) ایضاً۔

المسجد لاتدفن۔ میں ڈالا گیا مگر صاف نہ کیا گیا۔

(۱/۳۴۵)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد کے گندہ کرنے کا گناہ نامۂ اعمال میں ثبت ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن حساب کتاب میں وہ چیز بھی سامنے لائی جاتی ہے، پس ہر مسلمان کو چاہیئے کہ مسجد میں کوئی ایسا تنکا بھی نہ ڈالے جس سے گندگی معلوم ہو اور اگر کوئی ایسی چیز دیکھ لے تو فوراً صاف کر دے۔ امام کی تو خصوصیّت سے یہ ذمہ داری ہے کہ مسجد کی صفائی کی دیکھ بھال کرے اور اس کی نگرانی کرے کہ خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو انجام دیا ہے (۱)

مسجد گندہ کرنے کی سزا

حضرت سائب بن فدادؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے قوم کی امامت کی، اتفاق کی بات اس نے جانبِ قبلہ تھوک دیا، جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچشم خود دیکھ لیا۔ آپؐ کو یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی آپؐ نے سختی سے فرمایا کہ اس کو اب امامت نہ کرنے دینا۔ چنانچہ لوگوں نے اس کو دوبارہ امامت نہ کرنے دی۔ اس کو جب آپؐ کا واقعہ معلوم ہوا تو وہ دربارِ نبوی میں حاضر ہوا اور جو کچھ سنا تھا بیان کیا۔ آپؐ نے اس کی باتیں سن لیں اور اس کے بعد فرمایا۔ ہاں یہ درست ہے، میں نے ہی روکا ہے، اس لئے کہ تم نے مسجد میں تھوک کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کو اذیّت دی (۲)

---

(۱) فتح الباری ۱/۳۴۷۔ (۲) مشکوٰۃ بابُ المساجد۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسجد کی بے ادبی کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ یہ وہ جرمِ عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاکؐ کے لئے باعثِ اذیت ہوتا ہے اور اس جرم میں کسی عہدہ دار کو اس کے عہدہ سے معزول کر دیا جائے تو بجا ہے بلکہ وہ اسی لائق ہے کہ اس کو جرم کا بدلہ ملنا چاہیئے۔

جاروب کش نگاہِ نبویؐ میں

ایک طرف گندہ کرنے کی سخت سزا جو اُوپر مذکور ہوئی، اور دوسری طرف اس کی صفائی کا یہ ثواب کہ قیامت میں اس کو اس کا گرانقدر معاوضہ عطا ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک سیاہ فام شخص مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا، اس کا انتقال ہوگیا، جس کی اطلاع آپؐ کو نہ دی گئی، آپؐ نے جب اس کو دوسرے دن نہیں دیکھا تو لوگوں سے دریافت فرمایا۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ اس کا تو انتقال ہوگیا، اس کی اچانک موت کی خبر سن کر آپؐ نے فرمایا، تم نے مجھے خبر کیوں نہیں دی؟ پھر فرمایا اس کی قبر بتاؤ، چنانچہ آپؐ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور اس کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ راوی کو اس کے متعلق شک ہے کہ وہ عورت تھی یا مرد تھا؟ مگر روایتوں کی تفتیش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت تھی اور اس کی کنیت ام محجن تھی (۱)

لوگوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ایک معمولی آدمی کے لئے آپؐ کو کیوں تکلیف دی جائے؟ مگر آپؐ کی نظر میں اس کی اس حیثیت سے بڑی وقعت تھی کہ

(۱) فتح الباری ۱/۴۷۱۔

اس کو خادمِ مسجد ہونے کا شرف حاصل تھا۔

خدمتِ مسجد ایمان کی علامت ہے

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اذا رأیتم الرجل یتعاھد	تم جب کسی کو مسجد کی خدمت کرتے
المسجد فاشھدوا لہٗ بالایمان۔	دیکھو تو اس کے ایماندار ہونے کی گواہی
(مشکوٰۃ ۱/۶۹)	دو۔

تعاہد کے بہت سے معنوں میں ایک معنیٰ جھاڑو دینا بھی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ عموماً دوشنبہ اور پنجشنبہ کو مسجد قبا جاتے تھے۔ ایک دن مسجد میں دیکھا کہ جھاڑو نہیں دی گئی ہے، خود آپ نے کھجور کی شاخ لے کر مسجد کو صاف فرمایا، پھر لوگوں کو تاکید فرمائی کہ مسجد کو مکڑیوں کے جالے وغیرہ سے پاک وصاف رکھو (۱)

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ اس (مسجد) کو ہر طرح کی گندگی سے پاک وصاف رکھو۔ یہ اس لئے کہ اس میں ذکر اللہ اور تلاوتِ قرآن پاک ہوتی ہے (۲)

مسجد کی صفائی کا معاوضہ

اخیر میں اس حدیث کو ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ لگائیں کہ خادمِ مسجد کا اجر کتنا بڑا ہے:۔

---

(۱) وفاء الوفاء ۲/۲۰۔

(۲) ریاض الصالحین للنووی ص۲۵۰۔

من اخرج اذی من المسجد بنی اللہ لہ بیتاً فی الجنۃ (ابن ماجہ باب تطہیر المساجد)

جو شخص مسجد سے گندگی نکالے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔

اس حدیث کو پڑھ کر ہر مسلمان کے دل میں مسجد کی خدمت اور اس کی صفائی کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے کہ اس معمولی خدمت کا اجراتنا بڑا نصیب ہوگا۔

اس تفصیل کا ماحصل یہ ہے کہ مسجد کو جو دربارِ الٰہی ہے ہر طرح کی گندگی، خس و خاشاک، تھوک، بلغم، گھناؤنی چیز اور شریعت میں جو بھی نجس اور تکلیف دہ ہے، اس سے پاک و صاف رکھنا ضروری ہے اور جو اس خدمت کو انجام دے گا اللہ تعالیٰ کے یہاں سے اس کو بڑا اجر ملے گا پھر یہ بھی واضح ہو جائے کہ یہ خدمت باعثِ ذلت نہیں باعثِ عزت و رضائے الٰہی ہے اور یہ وہ عظیم الشان خدمت ہے جسے خود سرکارِ دو عالمؐ نے اپنے ہاتھوں انجام دیا ہے اور آپؐ کے جلیل القدر صحابہ کرامؓ نے۔

بدن اور کپڑوں کی صفائی

طہارت و نظافت اور مسجد کی صفائی کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ مسئلہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ بدبودار بدن یا کپڑوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہونا جس کی بو اذیت دیتی ہو، جائز نہیں ہے۔ وسعت بھر اس فعل سے اجتناب ضروری ہے اور جب کوئی مسجد آئے تو اس کا بدن اور لباس صاف ہونا چاہیے۔

جمعہ کے دن غسل کی جو تاکید آئی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ بدبو

سے بچنا بھی ہے، کیوں کہ اجتماع میں ایسا ہوتا ہے کہ پسینہ آجاتا ہے اور اس کی بدبو پھیلنے لگتی ہے جو فرشتوں اور نمازیوں کے لئے اذیت کا باعث بن جاتی ہے اور یہ چیز دربارِ الٰہی کے آداب کے خلاف بھی پڑتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے عراقی حضرات کے سوال کرنے پر بیان کیا تھا کہ :-

"جمعہ کے دن غسل کا حکم اس وجہ سے ہوا کہ لوگ مزدوری کرتے تھے، ان کا کپڑا استعمال ہوتا تھا اور ان کو اپنی پشتوں پر بھی بار برداری کبھی کرنی پڑتی تھی۔ اور مسجد کا حال یہ تھا کہ ان کی مسجدیں تنگ تھیں، جن کی چھتیں نیچی ہوتی تھیں، جنہیں جھونپڑی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، موسم گرما میں ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے لوگ اپنے انہی کپڑوں میں شرابور ہو رہے تھے اور ان سے تکلیف دہ بو پھوٹ رہی تھی، آپؐ نے جب یہ چیز دیکھی تو فرمایا، لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کرکے آیا کرو اور جو میسّر ہو اس کے مطابق اچھے سے اچھا تیل یا خوشبو مل کر آؤ۔" (۱)

گندہ دہنی سے اجتناب

بدن، کپڑوں کے ساتھ منھ بھی صاف ہونا چاہیئے، ایسا نہ ہو کہ بولنے اور منھ کھولنے کے ساتھ مسجد کے کچھ حصوں میں بدبو پھیل جائے اور نمازیوں کے لئے اذیت کی وجہ بن جائے۔ مسجد آنے سے پہلے اچھی طرح منھ صاف کرلیا جائے، کوئی ایسی چیز نہ کھائی پی... جائے جس سے بدبو پیدا ہوتی ہے۔

حدیث میں مسواک کی تاکید اور اس کی فضیلت جو بیان کی گئی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کے دربار میں حاضری

---

(۱) مشکوٰۃ ۱/۵۵ عن ابی داؤد۔

پاکیزگی اور نفاست کے ساتھ ہو تاکہ مناجات اور سرگوشی میں پورا پورا ادب ملحوظ رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں منہ کی صفائی کا بڑا اہتمام فرمایا، خود تو یہ حال تھا کہ کوئی وضو بغیر مسواک کے نہیں ہوتا تھا، یوں بھی آپؐ بکثرت مسواک کرتے۔ آپؐ نے اپنی امت کو بھی اس کی بڑی ترغیب فرمائی ہے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں یہ حکم دیتا کہ ہر نماز کے وقت مسواک کریں (۱)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مسواک سے منہ کی صفائی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی (۲)

اسی صفائی کا نتیجہ ہے کہ آپؐ نے ایسی چیز کھا کر مسجد جانے سے روکا ہے جس کی بو جلد ختم نہیں ہوتی جیسے کچی پیاز، لہسن، مولی اور اسی طرح کی دوسری چیزیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من أكل ثوما اوبصلا فليعتزلنا اوفليعتزل مسجدنا (۳)	جو بھی لہسن پیاز کھائے اس کو چاہئے کہ ہماری مسجد سے علیحدہ رہے۔

دوسری روایت اس سے واضح ہے جس میں علت بھی بیان کی گئی ہے:۔

من اكل من هذه الشجرة فلا يقربن مسجدنا فان الملائكة تتأذى مما تتأذى الانس۔ (مشکوٰۃ ۱/۶۹)	جو اس درخت (پیاز) سے کھائے ہماری مسجد کے قریب نہ آئے، اس لئے کہ فرشتوں کو اس چیز سے اذیت ہوتی ہے جس سے انسان کو اذیت ہوتی ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ عن البخاری و مسلم باب السواک۔

(۲) مشکوٰۃ باب السواک عن النسائی وغیرہ۔

(۳) ریاض الصالحین للنووی صفحہ ۲۵۰۔

مٹی کا تیل وغیرہ جلانا

اسی علّتِ اذیت کی وجہ سے مسجد میں مٹی کا (کراسن) تیل جلانا نہ چاہیئے کہ اس کی بو بھی اذیت دیتی ہے۔ اسی طرح مسجد میں بیڑی، سگریٹ اور حقہ پی کر بغیر منھ صاف کیئے داخل نہ ہونا چاہیئے۔ اس سے یہ بات خود سمجھ میں آتی ہے کہ جب بدبودار منھ کے ساتھ مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے تو مسجد میں بیڑی سگریٹ پینا کتنا بڑا جرم ہوگا۔

"وسیلہ احمدیہ شرح طریقہ محمدیہ" میں ہے:۔

قال الفقهاء کل من وجد فيه رائحة کريهة يتاذى به الانسان يلزم اخراجه ولو يجر من يده او رجليه دون لحيته وشعر رأسه۔	فقہاء نے کہا ہے کہ جس شخص میں ایسی ناگوار بو پائی جائے جس سے انسان کو اذیت ہو تو اس کا نکال دینا لازم ہے گو ہاتھ پیر پکڑ کر گھسیٹنا پڑے ہاں داڑھی اور سر کے بال نہ پکڑے جائیں۔
(فتاویٰ عبدالحیؒ ج ا ص۱۷۶)	

فقہاء کی اس صراحت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بدن، منھ اور کپڑوں کی صفائی کس قدر ضروری ہے۔

تارِ عنکبوت

اسی علتِ اذیت میں مکڑی کے جالے بھی آجاتے ہیں کہ آدمی طبعاً اس سے بھی تکلیف محسوس کرتا ہے، ہمارے زمانہ میں اس طرف توجہ دینے کی بڑی گنجائش ہے۔ اس سلسلہ میں فاروقِ اعظمؓ کا قول گذر چکا ہے کہ آپ نے

مسجدِ قبا کے متعلق فرمایا تھا کہ مکڑیوں کے جالے سے پاک و صاف رکھو۔

اخراجِ ریح

اسی علت میں اخراجِ ریح بھی ہے کہ اس سے بھی بدبو پھیلتی ہے اور جب بدبو پھیلے گی تو اذیت ضرور پائی جائے گی، علماء نے اسی وجہ سے لکھا ہے کہ اخراجِ ریح مسجد میں مکروہ تحریمی ہے، معتکف کو البتہ بعض علماء نے معذور قرار دیا ہے، یوں اجتناب ہر حال میں اولیٰ ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ فرشتے نمازیوں کے لئے اس وقت تک دعاء کرتے ہیں جب تک وہ حدث نہیں کرتے ہیں (۱)

خوشبو کی دھونی

صرف یہی نہیں ہے کہ مسجد کو بدبو اور گندی چیزوں سے بچانا ضروری ہے بلکہ تطہیر و تنظیف کے ساتھ تطییب بھی مطلوب ہے، ایک لمبی حدیث میں یہ ٹکڑا بھی آیا ہے:۔

اتخذوا علیٰ ابوابھا المطاھر	ان (مسجدوں) کے دروازوں پر
وجمروھا فی الجُمع۔	طہارت خانہ بناؤ اور جمعوں میں
(ابن ماجہ ۱/۵۵)	ان کے اندر خوشبو کی دھونی دو۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ مسجدوں میں طہارت خانہ اور خوشبو کی دھونی کا انتظام کرو۔ فاروقِ اعظمؓ ہر جمعہ کے دن دوپہر میں مسجد کے اندر خوشبو کی دھونی دیا کرتے تھے، ساتھ ہی یہ حکم بھی نکال دیا تھا کہ

(۱) مسلم باب فضل الصلوٰۃ المکتوبۃ صفحہ: ۲۳۴۔

ہر شہر کی مسجدوں میں دوپہر کے وقت خوشبو کی دھونی دی جائے (۱)

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی وہ حدیث گذر چکی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسجدیں بناؤ اور ان کو پاک وصاف اور معطر رکھو (۲)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں لوبان، اگربتی اور دوسری خوشبو جلائی جائے، جمعہ کے دن اور بھی اس کا اہتمام رکھا جائے۔

روشنی

مسجد میں روشنی کرنے کی بھی بڑی فضیلت ہے۔ ابوداؤد میں اس کے متعلق حدیث آئی ہے۔

وقف اور تولیت

مسجد کے لئے جو زمین وغیرہ وقف کی جاتی ہے اس سے یقینی طور پر واقف کی ملکیت بالکلیہ...... ختم ہو جاتی ہے، اسی وجہ سے وقف میں شرط ہے کہ واقف راستہ کے ساتھ اپنی اس ملکیت سے علیحدہ ہو جائے اور لوگوں کو نماز کی عام اجازت دیدے، اس اجازت کے بعد اگر ایک شخص نے بھی اس میں نماز پڑھ لی تو وہ مسجد ہو گئی، واقف کی ملکیت سے علیحدگی کا فائدہ یہ ہوگا کہ ملکیت حسبۃً للہ ہو جائے گی اور سپردگی بحقِ مسجد ثابت

(۱) زاد المعاد ۱/۱۰۴۔

(۲) مشکوٰۃ ۱/۶۹۔

ہوجائے گی۔ بعض ائمہ کہتے ہیں کہ وقف کے بعد قبضہ کے ثابت ہونے کے لئے باجماعت نماز ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ مقصود بالذات مسجد سے جماعت ہی کی نماز ہے، انفرادی طور پر تو ہر جگہ نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اذان و اقامت کا مقصد بھی جماعت ہی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک ہی شخص نماز پڑھے مگر اذان و اقامت کے ساتھ تو قبضہ کے لئے یہ کافی ہے اور امام ابو یوسفؒ کا یہ کہنا ہے کہ صرف واقف کا وقف کا اعلان ہی مسجدیت کے لئے کافی ہے (۱)

تولیت

مسئلہ تولیت میں واقف کو اختیار ہے کہ تولیت اپنے اور اپنے خاندان کے لئے محفوظ رکھے یا وہ جس کو چاہے بخش دے مگر جب متولی میں شرعی اعذار پیدا ہوجائیں گے تو اس کو اس عہدہ سے برطرف کردیا جائے گا، مثلاً وہ غیر مامون ہو، عاجز ہو، فاسق ہو یا فاجر کہ اس کو شراب پینے کی عادت ہوگئی یا کیمیا میں مال خرچ کرنے لگا، تو ایسی صورت میں متولی کو تولیت سے علیحدہ کردینا ضروری ہے، کوئی متولی خائن ہوجائے تو اس کو بھی قاضی معزول کرسکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی متولی سال بھر پاگل رہے تو وہ خود بخود معزول ہوجائے گا، البتہ صحت یاب ہونے پر وہ دوبارہ متولّی ہوسکتا ہے (۲)

واقف نے اگر یہ شرط لگادی ہے کہ تولیت اس کی اولاد در اولاد

(۱) ھدایہ مع حاشیہ مولانا عبدالحیؒ ۲/۶۲۴۔

(۲) درمختار مع ردالمحتار ۳/ ۴۲۱، ۴۲۲۔

میں رہے گی تو جب تک اس خاندان سے کھلی ہوئی خیانت ثابت نہ ہوجائے یا کوئی اور ایسا عذر محقق نہ ہوجائے جس سے معزولی جائز و ضروری ہو قاضی کسی اور کو متولی نہیں بنا سکتا، اور اگر وہ ایسا بغیر کسی معقول عذر کے پائے جانے کے کرنا چاہے تو قاضی کا یہ فعل درست نہ ہوگا (۱) ہاں جن اسباب کی بناء پر متولی کے علیٰحدہ کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے ان میں سے کوئی سبب یا عذر پایا جائے گا تو قاضی اس کو علیٰحدہ کر دے گا۔

جس وقف کی تولیت کسی متعین شخص یا خاندان سے مخصوص نہ ہو یا انتخاب کا حق اہل مسجد پر ہو تو اس وقت متولی ایسے شخص کو منتخب کیا جائے گا جو اس عہدہ کا خواہاں نہ ہو، کیوں کہ جو عہدہ کا خواہشمند ہوتا ہے وہ عموماً اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں رکھتا ہے اور کسی فاسد نیت سے اس کا خواہاں ہوتا ہے۔

حقِ انتخاب

متولی کے انتخاب کا حق واقف کو ہے پھر حاکم اور قاضی کو یا واقف نے جن لوگوں کو اس کا اختیار دیا ہے۔ جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے وہاں عموماً یہ اختیار محلہ کی پبلک کو واقف دیتے ہیں جن کو دین سے لگاؤ ہو ـــــــــــــ

متولی کے اوصاف

متولی کے انتخاب میں ان چیزوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ

---

(۱) عالمگیری باب ولایت الوقف ج ۲۔

امانت دار، معتمد، دیانتدار اور متقی ہو، خائن، چور اور مسرف (فضول خرچ) نہ ہو۔ پھر یہ کہ وہ عاقل و بالغ ہو، اس کا لحاظ نہیں ہے کہ وہ آنکھ والا ہو یا اندھا، مرد ہو یا عورت، کیوں کہ اندھا اور عورت بھی متولی ہو سکتے ہیں۔

متولی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی خوشی سے اپنی جگہ اپنی زندگی میں کسی اور کو متولی بنا دے، البتہ اگر اس کو مختارِ کل بنا دیا گیا ہو تو ایسا کر سکتا ہے۔

متولی کے فرائض

تولیت کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے اختیارات لامحدود ہوں بلکہ اس کے اختیارات کی شریعت نے تعیین کر دی ہے اور اس کے فرائض بیان کر دیئے گئے ہیں جن پر پابندی متولی کے لئے ضروری ہے اپنی مفوضہ خدمت سے زیادہ کا اس کو اختیار نہیں ہے۔

واقف نے اگر مشاہرہ کا اس کے لئے تعین کر دیا ہے تو اس کو اس کا لینا جائز ہے۔ ورنہ بقدرِ اجرت کے اجازت ہے (۱)

متولی کے لئے جائز ہے کہ بوقتِ ضرورت مسجد کی صفائی اور روشنی کے لئے ملازم رکھے مگر مشاہرہ مناسب اور دستور کے مطابق مقرر کرے گا زیادہ دے گا تو وہ ضامن ہو گا۔ ہاں وہ اپنے پاس سے زیادہ بھی دے سکتا ہے (۲)

متولی وقف کی بچت سے یعنی صرف کرنے کے بعد جو بچے گا اس

---

(۱) فتاویٰ عبدالحیٔ ۱/۴۰۴۔

(۲) فتح القدیر کشوری ۲/۸۸۰۔

سے ذرائع آمدنی خرید کرے گا جو وقف ہی ہوگا لیکن اس خریدی ہوئی چیز کا حکم وقف کا نہ ہوگا، یعنی ضرورت کے وقت یہ بعد کی خریدی ہوئی چیز فروخت ہوسکتی ہے (۱)

وقف میں جو گھر ہے اس میں کوئی متولی کی اجازت حاصل کئے بغیر رہے گا تو اس کو اجرت مثل وجوباً دینی ہوگی (۲)

متولّی ضرورت کے وقت وقف میں اپنا مال لگا سکتا ہے اور اس نے اگر اپنی لکڑی مسجد کے کام میں دی ہے تو پھر لے سکتا ہے (۳)

متولّی وقف کی آمدنی سے تیل، چٹائی اور فرش کے لئے اینٹ سمنٹ خرید سکتا ہے بشرطیکہ وقف نامہ میں اس کی گنجائش ہو، مثلاً یہ جملہ ہو کہ مسجد کے مصالح اور اس کی ضرورت میں خرچ کر سکتے ہیں، البتہ اگر کسی متعین کام کے لئے ہی وقف کی آمدنی وقف کی گئی ہو تو اس کے سوا دوسرے کام میں نہیں خرچ کر سکتے، مثلاً مسجد بنانے ہی کے لئے ہو تو اس سے چٹائی، روشنی اور فرش وغیرہ کا نظم نہیں کر سکتے (۴)

متولی کو جب وقف نامہ کی تفصیل کا علم نہ ہو تو اس مجبوری میں اپنے پیشرو کی تقلید کرے گا (۵)

متولّی وقف کے لئے اس وقت تک قرض نہیں لے سکتا جب تک کوئی ضروری اور ناگزیر امر پیش نہ آجائے اور پھر ایسے وقت میں قاضی کی اجازت بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔ قاضی کی اجازت کے بغیر قرض نہ لیگا۔ قاضی کی اجازت سے قرض ضرورت کے لئے لیا گیا تو اسے وقف کی آمدنی

---

(۱) فتح القدیر کشوری ۲/۸۸۰۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔
(۴) حوالہ سابق۔ (۵) ایضاً۔

سے ادا کرے گا، اسی طرح وقف میں زراعت ہوتی ہو اور بیج نہ ہو تو قاضی کی اجازت سے بیج بھی قرض لے سکتا ہے۔ واضح رہے متولی کے لئے یہ قرض اسی وقت جائز ہے جب اس کے ہاتھ میں کچھ نہ ہو اور وہ اسے ادا بھی کردے (۱)

متولی کے پاس وقف کے روپے تھے مگر اس نے وقف کے لئے کوئی چیز اپنے ذاتی روپے سے خریدی تو ایسی حالت میں بالاتفاق یہ جائز ہے کہ وقف کے خزانے سے اپنے روپے لے لے (۲)

وقف شدہ مکان کو متولی رہن (گرو) نہیں رکھ سکتا، اگر اس نے رہن رکھ دیا اور مُرتَہِن نے اس میں سکونت اختیار کر لی تو ایسی صورت میں اس کو مروّجہ کرایہ دینا پڑے گا (۳)

متولی نے وقف کے روپئے اپنی ضرورت میں صرف کر دیئے پھر اتنا ہی اپنے مال سے وقف میں خرچ کر دیا یا وقف کے خزانہ میں داخل کر دیا تو اس پر ضمان نہیں ہے (۴)

وقف کے روپے جمع تھے۔ کفار کی جانب سے مسلمانوں پر ناگہانی آفت یا مصیبت ٹوٹ پڑی، جس کے دفعیہ کے لئے روپے کی ضرورت ہوئی تو ایسی حالت میں دیکھا جائے کہ اگر جامع مسجد سے متعلق اور مسجد کو اس کی فوری ضرورت نہیں ہے تو حاکم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ وقف کے روپے بطور قرض مسلمانوں کو آفت اور مصیبت سے بچانے کے لئے خرچ کرے (۵)

---

(۱) فتح القدیر کشوری ۲/۸۸۲۔ (۲) حوالۂ مذکور (۳) ایضاً۔
(۴) حوالۂ سابق۔ (۵) ایضاً۔

مسجد کی مصلحت کے لئے جو وقف ہے اس کی آمدنی سے مسجد کے دروازہ پر ظُلّہ (چھت سایہ کے لئے) بنوانا متولّی کے لئے جائز ہے تاکہ بارش کے نقصان سے محفوظ رہے، ہاں وقف جب مسجد کی تعمیر اور مرمّت کے لئے مخصوص ہو تو ظلہ نہیں بنوا سکتا مگر ظہیر الدینؒ کہتے ہیں کہ وقف عمارت مسجد پر ہو یا مصالحِ مسجد پر دونوں برابر ہیں اور یہ زیادہ صحیح ہے، لہذا بنوانا جائز ہو گا (۱)

موجودہ دَور میں متولّی

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے موجودہ دَور میں وقف کا جو حشر ہو رہا ہے اور متولی جس طرح دیدہ و دانستہ کو تاہی کرتے ہیں اس پر چند کلمات لکھنا ضروری ہیں۔

پہلے اس امر کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے کہ واقف وقف کس نیت سے کرتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وقف کر کے یہ چاہتا ہے کہ جس کام کے لئے وقف کیا گیا ہے وہ حسن و خوبی سے ادا ہو، اخراجات کے نہ ہونے کی وجہ سے کام کے تعطل کا جو خطرہ ہے وہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے اور مسجد کا واقف تو ایک بڑی گہری فکر کے ساتھ اس کام کو انجام دیتا ہے، اس کی نیت کس قدر صالح ہوتی ہے کہ مسجد کا نظم عمدہ پیرایہ سے برقرار رہے "دربارِ الٰہی" کی صفائی ہو، اس میں روشنی ہو، اس کے حاضرین کو ہر طرح کا ذہنی اور خارجی آرام ہو اور اس وقف کی آمدنی سے "دربارِ الٰہی" کے کام کاج مزے سے چلتے رہیں۔ خدانخواستہ اس کی نیت مال کو ضائع کرنا نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کا یہ ارادہ ہوتا ہے کہ متولی اپنے عیش و آرام میں صرف کرے، متولی

---

(۱) فتح القدیر کشوری ۲/ ۸۸۱۔

اس لئے کوئی بھی نہیں بنا تا کہ وقف برباد ہو، اسی لئے عموماً وقف ناموں میں متولی کا انتخاب بہت سی قیدوں کے ساتھ درج ہوتا ہے۔

تولیت کے لئے شرائط

متولی ان تمام شرطوں کو جب پوری کرتا ہے تب کہیں وہ اپنے عہدہ کو ادا کرتا ہے، میں نے ایسے وقف نامے بھی دیکھے ہیں جن میں تولیت اپنے خاندان میں رکھی گئی ہے مگر شرائط وقیود لکھ کر اس کی صراحت کر دی گئی ہے کہ اگر ان شرائط وقیود کے مطابق کوئی فرد میرے خاندان کا وقف کو نہ چلا سکے تو اس کو برطرف کر دیا جائے۔

متولی کے لئے تقریباً ہر وقف نامہ میں درج ہوتا ہے کہ وہ عاقل و بالغ ہونے کے ساتھ امانتدار ہو، دیانتدار، ذی ہوش اور اوقاف کی بھلائی چاہنے والا ہو، وقف کی آمدنی حفاظت سے خرچ کرے، ذرائع آمدنی کی حفاظت کرے، اس کو ترقی دینے کی سعی پیہم جاری رکھے اور پھر وقف نامہ میں جو مصرح شعبہ ہوتے ہیں اس کے خلاف کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی لعنت سے ڈرایا جاتا ہے۔

متولّی کی غفلت

با ایں ہمہ متولی کی وقف کی اصلاح و ترقی سے چشم پوشی حد درجہ افسوسناک ہے اور قصداً وقف کے انتظام میں کوتاہی ناقابلِ برداشت، عموماً یہ منظر کم و بیش ہر جگہ نظر آتا ہے کہ کافی آمدنی ہوتے ہوئے بھی مسجد کا نظم خراب سے خراب تر ہو رہا ہے۔ نہ مسجد میں صفائی ہے، نہ روشنی کا

انتظام ہے، فرش ٹوٹ رہا ہے، دیواریں گر رہی ہیں، وضو خانہ میں پانی ناپید ہے اور امام و مؤذن وقت کی پابندی سے کام نہیں کرتے ہیں، مزید یہ اور غضب ہے کہ وقف نامہ کی صراحت کے باوجود امام کا انتخاب صرف مشاہرہ کی وجہ سے نامعقول ہے۔ ایسا امام جو خود مسائلِ ضروریہ سے واقفیت نہیں رکھتا ہو دوسروں کی رہنمائی کیا کرے گا۔

متولی کو یقین رکھنا چاہیے کہ کل اس کو مرنا ہے، اپنے اعمال و اخلاق کا حساب دینا ہے اور اپنی اس ذمہ داری اور پھر کوتاہی کے سوال کا جواب پیش کرنا ہے، اپنے فرائض سے کوتاہی وہ جرمِ عظیم ہے جس کی گرفت سخت تر ہوگی۔ یہ کیا ظلم ہے کہ وقف کی آمدنی کا نہ کوئی حساب کتاب ہے اور نہ اخراجات کے اصول و قواعد۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ ہمیں کون کام کرنا چاہیئے اور کس جگہ خرچ کرنے سے پرہیز، وقف کی آمدنی ایسے کام میں خرچ کرنا جس میں نام و نمود مقصود ہو اور وقف کو جس سے کوئی فائدہ نہ ہو، اپنی ذمہ داری کے احساس کا فقدان ہے اور یہی وجہ ہے کہ وقف کی آمدنی بعض اپنی آمدنی سے ملا دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وقف کی چیز میری چیز ہے۔

ایک مردِ مؤمن کو ان بے اعتدالیوں سے ڈرنا چاہیئے اور مفوضہ خدمات حسن و خوبی سے انجام دینا چاہیئے یا پھر اس سے علیٰحدہ ہو جانا چاہیئے۔

کتب موقوفہ

اخیر میں ایک بات اور یاد آگئی۔ بعض مسجدوں میں وقف میں کتابیں بھی ہوتی ہیں، متولی کا فرض ہے کہ ان کتابوں کی پوری حفاظت

کرے اور کیڑوں کی خوراک نہ ہونے دے، ساتھ ہی اس سے اہلِ علم کو استفادہ کا موقع دے اور اگر وقف میں صراحت ہو تو طالب العلم کو بھی دینا چاہیئے۔ ایک آدمی کتابوں کی حفاظت اور ان کے دینے لینے پر بھی متعین ہونا چاہیئے۔

متفرق مسائل

(فقہی جزئیات)

کتاب کی جامعیت کے پیش نظر یہاں ان مسائل کا ذکر ہے جو کسی عنوان کے تحت نہ آسکے، تاکہ ناظرِین کتاب مساجد سے متعلق ضروری مسائل میں دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز ہو جائیں۔

باب اقتدار میں عید گاہ اور نماز جنازہ کی جگہ کا حکم مسجد کا سا ہے۔

(عالمگیری ج ۱ ص۲۰۶)

کسی احاطہ میں ایسی مسجد ہے کہ دروازہ بند کر لینے کے بعد بھی گھر والوں سے اس میں جماعت ہو جاتی ہے تو یہ مسجد، مسجد جماعت کے حکم میں ہے، البتہ اگر یہ شکل ہے کہ احاطہ کے دروازہ کے بند ہونے کے بعد جماعت نہیں ہوتی ہے گو عوام کو وہاں نماز کی اجازت ہو اور دروازہ کھلے رہنے پر جماعت بھی ہو جایا کرتی ہے تو بھی یہ مسجد کے حکم میں نہیں ہے۔

(عالمگیری ج ۱ ص۲۰۶)

متولی کے انتخاب کا حق اہلِ محلہ کو ہے، باہم مشورہ سے منتخب کر سکتے ہیں۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۶۲)

امام نیچے ہو اور اس کی چھت پر مقتدی ہوں تو یہ جائز ہے بشرطیکہ مقتدی امام کے آگے نہ ہو، امام کا آگے ہونا ضروری ہے۔ (رد المحتار ۱/۶۱۴)

مسجد کی چھت پر چڑھنے سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا ہے۔ (ایضاً)

کوئی دن میں ایک مرتبہ بھی نماز تحیۃ المسجد پڑھ لے تو پورے دن کے لئے بھی کافی ہو سکتی ہے۔ (ایضاً)

محلہ کی مسجد میں جب کوئی مؤذن نہ ہو تو نمازی کو اذان پکارنا چاہیئے اور نماز پڑھنا چاہیئے گو وہ تنہا ہو، کیوں کہ اس پر مسجد کا حق ہے۔

(غایۃ الاوطار ج ۱ ص ۳۰۳)

محلہ میں چند مسجدیں ہوں تو قدیم تر میں نماز پڑھنی چاہیئے، اگر فاصلہ برابر ہو، ورنہ قریب تر میں۔ (ایضاً)

عید گاہ، جنازہ گاہ کی تعظیم و تکریم مسجد جیسی کرنی چاہیئے، پائخانہ پیشاب اور وطی سے بچانا چاہیئے۔ (طحطاوی علی الدر ج ۱ ص ۴۳۹)

مسجد میں سونا مکروہ ہے، ہاں مسافر و معتکف کے لئے کراہت نہیں، کوئی دوسرا سونا چاہے تو اعتکاف کی نیت کرے۔ (رد المحتار ۱/۶۱۹)

مصیبت کی وجہ سے مسجد میں بیٹھنا مکروہ ہے ایسی ہی مسجد کی چھت پر بھی (رد المحتار ج ۱/۶۱۹) اذان ہونے کے بعد مسجد سے نکلنا مکروہ ہے مگر یہ کہ وہ دوسری مسجد کا امام و مؤذن یا منتظم ہو تو مضائقہ نہیں، کوئی شخص فرض نماز پڑھ کر جماعت کے وقت مسجد میں آیا۔ اگر عشاء یا ظہر کی جماعت ہے تو نفل کی نیت سے مل جائے۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۶۱۹)

فناء مسجد وہ جگہ ہے کہ اس کے اور مسجد کے درمیان کوئی راستہ نہیں ہے۔ (ایضاً)

اقتداء کے باب میں فناء مسجد کا حکم مسجد جیسا ہے۔ (ایضاً)

شارعِ عام کی مسجد جس میں بہ پابندی جماعت نہیں ہوتی ہے مسجد ہی کے حکم میں ہے مگر اس میں اعتکاف جائز نہیں ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۶۱۹)

جس مسجد میں امام و مؤذن متعین نہیں، اس میں تکرارِ جماعت مکروہ نہیں بلکہ افضل ہے۔ ہاں اذان و اقامت کے ساتھ مکروہ ہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جماعتِ ثانیہ میں جب تین سے زیادہ آدمی ہوں تو مکروہ ہے، ورنہ مکروہ نہیں۔ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں ہیئت کی تبدیلی کے ساتھ جماعتِ ثانیہ مکروہ نہیں ہے۔ محراب سے ہٹ جانے سے ہیئت بدل جاتی ہے۔ (ایضاً)

مغصوبہ زمین میں جو مسجد بنی ہو، اس میں نماز پڑھنے میں بعض مضائقہ نہیں جانتے اور بعض کے یہاں ناجائز ہے۔ (ردالمحتار ج ۱)

فناءِ مسجد، خانقاہ، مسجد مدرسہ (مدرسہ کا جو کمرہ نماز کے لئے مخصوص ہے) حوض کے کنارے جو جگہ نماز کے لئے متعین ہے، بازار میں جو چبوترہ نماز پڑھنے کے لئے ہے، یہ تمام مسجد کے حکم میں نہیں ہیں، حائضہ وغیرہ داخل ہو سکتی ہیں۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۶۱۵)

مسجد میں قبیح اشعار پڑھنا مکروہ ہے، مگر حمد و نعت اور نصیحت آمیز اشعار کی اجازت ہے جب کہ ذاکر و نمازی کا حرج نہ ہو۔ (ردالمحتار ۱/۶۱۹)

ذکر بلند آواز سے مسجد میں مکروہ ہے مگر درسِ فقہ دے سکتا ہے بشرطیکہ نمازیوں کو ایذاء نہ ہو، یہی حکم درسِ حدیث و تفسیر کا ہے۔

(ردالمحتار ج ۱ ص۶۱۸)

بوقت ضرورت غریب اور گھر والا بھی مسجد میں سو سکتا ہے مگر اجتناب مستحسن ہے۔ (عالمگیری ج ۶ ص۲۱۵)

دنیا کا جو بھی کام ہو مسجد میں کرنا مکروہ ہے۔ (عالمگیری ج ۶ ص۲۱۵)

مسجد میں بیٹھ کر فصل مقدمات، درس اور فتویٰ دینا جائز ہے۔

(ردالمحتار ج ۱، ص۶۱۹)

مولی، لہسن اور کچی پیاز وغیرہ بدبودار چیز کھا کر بغیر منھ کی بو صاف کئے مسجد آنا مکروہ ہے۔ (ایضاً)

جس شخص کے کپڑے، بغل اور جسم سے بدبو آتی ہو اور اس سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہو تو ایسے شخص کو دخولِ مسجد سے روکا جا سکتا ہے۔

(ایضاً)

دستکاری کا کام کرنا مسجد میں ناجائز ہے۔ (ایضاً)

مسجد کی چھت پر بلا ضرورت چڑھنا مکروہ ہے۔ (ایضاً)

قرآن جو کسی مسجد پر وقف ہو اسی ایک پر محصور نہ رہے گا۔

(فتاویٰ عبدالحی ج ۳ ص۸۹ بحوالہ درمختار)

ایک شخص نے وصیت کی کہ یہ روپے فلاں مسجد کی تعمیر میں لگائے جائیں تو افضل یہ ہے جس کے لئے وصیت کی ہے اسی پر خرچ ہو لیکن اگر دوسری مسجد پر صرف کر دیا گیا تو یہ بھی جائز ہے۔

(فتاویٰ عبدالحی ج ۳ ص۱۰۳ بحوالہ سراجیہ)

دائمی سود خوار کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

(فتاویٰ عبدالحی ج ۱ ص۴۳)

کفار کا مال جو کسی نے مکر و فساد اور چوری سے حاصل کیا ہو اس سے مسجد بنانا جائز نہیں ہے۔ (ایضاً)

مسجد رفاض (رافضی) میں نماز ادا کرنا درست ہے۔ (فتاویٰ عبدالحی ۱/۹۵)

صرف "آمین" پکار کر کہنے والوں کو مسجد سے نکال دینا درست نہیں۔ (فتاویٰ عبدالحیٔ ج ۱ ص ۴۲)

بنی ہوئی مسجد میں سامان رکھنے کے لئے کمرہ بنانا جائز نہیں ہے، اور نہ کوئی مسکن۔ (فتاویٰ عبدالحیٔ ج ۱ ص ۲۹۵)

حسب تصریح معتبرات ہندو کا مال تعمیر معابد خاص اہل اسلام میں صرف کرنا درست نہیں ہے۔ (فتاویٰ عبدالحیٔ ج ۱ ص ۲)

امام مسجد میں ہے اور اس کی اقتدار مسجد سے باہر کسی چھت وغیرہ پر بھی کی جائے جو مسجد کے پہلو میں ہے اور مسجد اور اس چھت کے درمیان کوئی راستہ نہیں ہے تو یہ جائز ہے۔ (مبسوط للسرخسی ج ۱ ص ۲۱)

اپنے ذاتی مال سے مسجد کی دیواروں پر سونے کا پانی چڑھانا جائز ہے مگر خلافِ اولیٰ ہے۔ (عالمگیری ج ۶ ص ۲۱۴)

مسجد کے قبلہ میں حمام (غسل خانہ) مخرج، قبر اور وضو خانہ مکروہ ہے مگر یہ کہ قبلہ میں دیوار ہو جو اس کو سامنے سے چھپا دے اور وہ پشت پر پڑ جائے تو مضائقہ نہیں۔ (ایضاً)

مسجد کے قبلہ میں تیر اندازی کی مشق مکروہ ہے، ہاں عیدگاہ وغیرہ میں مکروہ نہیں۔ (ایضاً)

اگر موقوفہ گھر سے مسجد میں داخل ہونے کا کوئی راستہ ہے امام مسجد اس راستہ سے آسکتا ہے۔ (ایضاً)

موذن کے لئے جائز ہے کہ مسجد کے موقوفہ کمرہ میں رہے۔ (ایضاً)

مسجد سے متصل امام مسجد کا کوئی اپنا مملوکہ گھر ہے یا کرایہ کا اور وہ یہ چاہے کہ اس سے آنے کے لئے مسجد کی دیوار میں راستہ کھولے تو اس

کی اس کو اجازت نہیں ہے۔ (عالمگیری ج ۶ ص۲۱۴)

مسجد میں درس وتدریس جائز ہے اگرچہ اس کے بوریئے اور اس کی چٹائیاں استعمال میں ہوں۔ (ایضاً)

قیم مسجد نے اگر کسی مصلحت اور مسجد کی اچھائی کے لئے مسجد کے فناء (سامنے کی باہر زمین) میں تجارت کی اجازت دیدی تو جواز کی امید کی جاتی ہے۔ (ایضاً)

فناء مسجد وہ ہے جو مسجد کی چھت کا سایہ ہو اور وہ عام راستہ نہ ہو۔ (ایضاً)

مسجد کے قیم کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے یا امام کے نفع کے لئے فناء مسجد میں کرسی تخت بچھا کر کرایہ وصول کرے۔ (ایضاً)

ایک مسجد کو اہلِ محلہ نے (کسی شرعی مجبوری کی وجہ سے) دیوار دے کر دو کر دیا اور ہر ایک کے لئے الگ امام مقرر کر دیا مگر مؤذن ایک ہی رکھا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اولیٰ یہ ہے کہ مؤذن بھی دو ہوں گو اہلِ محلہ کا یہ فعل (ایک مسجد کی دو) بُرا ہے۔ (ایضاً ج ۶ ص۲۱۵)

جماعت بڑھانے کے لئے اہلِ محلہ کو اختیار ہے کہ دو مستقل مسجدوں کو ایک کر دیں۔ (ایضاً)

دو مسجدوں کو ایک کرنا تذکیر و تدریس کے لئے جائز نہیں ہے گو یہ کام مسجد میں جائز ہیں۔ (ایضاً)

اخراجِ ریح مسجد میں نہ ہو، خروجِ ریح کے وقت ادب یہ ہے کہ مسجد سے نکل جائے۔ (ایضاً)

بے وضو مسجد میں داخل ہونا جائز ہے۔ (ایضاً)

داخلِ محراب کا حکم مسجد کا ہے۔ (عالمگیری ج ۶ ص۲۱۵)

کوئی آرہا تھا، راستہ میں اس کو سخت سردی لگ گئی جس سے ہلاکت کا اندیشہ ہوگیا، وہ مسجد میں چلا آیا اور محسوس کیا کہ آگ جلا کر گرمی حاصل نہ کی گئی تو جان یا عضو کا خطرہ ہے تو ایسی حالت میں وہ مسجد کی لکڑی جلا سکتا ہے، کسی دوسرے کی ہو تو اسے بھی جلا سکتا ہے۔ دونوں کی موجودگی میں مسجد کی لکڑی جلانا اچھا ہے۔ (ایضاً)

فتنۂ عامہ کے خطرہ سے غلہ اور گھر کے دوسرے سامان کا مسجد میں بند کرنا جائز ہے۔ (ایضاً)

مسجد میں بیٹھ کر تعویذ بیچنا جس میں توریت، انجیل یا قرآن پاک کی آیتیں لکھی ہوں جائز نہیں ہے۔ (ایضاً)

کسی نے مسجد سے گذرنے کی نیت کی اور داخل ہو کر وسط میں پہنچ گیا، پھر اس نے ندامت محسوس کی تو اس کو چاہیئے کہ دو رکعت نماز پڑھے پھر نکلے، اگر ناپاک تھا تو فوراً نکل آئے۔ (ایضاً)

مسجد میں تنگی پیدا ہو جائے تو لوگوں کو سمٹ کر بیٹھنے کے لئے کہنا اور ان کا سمٹ کر بیٹھنا جائز ہے۔ (ایضاً)

سخت گرمی کی وجہ سے مسجد کی چھت پر جماعت پڑھنا مکروہ ہے، البتہ نیچے گنجائش باقی نہ رہے تو چھت پر جا کر اقتدار کر سکتا ہے۔

(ایضاً)

وقف کی آمدنی سے اذان کے لئے مینار اس وقت بنانا جائز ہے جب ایسا کرنا ضروری ہو مثلاً یہ کہ اہلِ محلہ کو آواز نہ پہنچتی ہو، ورنہ جائز نہیں۔ (ایضاً)

ستونوں پر لپیٹنے کے لئے کپڑے خریدنا متولی کے لئے جائز نہیں ہے، ہاں اگر وقف میں اس کی صراحت ہو یا وہاں یہ رائج اور دستور ہو تو جائز ہے۔ (عالمگیری ج ۶ ص۲۱۵)

طالب العلم اپنی کتابوں میں مسجد کی گھاس لے کر نشان لگائے تو یہ معاف ہے۔ (عالمگیری ج ۶ ص۲۱۶)

نماز کے بعد مسجد کا چراغ جلتا ہو تو اس کی روشنی میں درس و تدریس تہائی رات تک جائز ہے، اس سے زیادہ مسجد کا چراغ پڑھنے پڑھانے کے لئے جلانا درست نہیں۔ (بحرالرائق ج ۵ ص۲۵)

تعمیر مسجد کے لئے جمع شدہ روپے میں سے اگر کسی نے ادا کرنے کی امید پر اپنے کام میں خرچ کر دیا جو اس کو نہ کرنا چاہئے تھا، اب اس کو چاہئے کہ اپنے کسی ساتھی کو خبر کر کے جو جانتا تھا ادا کر دے، اور اگر خاموشی سے اس نے مسجد کا مال اپنے کام میں خرچ کیا تھا تو قاضی کو اطلاع دے کر ادا کر دے اور قاضی نہ ہو تو یوں بھی ادا کر دے تو فِیمَا بَینَہٗ وَبَینَ اللہ بری الذمہ ہو جائے گا۔ (بحرالرائق ج ۵ ص۲۵۱)

بنی ہوئی مسجد توڑ کر مضبوط و مستحکم بنانا اہلِ محلہ کے لئے اس وقت جائز ہے جب بانیٔ مسجد اہلِ محلہ ہی میں سے ہو، ورنہ نہیں۔ (ایضاً)

کافر اور ذمی مسجدِ حرام، بیت المقدس اور دوسری تمام مسجدوں کے ضروری کام کے لئے داخل ہو سکتا ہے، البتہ بغیر طہارت داخل ہونا مکروہ ہے۔ (ایضاً)

رمضان میں موم بتی جو جل کر بچ جائے وہ دینے والے کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں لے سکتا چاہے وہ امام ہو، چاہے موذن، البتہ یہی

دستور اور رواج ہو تو مضائقہ نہیں۔ (بحرالرائق ج ۵ ص ۲۵۱)

تعمیر مسجد کے ساتھ اس کی چھت پر امام کے لئے حجرہ بنانے میں حرج نہیں ہے۔ (ایضاً)

مسجد میں بغیر طہارت داخل ہونا مکروہ ہے۔ (البحرالرائق ۵/۲۵۱)

مسجد کی دیوار کے سہارے جو گھر کھڑا کرے اس کا ڈھا دینا واجب ہے، کرایہ اور اُجرت قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ (بحر ج ۵ ص ۲۵۱)

مسجد میں جنازہ کی نماز مکروہ ہے۔ (شرح سفرالسعادات)

مسجد کے اوقاف سے مدرسہ میں خرچ کرنا درست نہیں ہے۔

(فتاویٰ عبدالحیٔ ج ۲ ص ۱۳۶)

امام و مؤذن کی تقرری و انتخاب میں اگر بانیٔ مسجد اور اہلِ محلہ میں اختلاف ہو جائے تو اگر اہلِ محلہ کا منتخب کردہ امام و مؤذن بانیِ مسجد کے منتخب کردہ امام و مؤذن سے بہتر ہو تو اسی کو چنا جائے گا، کیوں کہ اہلِ محلہ ہی کو امام و مؤذن کا نفع و ضرر ہے۔ (کبیریؔ ص ۵۱۷)

مسجد کے لئے تیل اور چٹائی دونوں کے خریدنے کا ثواب برابر ہے ہاں ان میں جس کی مسجد کو زیادہ ضرورت ہے اس کا خریدنا زیادہ اچھا ہے۔ (ایضاً)

اپنی مسجد میں جماعت چھوٹ گئی اس لئے جماعت کی اُمید پر دوسری مسجد میں گیا۔ اس کا یہ فعل افضل ہے مگر مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی، اور مسجدِ اقصیٰ بہرحال خود افضل ہیں (یعنی ان کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں نہ جائیں گے۔)

(کبیری ص ۵۶۹)

اپنی مسجد چھوڑ کر جماعت کے لئے گیا مگر وہاں بھی جماعت نہ ملی

عہ اس کتاب کا نام "غنیۃ المستملی" ہے مگر مشہور اہلِ علم میں یہ کبیری کے نام سے ہے ۱۲۔

تو پھر اپنی ہی مسجد افضل ہے۔ (ایضاً)

مؤذن نے اذان دی مگر کوئی دوسرا نہ آیا کہ جماعت ہو، ایسی حالت میں مؤذن جماعت کے لئے اپنی مسجد چھوڑ کر دوسری مسجد میں نہ جائے گا۔ بلکہ تنہا بھی پڑھنا پڑے تو بھی اپنی ہی مسجد میں وہ نماز ادا کرے۔ (ایضاً)

اذان ہوئی، نمازی آئے مگر امام نہ آیا تو ان ہی میں سے ایک شخص امامت کرے گا۔ یہ لوگ امام کے نہ آنے کی وجہ سے جماعت کے لئے دوسری مسجد میں نہیں جائیں گے۔ (ایضاً)

اپنی مسجد میں کسی کی تکبیر اولیٰ یا ایک دو رکعت چھوٹ جائے اور دوسری مسجد میں اس کو ان کے پالینے کی اُمید ہو تو بھی ان کو اجازت نہیں ہے کہ اپنی مسجد چھوڑ کر دوسری مسجد میں جائیں۔ اگر جماعت کا کچھ حصّہ بھی اپنی مسجد میں مل گیا تو اس نے فضیلت پالی۔ (ایضاً)

اپنے محلہ کی مسجد کا امام جب زانی یا سود خوار ہو تو ایسی حالت میں اپنی مسجد چھوڑ کر دوسری مسجد میں جا سکتا ہے۔ یا اسی طرح کی اور کوئی ناپسندیدہ عادت یا عیب اس امام میں ہے تو بھی دوسری مسجد میں جا سکتا ہے (یہ عیب امام کا ایسا ہو جو شرعاً بھی ناگواری کا باعث ہو) متولی کا فرض ہے ایسے امام کو علیٰحدہ کردے اس لئے کہ اس کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔ (کبیری ص۵۶۹)

ہر طرح کی بدبو سے مسجد کو محفوظ رکھنا واجب ہے۔ (ایضاً)

اگر دفعِ فساد کے لئے غیر مقلدین نے دوسری مسجد بنوالی تو توڑنا درست نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ مسجد ضرار کے حکم میں نہیں ہے۔ ہاں اگر مقصود تفریق و فساد ہو تو وہ ضرار کے حکم میں ہوگی۔ (فتاویٰ عبدالحی ج۲ ص۱۵۹)

تاڑی پی کر مسجد جانا گو نشہ نہ ہو ممنوع ہے اور ایسے شخص کو مسجد سے

نکلوا دینا درست ہے۔ (فتاویٰ عبدالحی ج ۲ ص۱۷۶)

مسجد کے نیچے یا اوپر دوکان بنوانا اگر مسجد پر وقف ہو اور مسجد بنانے کے ساتھ ہی بنائی گئی ہو تو جائز ہے۔ مسجد تیار ہونے کے بعد کوئی مسجد کے نیچے یا اوپر دوکان وغیرہ نہیں بنوا سکتا (ایضاً ۲ ص۳۲۱) مگر علماءِ دیوبند تعمیر مسجد کے ساتھ بھی مسجد کے نیچے یا اُوپر دوکان بنانے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کتابوں میں صراحت ہے کہ مسجد کی جگہ تحت الثریٰ سے لے کر آسمان تک مسجد کے حکم میں ہے۔ پھر ایسا کرنا کیسے جائز ہوگا؟

(عزیز الفتاویٰ ج ص۲۹۲)

بھنگی کی اجرت مسجد میں لگانا جائز نہیں ہوگا، حدیث "کسب الحجام خبیث" وغیرہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسا کاروبار جس میں تلبس واختلاط نجاسات کے ساتھ ہو مکروہ ہے اور اجرت اس کی خالی خباثت سے نہیں ہے۔ (فتاویٰ عبدالحیٰ ج ۲ ص۲۵۷)

مسجد میں اگر کوئی قبر ہو تو وہ قبر جس مقتدی کے آگے یا دائیں بائیں پڑے گی اس کی نماز مکروہ ہوگی۔ (فتاویٰ عبدالحیٰ ج ۲ ص۳۹۴)

زانیہ قرض لے کر مسجد بنائے اور اپنے مالِ مکسوبہ سے ادا کرے تو مسجد، مسجد کہلائے گی اور قرض ادا ہو جائے گا۔ (فتاویٰ عبدالحی ج ص۴۰)

سفر سے واپسی میں مسجد میں اترے اور دو رکعت نماز پڑھے۔

(کبیری ص۴۰۱)

بانی مسجد مرمت، عمارت، فرش، چٹائی، قندیل، اذان، اقامت اور امامت کا زیادہ حقدار ہے، ایسی ہی بانی کی اولاد اور اس کا خاندان اس کے مرنے کے بعد۔ (کبیری ص۵۷۵)

بانی کو یہ حق صلاحیّت کی شرط کے ساتھ ہے ورنہ اس کی رائے کو دخل نہ ہوگا۔ (عالمگیری ج ۱ ص۲)

حقّہ پی کر مسجد جانا یا تلاوتِ کلام پاک کرنا مکروہ تحریمی ہے اسی طرح کچّی پیاز، لہسن وغیرہ کھا کر مسجد جانا مکروہ تحریمی ہے۔ (فتاویٰ عبدالحی ۳/۱۳۲)

مسجد کی دیوار یا چھت پر تیمّم جائز ہے مگر بے ادبی سے خالی نہیں۔ (ایضاً ج ۳ ص۱۳۴)

اذان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہاتھوں کا چومنا جن لوگوں نے مستحب لکھا ہے، صحیح نہیں ہے۔ چومنے کی روایت غلط ہے۔

(ایضاً ج ۳ ص۴۲)

زکوٰۃ کا مال مسجد میں لگانا درست نہیں ہے۔ (عالمگیری ۳/۲۴۳)

مسجد میں فصد لگوانا اور اس طرح پیشاب کرنا کہ پیشاب کسی برتن میں رکھا جائے، تب بھی جائز نہیں ہے۔ (ردالمحتار ۱/۶۱۴)

مسجد کے اوپر مصلحت مسجد کے پیشِ نظر امام کے لئے حجرہ بنانا مسجد کی تعمیر کے ساتھ جائز ہے، مگر مسجد جب بن چکی تو پھر اجازت نہیں ہے۔ (ردالمحتار ج ۳ ص۵۱۴)

مسجد کا کوئی حصّہ نہ تو حصولِ آمدنی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے اور نہ مسکن۔ (ردالمحتار ج ۳ ص۵۱۲)

اجرت دے کر بھی کوئی چاہے کہ مسجد کی دیوار سے فائدہ اٹھائے تو یہ جائز نہیں ہے خواہ کوئی بھی فائدہ اٹھانے والا ہو۔ (ایضاً ج ۱۰ ص۵۱۳)

مسجد کی چھت پر وطی، پیشاب اور پاخانہ کرنا مکروہ تحریمی ہے

(ردالمحتار ج ۱ ص۶۱۴)

بغیر عذر شرعی مسجد کو راستہ بنانا مکروہ تحریمی ہے۔ البتہ بوقتِ مجبوری و ضرورتِ شدید گزرنا جائز ہے مگر اس کی عادت قریب بہ فسق ہے۔ (ردالمحتار ج ا ص۶۱۴)

جن مصلّوں پر اللہ تعالیٰ کے نام ہوں ان کا بچھانا اور استعمال کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ (عالمگیری ج ا ص۷)

مسجد میں نجاست داخل کرنا حرام ہے، ایسے ہی جس شخص کے بدن پر نجاست لگی ہو اس کا مسجد میں داخل ہونا حرام ہے۔ (ردالمحتار ا/۶۱۴)

مسجد میں جُنبی (ناپاک مَرد) حائضہ اور نفاس والی عورت کا داخل ہونا حرام ہے۔ (عالمگیری ج ا ص۷)

مسجد کے اندر کنواں کھودنا منع ہے، ہاں پہلے سے ہو تو چھوڑ دیا جائے گا (مسجد سے باہر ضرورت کے لئے کھودنا چاہئے۔) (ایضاً)

مسجد کے اندر کا مطلب ہے وہ جگہ جو نماز کے لئے مخصوص ہوتی ہے، جیسے مسجد کا اندرونی حصّہ اور صحن، مسجد کے احاطہ کے اندر ان کے علاوہ جو جگہ ہے وہ بھی باہر کا حصّہ کہا جاتا ہے۔ (مؤلّف)

مسجد میں ناپاک مٹّی لگانا اور اس کو ناپاک پانی مٹّی سے لیپنا جائز نہیں ہے۔ (ردالمحتار ج ا ص۶۱۴)

مسجد میں خرید و فروخت جائز نہیں ہے، معتکف کو صرف بھاؤ کرنے کی اجازت ہے مگر بیع نہ ہو۔ (ایضاً)

مسجد کا چراغ گھر میں لانا جائز نہیں ہے، البتہ اپنا چراغ مسجد میں لیجانا جائز ہے۔ (عالمگیری ج ا ص۷)

مسجد کا چراغ تہائی رات تک جلتا چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس سے

زیادہ نہیں چھوڑا جائے گا مگر اس وقت جب کہ واقف نے اس کا حکم دیا ہو، یا وہاں کا یہی دستور قدیمی ہو۔ (ایضاً)

کوئی اگر مسجد میں کسی خاص جگہ آکر بیٹھتا ہے، اس جگہ دوسرا آکر بیٹھ گیا تو اس کو وہ اٹھا نہیں سکتا۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۶۲۳)

ایک شخص مسجد میں آکر بیٹھا اور پھر وہ کسی کام سے اٹھا مگر اپنی جگہ اپنا کپڑا چھوڑ گیا، تو اب کوئی دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔ (ایضاً)

ایسی تصویر اور طغرے کا مسجد میں آویزاں کرنا مباح ہے جس میں شرعی اعتبار سے کوئی قابلِ اعتراض پہلو نہ ہو، لیکن قبلہ کی دیوار پر آویزاں کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے، یا اس قدر اوپر لگائیں کہ نماز کی حالت میں کسی نمازی کی نگاہ اس پر نہ پڑے ـــــ البحرالرائق جلد ۲ صفحہ ۲۵۳ میں ہے: "بہتر ہے کہ مسجد کی دیواریں صاف اور نقش و نگار سے پاک ہوں اور اس پر کسی قسم کی تحریر نہ ہو، دیوار پر نقش و نگار بنانا یا لکھنا مکروہ ہے۔"

مسجد میں جوتا پہن کر داخل ہونا جس سے تلویثِ مسجد کا اندیشہ ہو جائز نہیں ہے۔ (ایضاً ص ۶۱۵)

غیبت کرنے والے اور چغلخور کو دخولِ مسجد سے روکنا جائز ہے۔

ـــــــــــــــــ(ردالمحتار ج ۱ ص ۶۱۹)

دنیاوی بات کے لئے مسجد میں بیٹھنا یا بیٹھے ہوئے دنیا کی باتیں کرنا مکروہ ہے۔ (ایضاً)

گندے مچھیرے کا مسجد میں داخل ہونا مکروہ ہے۔ اسی طرح جذام والے کا، ان کو دخولِ مسجد سے روکنا بھی جائز ہے۔ (فتح الباری لابن حجر ج ۲ ص ۲۳۴)

مسجد میں کلی کرنا اور وضو کرنا مکروہ ہے مگر یہ کہ اس کے لئے کوئی مخصوص جگہ بنی ہو، جیسے وضو خانہ تو مضائقہ نہیں۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۶۰)

ابابیل یا چمگادڑ اپنی بیٹوں (پائخانہ) سے جب مسجد کو گندہ کر رہی ہوں تو ان کو بچّوں سمیت نکال پھینکنا جائز ہے۔ (عالمگیری ج ۶ ۲۱۵)

مسجد میں درخت لگانا مکروہ ہے، مگر مسجد جب مرطوب ہو تو اس کے دفعیہ کے لئے لگانا جائز ہے۔ (عالمگیری ج ۱ ۷)

پاگل اور بچہ کا مسجد میں داخل ہونا اگر تلویث کا گمان غالب ہو تو حرام ورنہ مکروہ تنزیہی۔ (رد المحتار ج ۱ ۶۱۵)

مسجد کو ہر گھن والی چیز سے پاک وصاف رکھنا واجب ہے۔ (رد المحتار ج ۱ ۶۱۸)

مسجد میں سلائی کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر وہ مسجد کی نگرانی کے لئے بیٹھا ہوا اور اس سلسلہ میں سلائی بھی کرتا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

(عالمگیری ج ۱ ۷)

دیوار، فرش اور مسجد کی چٹائی پر تھوکنا یا بلغم ڈالنا جائز نہیں ہے۔

(رد المحتار ج ۱ ۶۱)

اگر حالتِ نماز میں تھوکنے کی مجبوری ہو تو چٹائی پر تھوکنا اس سے اچھا ہے کہ کوئی چٹائی کے نیچے تھوکے، کیوں کہ نیچے کا حصہ جزو مسجد ہے، اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے کپڑے کے کنارے پر تھوک کر مل دے۔ (ایضاً)

بچھی ہوئی مٹی فرشِ مسجد کے حکم میں ہے۔ (ایضاً)

مسجد میں گھاس جمع ہو تو اس میں پاؤں پوچھنا جائز ہے اور بعضوں نے مکروہ کہا ہے۔ (عالمگیری ج ۶ ۲۱۵)

مسجد میں ناپاک تیل کی روشنی کرنا مکروہ ہے۔ (رد المحتار ج ۱ ۶۱۴)

مسجد میں مٹی کا تیل یا ایسا تیل جلانا جس سے بدبو پھیلے، ممنوع ہے۔

(تتاذی الملائکۃ مما یتاذی منہ الانس) (بخاری)

مسجد کے چراغ کی روشنی میں نماز سے پہلے اور بعد بھی درس تدریس جائز ہے جس سے نمازی کا حرج نہ ہو۔ (ردالمحتار)

مسجد میں ناپاک گارے کی استرکاری مکروہ ہے۔ (ردالمحتار ار۶۱۴)

اُجرت پر کتابت کرنے والے کاتب کے لئے مسجد میں کتابت مکروہ ہے، ہاں بغیر اجرت یا اپنے لئے لکھے تو جائز ہے۔ (عالمگیری ج۱ صنے)

مسجد کی دیواروں اور محراب پر لکھنا قرآن پاک کی آیتوں کا مکروہ تنزیہی ہے، کیوں کہ مسجد کے منہدم ہونے کی صورت میں توہین کا اندیشہ ہے۔ (ایضاً) کتبوں یا رقعوں کا مسجد کے دروازہ پر لٹکانا یا چپکانا مکروہ ہے۔ (ایضاً)

مسجد میں کنواں ہو اور کوئی دوسرا راستہ نہ ہو تو بوقتِ ضرورت و مجبوری مسجد سے گذر سکتا ہے یوں نہیں۔ (ردالمحتار ج ۱ ص۶۱۴)

مسجد کا سامان رکھنے کے لئے مسجد کے ساتھ حجرہ بنانا جائز ہے۔

(عالمگیری ج ۱ صنے)

جو معلم اجرت پر بچوں کو پڑھاتا ہو اور وہ گرمی یا کسی اور مجبوری سے مسجد میں بیٹھے تو مکروہ نہیں ہے۔ (ایضاً) اور بعض لوگوں نے کاتب کی طرح مکروہ کہا ہے۔ (ایضاً)

مسجد میں نماز کے علاوہ دوسرے دینی کام کے لئے بیٹھنا جائز ہے لیکن اگر اس کی وجہ سے کوئی چیز غائب ہوگی تو تاوان دینا ہوگا۔

(ایضاً)

مسجد میں کسی ایک جگہ کو اپنے لئے مخصوص کر لینا مکروہ ہے۔

(ردالمحتار ج ۱ ص۶۲)

مسجد میں کوئی نمازی کہیں بیٹھ جائے تو بغیر ضرورتِ شرعی اس کو چھیڑنا اور وہاں سے اٹھانا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر عام نمازیوں کو اس سے تکلیف ہو تو اسے اٹھایا جا سکتا ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ صفحہ ۶۲)

بصورتِ تنگی غیر محلہ والے کو مسجد میں آنے سے روکا جا سکتا ہے، کسی کے بیٹھنے سے صف میں خلل ہو تو نمازیوں کو حق ہے کہ اسے اٹھا دے۔

(ردالمحتار ج ۱ صفحہ ۶۲)

اگر مسجد میں تنگی ہو جائے تو عام نمازیوں سے چاہے وہ ذکر و شغل میں مصروف ہوں، سمٹ کر بیٹھنے کی فہمائش کرنا جائز ہے۔ (ایضاً)

مسجد میں نکاح کرنا سنت ہے۔ (ردالمحتار ج ۱ صفحہ ۶۱۹)

مسجد میں نمازی کی گردن پھاندنا مکروہ ہے۔ (ایضاً)

مسجد میں پاک آدمی کا بھی غسل اور وضو کرنا مکروہ ہے۔ (ردالمحتار ۱/۶۱۵)

آج کل مسجد میں پاک و صاف جوتا پہننا بھی بے ادبی ہے۔ (ایضاً)

نمازیوں کے لئے سایہ کے خیال سے مسجد میں درخت لگانا بشرطیکہ اس سے تنگی یا صفوف میں ناہمواری نہ ہو، مباح مگر خلافِ اولیٰ ہے اور اگر تنگی یا صفوف میں ناہمواری پیدا ہو یا اپنے نفع کے خیال سے لگایا جائے، یا گرجا وغیرہ سے مشابہت پیدا ہو تو ان تمام صورتوں میں مکروہ ہے۔ (ردالمحتار ج ۱)

دنیا کی باتیں مسجد میں نیکیوں کو اس طرح چبا ڈالتی ہیں جیسے چوپائے گھاس کو یا جیسے آگ لکڑی کو۔ (الکشاف ج ۱ صفحہ ۳۸۷)

دنیا کی باتوں کے لئے مسجد میں بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ (عالمگیری ۶/۲۱۵)

جو مسجد میں چوری کا عادی ہو جائے تو ضروری ہے کہ اس کو سزا دی جائے اور سخت سزا اور ساتھ ہی قید میں ڈال دیا جائے، یہاں تک کہ

وہ توبہ کرے۔ (عالمگیری ج ۳ ص ۱۰۷)

متولی واقف ہو یا کوئی اور، مگر وہ اطمینان بخش باقی نہ رہا، عاجز ہو گیا یا فاسق و فاجر تو اس کو عہدۂ تولیت سے علیحدہ کر دینا ضروری ہے۔

(درمختار بر حاشیہ ردالمحتار ج ۳ ص ۴۲۱)

متولی خائن ہو جائے تو قاضی کے لئے جائز ہے کہ اس کو معزول کر دے۔ (ایضاً)

ایسا شخص جس کو تہمت لگانے کے جرم میں حد لگائی گئی ہے مگر اَب اس نے توبہ کر لی ہے، ایسے شخص کو متولی بنانا جائز ہے۔ (ایضاً)

متولی نے اگر وقف کی کوئی چیز بیچ دی یا رہن رکھ دی تو یہ خیانت سمجھی جائے گی اور اس کو معزول کر دیا جائے گا، یا اس کا کسی ثقہ آدمی کو شریکِ کار بنا دیا جائے گا۔ (عالمگیری باب تصرف القیم)

ایک شخص کئی وقف کا متولی ہے، اگر اس سے کسی ایک وقف میں بھی خیانت ثابت ہو گئی تو اسے کل اوقاف سے معزول کر دیا جائے گا۔ (درمختار ج ۳ ص ۴۲۱)

بعض مسجدوں[عہ] میں مسجد سے علیحدہ بغل میں کمرے ہوتے ہیں جس میں بعض لوگ چھپ کر نماز پڑھتے ہیں، مسجد میں عوام سے بچنے کی غرض سے نہیں آتے۔ اس سے صفوں میں درستی نہیں رہتی ہے اس لئے یہ فعل پسندیدہ نہیں ہے اور سنتِ نبوی کے خلاف بھی ہے۔

(اصلاح المساجد للقاسمی ص ۷ و ص ۸)

خطیب کے منبر پر آنے کے بعد کسی دوسرے کام کی اجازت نہیں۔

عہ ترتیب سے فراغت کے بعد یہ کتاب "اصلاح المساجد للقاسمی" ملی، اس میں بدعات کا تذکرہ ہے بعض بدعات کا یہاں تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ منہ

جہاں خطیب کے خطبۂ اولیٰ کے بعد مؤذن "غفر اللہ لك ولوالدیك ولنا ولوالدینا والحاضرین" بلند آواز سے کہتے ہیں وہ بدعت ہے اور سنتِ نبوی کے خلاف ہے۔ (اصلاح المساجد ص۷۵)

رجب اور اس کے روزے کی فضیلت کی جو حدیث ہے وہ موضوع ہے، منبر سے اس غلط چیز کی تلقین جائز نہیں ہے۔ (ایضاً ص۷۶)

بعض جگہ رواج ہے کہ امام خطبہ سے فارغ ہوکر جب اُترتا ہے تو لوگ اس کے جسم کو ثواب کی نیت سے چھوتے ہیں اور اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، یہ سنت کے خلاف ہے اور محض بدعت ہے۔ (ایضاً ص۷۷)

تکبیر تحریمہ سے پہلے زور زور سے نیت باندھنا خلافِ سنت ہے

——— (ایضاً ص۷۹)

جماعتِ ثانی کے انتظار میں پہلی جماعت کا ترک بدعت ہے۔ (ایضاً ص۸۵) تراویح میں اس تیزی سے پڑھنا پڑھانا کہ قرآن صحت کے ساتھ نہ پڑھا جائے یا رکوع وسجود اور قعود پورے طور پر نہ ادا ہوں کسی حال میں درست نہیں۔ (ایضاً ص۹۳)

رجب کے اول جمعہ میں چراغاں کی رسم جہاں بھی ہے بدعت ہے۔

——— (ایضاً ص۱۰۵)

۱۵ ر شعبان کی شب میں مسجد میں چراغاں کرنا اور صلوٰۃ الفیہ (یعنی سو رکعت میں ہزار بار قُل ہُوَ اللہُ اَحَد پڑھنا) بدعت ہے۔ (اصلاح المساجد ص۱۰۶)

رمضان میں ضرورت سے زیادہ چراغاں کرنا اور رنگ برنگ کی بتی جلانا بدعت ہے۔ (ایضاً ص۱۰۸)

عید کے دنوں میں رات بھر چراغ جلانے کی رسم مسجدوں میں بدعت ہے۔ (ایضاً ص۱۱۱)

مسجد میں مجلسِ سماع بدعت ہے۔ (اصلاح المساجد ص۱۱۵)

مسجد میں دنیا کی بات کے لئے ٹولی ٹولی بنا کر بیٹھنا گناہ ہے۔ (ایضاً ص۱۲۴)

ماہِ صفر کے اخیر بدھ کو مغرب و عشاء کے درمیان آیاتِ سلام لکھنے کی رسم بدعت ہے۔ (ایضاً ص۱۲۵)

خطباتِ عیدین بغیر سُنے ہوئے مسجد اور عیدگاہ سے بھاگنا گناہ ہے۔ (ایضاً ص۱۳۶)

شروع سال اور اخیر سال میں امامِ مسجد کا خصوصیت سے دعا کرنا اور اس کا اہتمام بدعت ہے۔ (ایضاً ص۱۴۲)

اقامت میں "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کے پہلے لفظ "سیدنا" بڑھانا بدعت ہے۔ اجتناب بہت ضروری ہے۔ (ایضاً ص۱۵۱)

بعض مسجدوں میں امام کے سلام پھیرنے کے بعد نمازِ عصر میں مؤذن اور مقتدی زور زور سے آمین کہتے ہیں اور دعائیں پڑھتے ہیں، مؤذن اور مقتدی کا یہ رسمی فعل خلافِ سنت ہے۔ فرض کے بعد آہستہ آہستہ دعائے ماثورہ پڑھنا چاہیئے۔ آواز اس قدر بلند نہ کرنی چاہیئے کہ جس سے دوسرے نمازیوں کا حرج ہو۔ (ایضاً ص۱۵۴)

بعض جگہ منبر کے سامنے والے دروازہ پر مؤذن و لوگ جمع ہوتے ہیں اور امام (خطیب) جب منبر پر چڑھنے لگتا ہے تو خوب زور زور سے درود پڑھتے ہیں اور اسی طرح امام جب منبر پر سے اُترتا ہے تو چیخ چیخ کر درود پڑھتے ہیں اور "وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ" پر آواز اور تیز کر دیتے ہیں، یہ بھی بدعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطیب کے نکلنے کے بعد تمام کاموں کو لغو قرار دیا ہے۔ (ایضاً ص۱۵۶)

بڑی جماعت میں جہاں اخیر تک امام کی آواز نہیں پہنچتی ہے چند مکبّر ہوتے ہیں، مگر ان کا ضرورت سے زیادہ ہونا اور ضرورت سے زیادہ چیخنا اور تکبیر اس طرح کہنا کہ اس میں تبدیلی ہو جائے، ممنوع ہے۔ امام کی آواز پہنچ رہی ہو تو اس کی مطلق ضرورت نہیں۔ (اصلاح المساجد ص۱۵۷)

بعض مسجدوں میں یہ رواج ہے کہ رمضان کی اخیر پانچ یا تین رات جب باقی رہتی ہیں تو مؤذن اور کچھ دوسرے لوگ وتر کے سلام کے فوراً بعد زور زور سے رمضان کا منظوم مرثیہ پڑھتے ہیں جس کے تماشا بیں محلہ کی تمام عورتیں اور بچے ہوتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں آدابِ مسجد کے خلاف ہیں، اس سے بچنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ (ایضاً ص۱۶۱)

اسی طرح جہاں امام رمضان کے اخیر جمعہ میں الوداع پڑھتے ہیں اور فطرہ کی تلقین ہضم کر جاتے ہیں، خلافِ ادب ہے۔ (ایضاً ص۱۶۲)

مسجد میں میت پر مرثیہ پڑھنے کی رسم بدعت ہے۔ (ایضاً ص۱۷۹)

مصیبت کی وجہ سے مسجد میں بیٹھنا مکروہ ہے۔ (ایضاً ص۱۸۰)

مسجد میں مُردہ کا دفن کرنا، یا قبر کو مسجد بنانا جائز نہیں ہے۔ (ایضاً ص۱۸۱)

عاشوراء محرم کے جمعہ میں امام کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ کربلا بیان کرنا کہ لوگ روئیں اور سوگ کریں، خلافِ سنت ہے رونا پیٹنا رافضیوں کا شعار ہے۔ اجتناب ضروری ہے (ایضاً ص۱۸۳) (البتہ شہادت اور ان کی زندگی کے صحیح واقعات بیان کرنا کہ مسلمانوں میں شوقِ شہادت پیدا ہو اور ان کی زندگی سے سبق حاصل کریں کوئی مضائقہ نہیں)

کام کاج چھوڑ کر مسجد میں بیٹھنا اور دوسروں کے ٹکڑوں پر زندگی گذارنا اسلامی حمیت کے خلاف ہے۔ (ایضاً ص۱۸۹)

طاعون یا کسی دوسری وبا کے لئے خاص طور سے مسجد میں جمع ہو کر دعا کرنے کا ثبوت نہیں ہے، اس لئے یہ فعل بدعت ہے۔ (اصلاح المساجد ص۲۱۲)

پیشاب کے بعد کلوخ لے کر مسجد کے احاطہ میں لوگوں کے سامنے چلنا اور دائیں بائیں مڑنا بے ادبی ہے، یہ فعل بے حیائی ہے، دوسرے ستر کھلنے کا اس میں گمانِ غالب ہے۔ (ایضاً ص۲۳۷)

مسجد میں یا اس کے کسی گوشہ میں تعزیہ، عَلَم (جھنڈا) اور اسی طرح کی دوسری چیز رکھنا بدعت ہے۔ اس سے بچنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ (ایضاً ص۲۱۴)

مسجد میں قبلہ رخ بیٹھنا مستحب ہے، قبلہ کی طرف پیر پھیلانا مکروہ ہے۔ (ایضاً ص۳۰۲)

کوئی سونے یا چاندی کی قندیل مسجد کی روشنی کے لئے وقف کرے تو یہ وقف درست نہیں ہے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اسے توڑ کر مسجد کی ضرورت میں اس کی قیمت خرچ کی جائے گی۔ (ایضاً ص۳۰۹)

وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

فقہاء کہتے ہیں کہ مساجد کی تعمیر میں خواہ کوئی بھی مسجد ہو غیر مسلم معماروں سے کام لینا جائز ہے جو پہلے نقل ہو چکا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

ولا بأس ان یدخل الکافر واھل الذمۃ المسجد الحرام وبیت المقدس وسائر المساجد لمصالح المساجد وغیرھا من المھمات (البحرالرائق ۵/۲۵۱)	کافروں اور ذمیوں کو مصالح مسجد اور مسجد کے دوسرے اہم کاموں کے لئے مسجد حرام، بیت المقدس اور دوسری مسجدوں میں داخل کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔

دوسری مسجدوں کے ساتھ مسجد حرام کا بھی نام لیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآنِ پاک میں آیتِ کریمہ میں صراحت ہے کہ :

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔	بلاشبہ مشرک نجس ہیں، پس وہ مسجدِ حرام کے قریب اس سال کے بعد نہ آئیں۔

یعنی ان کو مسجدِ حرام میں داخلہ کی اجازت نہیں ہے، بظاہر فقہاء کا یہ قول اس آیت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے کفار بھی حج و عمرہ اپنے طور پر کرتے تھے، اس آیت کا منشاء یہ ہے کہ آئندہ ان کو اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ چنانچہ حدیثِ نبوی ہے :

الا لایحجن بعد العام مشرک۔	سن لیں! اس سال کے بعد کوئی مشرک ہرگز حج نہیں کر سکے گا۔

٭ ٭ ٭ ٭

دوسری حدیث ہے :-

لایدخل المسجد الحرام مشرك بعد عامی ھٰذا ابدا الّا اھل العھد وخدمھم۔ (درمنثور ۳/۲۲۶)	میرے اس سال کے بعد کوئی مشرک کبھی مسجدِ حرام میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جن سے معاہدہ ہے، وہ اور ان کے خدام آسکیں گے۔

اس حدیث میں ان کافروں کے داخلہ کی اجازت ہے جن سے معاہدہ ہوچکا ہے، جس کا حاصل ہی ہے کہ اجازت لے کر عارضی طور پر وہ آسکتے ہیں، البتہ بطور استیلاء اور شہری بن کر نہیں آسکتے ہیں۔

اس آیت کے فوائد میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں :

"جب حق تعالیٰ نے شرک کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کا صدر مقام (مکہ معظمہ) فتح کرادیا اور قبائلِ عرب جوق درجوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تب ۹ھ میں یہ اعلان کرایا گیا کہ آئندہ کوئی مشرک یا کافر مسجد حرام میں داخل نہ ہو بلکہ اس کے نزدیک یعنی مسجدِ حرام کے قریب بھی نہ آنے پائے، کیوں کہ ان کے قلوب شرک وکفر کی نجاست سے اس قدر پلید اور گندے ہیں کہ اس سب سے بڑے مقدس مقام اور مرکزِ توحید وایمان میں داخل ہونے کے لائق نہیں۔ اس کے بعد صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے جزیرۃ العرب سے مشرکین اور یہود ونصاریٰ سب کے نکال دینے کا حکم دیا، چنانچہ حضورؐ کی آخری وصیت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ حکم عملاً نافذ ہوا۔ اب بطورِ استیلاء اور توطن کفار کے وہاں رہنے پر مسلمانوں کو رضامند ہونا جائز نہیں۔ ہاں حنفیہ کے نزدیک کوئی کافر مسافرانہ عارضی طور پر امام کی اجازت سے وہاں جاسکتا ہے، بشرطیکہ امام اتنی اجازت دینا خلافِ

مصلحت نہ سمجھے، باقی عمرہ اور حج کی غرض سے داخل ہونے کی کسی کافر کو اجازت نہیں کما ورد فی الحدیث الا لایحجن بعد العام مشرك "

(فوائدِ عثمانی، صفحہ ۲۵۳)

مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں :۔

"امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک آیت میں مشرکین کو مسجد حرام کے قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ سال سے ان کو مشرکانہ طرز پر حج و عمرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی اور دلیل یہ ہے کہ جس وقت موسم حج میں حضرت علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ اعلانِ برارت کر دیا گیا تو اس میں اعلان اسی کا تھا کہ " لایحجن بعد العام مشرك " جس میں ظاہر کر دیا گیا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا۔ اس لئے اس آیت میں فلا یقربوا المسجد الحرام کے معنیٰ بھی اس اعلان کے مطابق یہی ہیں کہ ان کو حج و عمرہ کی ممانعت کر دی گئی، البتہ کسی ضرورت سے باجازت امیر المؤمنین داخل ہو سکتے ہیں، وفد ثقیف کا واقعہ اس کا شاہد ہے کہ فتح مکہ کے بعد ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا، حالانکہ یہ لوگ اس وقت کافر تھے۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض بھی کیا یا رسول اللہ! یہ نجس قوم ہے، تو آپؐ نے فرمایا کہ مسجد کی زمین پر ان لوگوں کی نجاست کا کوئی اثر نہیں پڑتا "

(معارف القرآن ص۳۵۵ بحوالہ جصاص)

مشرکوں کے مسجد میں داخل ہونے کی بحث " نظامِ مساجد " میں پہلے بھی آچکی ہے، اسے بھی بغور پڑھ لیا جائے۔ امید ہے اس کے بعد کوئی اشکال باقی نہ رہے گا۔

مسجد کے نیچے اور اوپر مکان و دکان بنانے کا مسئلہ

(از عارف باللہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ)

آج کل مسجد کے نیچے اور اوپر مکان و دکان بنا کر ذریعۂ آمدنی بنانے کا ذہن عام ہوتا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کے پہلے مفتی عارف باللہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ پیشِ خدمت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے درست قرار نہیں دیتے ہیں ——— ظفیر

سوال ۱۲۷۸/۸۷۸ : زید مسجد اس طرح بنانا چاہتا ہے کہ دو کانیں یا مکان بنا کر اوپر مسجد بنا دے۔ یا اول مسجد بنا کر اس کی سقف پر مکانات بنائے اور ان مکانات کو مصالح مسجد کے واسطے وقف کر دے۔ اس میں دریافت طلب چند امور ہیں:۔

(۱) ان مکانات کا حکم مسجد کا ہے یا نہیں؟

(۲) مصالح مسجد سے کیا مراد ہے، آیا کرایہ پر دینا ان مکانات کا جائز ہے یا یہ کہ ان میں سامان وغیرہ مسجد کا رہا کرے۔

(۳) ابتداء بناء میں فوق مسجد امام کے لئے مکان بنانا جائز لکھا ہے، کیوں کہ وہ مصالح مسجد میں سے ہے۔ اب امام کو وہاں پر بول و براز، اور اپنی زوجہ کے

کے ساتھ رہنا جائز ہے یا نہیں؟

(۴) ردالمحتار میں اسی مسئلہ کی فرع میں لکھا ہے: ولایجوز اخذ الاجرة منه ولا ان یجعل شیئاً منه مستقلا ولاسکنیٰ، بزازیة، اخذ اجرت کا ناجائز ہونا اسی بیت سے ہے جو حقوق مسجد امام کے واسطے بربنار مصالح مسجد جائز تھا یا اس بیت سے جو بعد تمامی مسجد فوق مسجد بنایا گیا ہے۔

(۵) بہر حال مکان تحت کا حکم بھی مثل فوق ہے یا کچھ فرق ہے؟۔

الجواب: وکرہ تحریماً الوطی فوقه والبول والتغوط لانه مسجد الیٰ عنان السماء (درمختار ۱/۴۴۱) وکذلك الی تحت الثریٰ (شامی ص۴۴۱ ج۱) پس معلوم ہوا کہ تحت یا فوق مسجد جو مکان یا دوکان ہوگی وہ بھی حکم میں مسجد کے ہے۔

(۲) مصالح سے مراد سامان مسجد کا رکھنا و تبرید ماء وغیرہ ہے۔ کرایہ پر دینا مراد نہیں، کذا فی الدرالمختار: لایجوز اخذ الاجرة منه ولا ان یجعل شیئاً منه مستقلاً ولاسکنیٰ (بزازیہ ۳/۳۷۱) وتمامه فی الشامی ۳/۳۷۱)

(۳) عبارت اسعاف جو شامی نے نقل فرمائی ہے اس بارے میں یہ ہے: وبه صرح فی الاسعاف فقال واذا کان السرداب او العلو لمصالح المسجد او کانا وقفا علیه صار مسجداً، اھ شرنبلالیة، قال فی البحر وحاصله ان شرط کونه مسجدا ان یکون سفله وعلوه مسجداً لینقطع حق العبد عنه لقوله تعالیٰ وان المساجد لله (شامی ۳/۳۷۰) پس جب کہ سفل وعلو مسجد ہوا تو بول وبراز اس میں جائز نہیں ہوسکتا۔ کما مر۔

(۴) اخذ اجرت واستقلال کا ناجائز ہونا دونوں صورتوں میں معلوم ہوتا

ہے کما ھو مقتضی الاطلاق و مقتضیٰ کونہ مسجداً من تحت الثریٰ الیٰ عنان السماء، فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۔ عزیز الرحمٰن ۔

سوال ۱۲۷۹/۷۸۳ : ۔ جواب مرسلہ آنجناب پہونچا، ایک روز میں مجموعہ فتاویٰ مولوی عبدالحی صاحب کو دیکھ رہا تھا، اتفاق سے بعینہٖ یہی مسئلہ دیکھا تو مولوی صاحب نے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور جناب نے اس کے خلاف تحریر فرمایا ہے، مجموعہ فتاویٰ ص۳۹۴ جلد ثانی ملاحظہ فرمایئے اور اس کے متعلق جو صحیح رائے ہو تحریر فرمایئے۔ نفس مسئلہ تو معلوم ہو گیا مگر مولوی عبدالحی صاحب کے فتویٰ سے خیال پیدا ہو گیا۔ اگر وہی جواب جو جناب نے تحریر فرمایا صحیح ہے تو اس کے متعلق جو مولوی عبدالحی صاحب نے تحریر فرمایا ہے صحت و سقم جو کچھ ہو اس سے مطلع فرمایئے، ورنہ جیسی رائے ہو۔

الجواب : فتاویٰ جلد دوم میں فتویٰ ۲۰۵ دیکھا گیا، روایات اس مسئلہ میں مختلف ہیں، احقر نے جو کچھ لکھا ہے احتیاط اسی میں ہے۔ اس وجہ سے ان روایات کو اختیار کیا گیا جن میں حرمتِ مسجد زیادہ تر ملحوظ رکھی گئی ہے جیسا کہ بعض روایات سے انتقال مسجد معلوم ہوتا ہے مگر دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو جگہ مسجد ہو گئی وہ مسجد ہمیشہ رہتی ہے اور یہی صحیح و احوط ہے۔ اس لئے روایات اولیٰ کی تاویل کی جاتی ہے یا اس کو متروک کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی حکم اس مسئلہ میں معلوم ہوتا ہے کہ احتیاط اسی میں ہے کہ تحت الثریٰ سے عرش تک مسجد ہی رکھی جائے اور اس کے نیچے اور اوپر کوئی ایسا فعل نہ ہو جو منافی حرمتِ مسجد کے ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب کی روایاتِ منقولہ سے انکار نہیں ہے بلکہ کلام اس میں ہے کہ جو روایات

مثبت حرمت مسجد من تحت الثریٰ الیٰ عنان السماء ہیں وہ زیادہ تر قابل و قابلِ عمل ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ حکم یعنی مسجد کا ثریٰ سے عنانِ سماء تک ہونا ہر حال میں ہے یا نہیں کہ بعض صورتوں میں مسجد کا یہ حکم ہوتا ہے اور بعض میں نہیں جیسا کہ مولانا عبدالحی صاحب کے فتویٰ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت ہے جب زیر مسجد ــ الیٰ ان قال ــ ایسی صورت میں فقہاء لکھتے ہیں کہ مسجد کے فوق و تحت السماء و ثریٰ تک سب حکم مسجد میں ہے نہ ہر صورت میں الخ۔ یہ تخصیص بالکل فقہاء کی تصریح کے اور قواعد کے خلاف معلوم ہوتی ہے کما ہو ظاہر۔ بہر حال آپ مولانا عبدالحی صاحب کے فتویٰ کو دیکھ کر کچھ تردّد نہ کریں۔ انہوں نے بعض روایات کی بناء پر ایسا خیال فرمایا اور یہ ان کی رائے ہے کہ حکم مسجد از ثریٰ تا عنان سماء کلیۃً نہیں ہے احقر کے خیال میں اس کی تصریح کہیں نہیں ملے گی، بلکہ کلام فقہاء سے یہ حکم کلّی معلوم ہوتا ہے، پس جب حکم اس کا کلی ہونا محقق ہے تو پھر کچھ شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہٗ بندہ عزیز الرحمٰن عفی عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند۔

علاوہ ازیں عالمگیری میں ہے:

قیم المسجد لایجوز لہ ان یبنی حوانیت فی حد المسجد او فی فنائہ لان المسجد اذا جعل حانوتا ومسکنا تسقط حرمتہ وھذا لایجوز	متولی مسجد کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مسجد کے حدود یا اس کی فناء میں دوکان بنائے۔ اس لئے کہ جب مسجد کے حدود اور فناء مسجد میں دوکان یا مسکن بنایا جائے گا تو پھر مسجد کی حرمت

والفناء تبع للمسجد فیکون حکمہ حکم المسجد کذا فی محیط السرخسی ....

(عالمگیری ج ۳ ص۴۶۲)

باقی نہیں رہے گی اور ایسا کام جو حرمتِ مسجد کے خلاف ہو کرنا جائز نہیں، فناءِ مسجد یعنی مسجد سے متصل جگہیں مسجد کے تابع ہوتی ہیں لہٰذا اس کا حکم وہی ہوگا جو مسجد کا حکم ہے ۔

بحر الرائق میں ہے :-

وفی المجتبیٰ لایجوز لقیم المسجد ان یبنی حوانیت فی حد المسجد اوفنائہ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۴۹ کتاب الوقف)

مجتبیٰ نامی کتاب میں ہے کہ مسجد کے ذمہ دار کے لئے مسجد یا فناءِ مسجد کی حد میں دوکان بنانا جائز نہیں ہے ۔

ان جزئیات سے بھی حضرت مفتی علّام کی رائے کی تائید ہوتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسجد کے نیچے یا اوپر دوکان بنانا جائز نہیں ہے، گو ان دوکانوں کی آمدنی مسجد پر وقف ہو۔ اور بنیادی بات وہی ہے جس کے تمام فقہاء قائل ہیں کہ جس جگہ مسجد بنتی ہے وہ جگہ تحت الثریٰ سے لے کر عنان السماء تک مسجد کے حکم میں ہوتی ہے۔ اگر اس کے نیچے یا اوپر دوکان بنانے کو جائز قرار دیدیا جائے تو وہ کلّی قاعدہ باقی نہیں رہتا ہے (۱)

---

(۱) مسجد کے اوپر یا نیچے مکان یا دکان بنانے کے سلسلہ میں ایک رائے آپ کے سامنے آئی جس میں اسے غیر درست قرار دیا ہے، جب کہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ نے اپنی کتاب "مباحثِ فقہیہ" میں تفصیلی و تحقیقی بحث کے بعد بعض شرطوں کے ساتھ اسے درست قرار دیا ہے۔ البتہ عامۃ المسلمین اس طرح کے مسئلہ میں کسی مستند عالمِ دین اور صاحبِ افتاء سے مکمل صورتِ حال کو پیش کر کے فتویٰ طلب کریں اور جو جواب ملے اس پر عمل پیرا ہوں۔ (ناشر)

یہ کتاب

"اپنی محدود معلومات کی بُنیاد پر
یہ کہہ سکتا ہوں کہ مساجد کے متعلق اتنی جامعیت
کے ساتھ تمام پہلوؤں پر اتنی حاوی کتاب نہ صرف اُردو
بلکہ عربی اور فارسی میں بھی میری نظر سے نہیں گزری، وقت کی
ایک بڑی ضرورت کی تکمیل میں مولانا موصوف نے اپنا وقت صَرف فرمایا ہے۔"

★ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

"مولانا کا اُسلوب، معلومات کی فراہمی، بیان کی شُستگی، اور طریقۂ تعبیر
کی دُرستی ہر چیز پسند آئی۔"

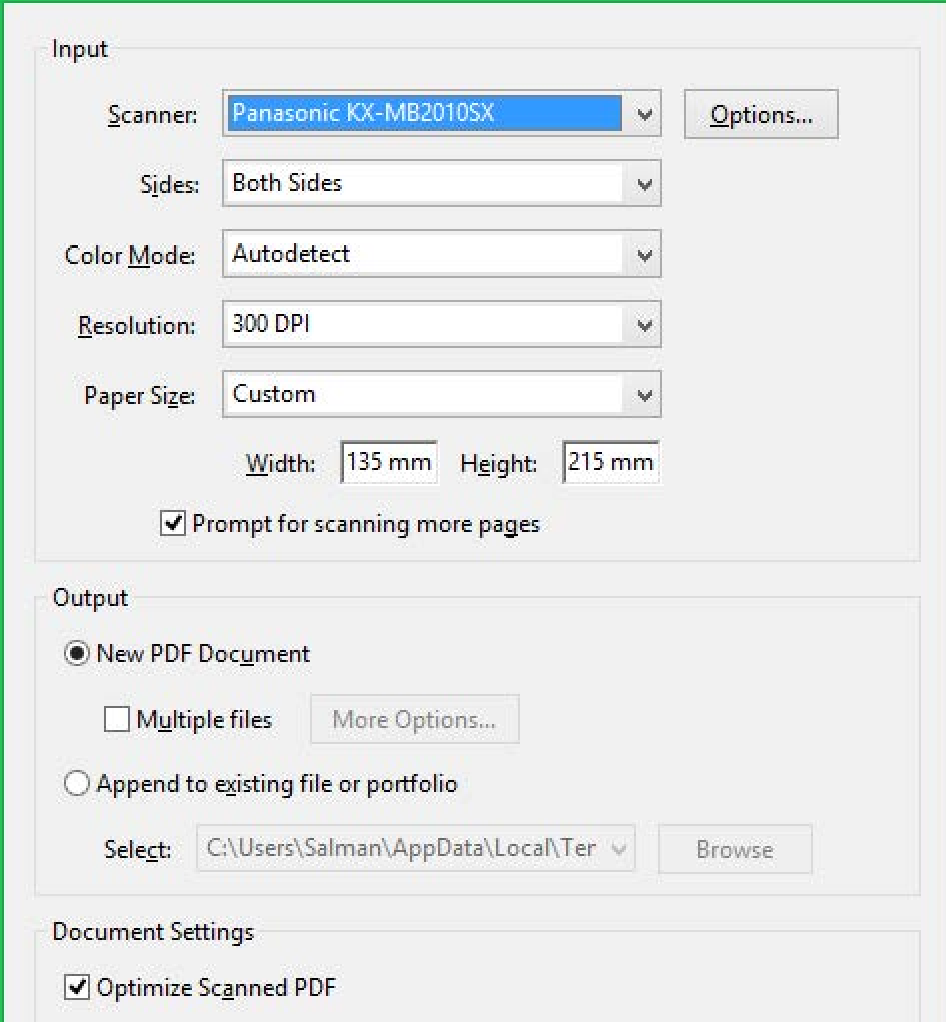
★ مولانا سید سُلیمان ندویؒ

"زبان صاف و سادہ ہے اور اندازِ بیان سلیس و شگفتہ، کتاب ٹھیٹھ مذہبی
رنگ کی ہونے کے باوجود مولویانہ خُشک نگاری سے پاک ہے۔ کتاب
بہ حیثیت مجموعی اُمّت کے مذہبی ذخیرہ میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔"

★ مولانا عبد الماجد دریابادیؒ

"اِس موضُوع کے سارے پہلوؤں کا اِس طرح اِحتواء اور احاطہ
کیا ہے کہ مسجد کا حقیقی مقام، اُس کے آداب و قواعد، اُس کی
سیاسی اور دینی حیثیت سے یہ سب مضامین بڑی تحقیق و
خوبصورتی سے سامنے آگئے ہیں۔"

★ مولانا سید انظر شاہ کشمیری مدظلہٗ


Input
Scanner:
Panasonic KX-MB2010SX
Options...
Sides:
Both Sides
Color Mode:
Autodetect
Resolution:
300 DPI
Paper Size:
Custom
Width:
135 mm
Height:
215 mm
Prompt for scanning more pages
Output
New PDF Document
Multiple files
More Options...
Append to existing file or portfolio
Select:
C:\Users\Salman\AppData\Local\Ter
Browse
Document Settings
Optimize Scanned PDF